فورٹ ولیم کالج کے ہندی ادیب

للّولال جی کوی

ایک ادبی سوانح

ابوسعادت جلیلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل
حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

فورٹ ولیم کالج کے ہندی ادیب

للّولال جی کوی

ایک ادبی سوانح

ابوسعادت جلیلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل
حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

Lallu Lal Ji Kavi Ek Adbi Sawaneh

By : Abu Saadat Jaleli

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت: اکتوبر، دسمبر 1998ء شک 1920ء

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : =/72

سلسلۂ مطبوعات : 831

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

طابع : جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی۔

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشو و نما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائریکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

للّولال جی کوی

ایک ادبی سوانح

شمار	عنوان	صفحات
	تشکرات وتکریمات :	7
	کتاب کہانی	11
	تعارف کتابیات	23
	حالاتِ زندگی	49
	معاصرین اور رفقا	80
	کارہائے نمایاں	92
	"لطائف ہندی" بہ یک نظر	112
	"لال چندریکا" مختصر تعارف	121
	"بیتال پچیسی" ہندی واردو	130
	"پریم ساگر" تعارفی جائزہ	144
	"سنگھاسن بتیسی" ایک مباحثہ	190
	"سنگھاسن بتیسی" جائزہ نگاری	209
	ادبی مرتبہ ومقام	241

تشکرات و تکریمات

"للولال جی کوی ایک ادبی سوانح" راقم کی پیش رو تصنیف "حشر کے ہندی ڈرامے کی طرح ایک وسیع تر منصوبے موسومہ "قدیم ہندی علم و دانش کا اردو منظر نامہ، تحقیقات سہیل بخاری کی روشنی میں" کے ذیل میں معرضِ تحریر میں آئی ہے اور "انوار سہیل بخاری" کا قلمی تسلسل ہے، اس لیے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ حضرت سہیل بخاری اعلی اللہ مقامہٗ کی ذاتِ محمود صفات کے فیوض و برکات کے تئیں احسان مندی کا عاجزانہ نذرانہ پیش ہے۔

للولال جی کوی کی دماغی فتوحات کے من جملہ فی الوقت صرف "پریم ساگر" زیرِ استفاضہ ہے اور بقیہ سب کے بارے میں معلومات غایبانہ اطلاع کی حیثیت رکھتی ہیں تاہم ان کے خلاقانہ عمل کی جو کچھ تفصیل حاصل ہو سکی ہے وہ بہت اثر آفریں اور ولولہ انگیز ہے، اس لیے للولال جی کوی کی اپنی شخصیت کے احساناتِ ادبی کا شکریہ واجب ہے اگرچہ یہ خواہش جاں ان کے خونِ جگر کے عشر عشیر کا بھی حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔

ایڈورڈ بی ایسٹ وک کے ترتیب دادہ "پریم ساگر" کے تاحال بہترین و عمدہ ترین ایڈیشن ہرٹفورڈ ۱۸۵۱ء کی راقم کے ہاں موجودگی للولال جی کوی کے اسی کارنامے کی بنیاد پر ان کی ثمر آور اور ثروت مند خلاقی کو متعارف کرانے کی اوّلین محرک رہی ہے، اس لیے ایسٹ وک کی اپنی فاضلانہ ریاضت کے تئیں اظہار تہنیت لازمی ہے۔

استاذ الاساتذہ پروفیسر سید محمد کی بیش بہا تحقیقات کو اس کاوش کی اصل و اساس کی سی حیثیت حاصل ہے اور یہ حقیر سطور ان ہی کی تصنیف گرامی کے صرف ایک باب کی طالب علمانہ توسیع کے مصداق ہیں، اس لیے صاحب "اربابِ نثر اردو" کی خدمت میں ہدیۂ تحسین و سپاس نذر ہے۔

برٹش لائبریری لندن کے شعبۂ اسلامی ذخائر جنوبی ایشیا کے فائق سربراہ گرامی قدر سلیم الدین قریشی صاحب نیز عالی جناب پروفیسر اے سی ٹیکیکر صاحب یونیورسٹی لائبریرین جامعہ بمبئی اور بزرگ معظم حضرت رام لعل نابھوی نے جس احقر نواز اور بندہ پرورانہ انداز میں اس منصوبے کی سرپرستی فرمائی ہے اس کے بغیر ان اوراقِ پریشاں کا کسی ایک اور بڑے اہم انکشافات سے مملو ہونا غیر ممکن ہوتا' اس لیے ممدوحین سے اظہار ممنونیت ناگزیر ہے۔

پروفیسر اتم سلما صاحبہ (ڈھاکا)' جناب عطا خورشید (کتب خانہ خدا بخش) آقائے سید سراج الدین موسوی (ڈائرکٹر خانہ فرہنگِ ایران کراچی) نے بھی چند نقول سے فیض رسانی کا اہتمام فرمایا' جب کہ حضرت یونس جاوید (مجلس ترقی ادب)' پروفیسر رفیع الدین ہاشمی صاحب قبلہ (جامعہ پنجاب) کرم فرما جناب شہزاد منظر (کراچی)' مشفقی ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی صاحب (حیدر آباد) محبی ڈاکٹر اعجاز حنیف (اسلام آباد) نے حوصلہ افزائی نیز "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" کی نہایت فاضل محقق جنابہ پروفیسر عبیدہ بیگم صاحبہ اور ڈاکٹر شہناز انجم صاحبہ (جامعہ ملیہ) نے رہ نمائی سے مستفید کرنے کی زحمات قبول فرمائیں جس کے لیے احقرانِ افاضل کا ممنون احسان ہے۔

جناب محمد ارشد خاں (اسلامیہ کالج لاہور) نے راقم کے تینوں تصنیفی منصوبوں کے لیے تنہا اتنی نادر کتابیں تلاش کر کے بہ صورتِ اصل و نقل مرحمت کرنے کی تکالیف گوارا فرمائیں کہ خود اس خاکسار نے زندگی بھر اپنے تمام بزرگوں کی کل ملا کر اتنی خدمت نہ کی ہوگی' چوں کہ ارشد خاں صاحب کی مستقل کرم گستری اور زحمت فرمائی کا سلسلہ جاری ہے اس لیے ان کا دلی شکریہ فرض ہوتے ہوئے بھی ملتوی رکھتا ہوں۔

راقم ترقی اردو بیورو دہلی کی ناظم اعلا ڈاکٹر فہمیدہ بیگم صاحبہ کا ممنون کرم ہے کہ ان کی نظرِ عنایت میں یہ حقیر کاوش اس قابل قرار پائی ہے کہ پردۂ گم نامی سے باہر آسکے' فاضل موصوفہ کے رفقائے ادارہ بھی شکر گزاری کے بجا طور پر حق دار ہیں جن کی تکلیف فرمائیوں سے ان معروضات کو ادبی منظر میں پیش ہونے کا موقع مل سکا ہے۔

کتاب کے ان تمام معزز قارئین اور واجب الاحترام ناقدینِ ادب کا ہمیشگی شکرانہ بھی اس خاکسار پر واجب ہے جو راقم کو تحقیقی فروگزاشتوں اور ادبی عیوب سے بے تکلفانہ و بلا تاخیر آگاہ بلکہ متنبہ فرمائیں تاکہ ان کی رہبری میں مسودۂ ہٰذا کو طبعِ دوم سے قبل اغلاط و اسقام سے اس حد تک پاک کیا جا سکے کہ کسی طور نقایص کا وجود باقی نہ رہے۔

جناب انیس احمد نعمانی سطور ہٰذا کے راقم کے برادر بزرگ ہیں اور ان کی بزرگی کا لحاظ کیے بغیر یہ احقر اپنے بدخط مسوّدات کی خوش خط نقول تیار کرنے کی انہیں مسلسل زحمت دیا کرتا ہے، یہ عمل ایک نہ دو پورے چالیس برس سے جاری ہے اور ان کی یہ دست گیری برادرانہ سرپرستی کے زمرے میں آتی ہے۔ بھائی جان صاحب موصوف کی جانبِ خاص سے اس درجہ تکلیف فرمائی رسمی اظہارِ تکریم و تعظیم سے یقیناً بالاتر ہے۔

ابوسعادت جلیلی

کتاب کہانی

اُستاذ الاساتذہ پروفیسر سیّد محمد صاحب جدید اُردو تحقیق کی وہ اوّلین شخصیت ہیں جنھوں نے گذشتہ صدی کے اُن برگزیدۂ "ارباب نثر اُردو" سے پہلی بار تفصیلی اور مجموعی طور پر روشناس کرایا جن کی قلمی خدمات اردو کی ادبی تواریخ میں فورٹ ولیم کالج کے حوالے سے ہمیشہ کے لیے اعزازات و امتیازات کی مالک تسلیم کرلی گئیں۔ بعد کے محققین نے کافی نئی قیمتی معلومات حاصل کیں اور ان مقتدر ارباب ادب کے مصنفہ و مترجمہ کارناموں پر مختلف جہات سے تنقیدی نظر ڈالی متعلقہ تحقیقی تصانیف اور مصحّحہ کتب میں وہ سب مطبوعات شامل ہیں جو باقاعدہ جامعاتی منصوبوں کے علاوہ تدقیق و دریافت سے بطور خاص دِل بستگی رکھنے والے علماء و افاضل کی محققانہ و نقادانہ ریاضتوں کا گراں مایہ و گراں قدر حاصل ہیں۔ اس کے باوجود فورٹ ولیم کالج کے سربرآوردہ مصنّفین میں کم از کم ایک شخصیت ضرور ایسی ہے جس کے غیر معمولی کارہائے نمایاں کا ابھی تک وہ احاطہ نہیں ہوسکا جس کی وہ بہمہ وجوہ اور بلا شک و شبہ مستحق ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ للّو لال جی کوی کا تعلق اردو دنیا سے محدود تر اور موجودہ ہندی زبان وادبیات کی ابتدائی مگر دُور رس مؤثرات کی حامل پیش قدمی سے بہت زیادہ اور بڑا گہرا رہا ہے۔ حُسنِ اتفاق کہ راقم سطور کے پاس جدید ہندی کے اس بڑے اور اوّلین محسنوں میں سے ایک کے کیے ہوتے بھگوت پران کے دسویں کھنڈ متعلقہ سوانح سری کرشن جی کے بالواسطہ ہندی ترجمے "پریم ساگر" کا ایک نادر و نایاب نسخہ مطبوعہ برطانیہ محفوظ ہے ــــ "پریم ساگر" اور اس کے فیضانِ وساطت

سے خود للّولال جی کوی کی شخصیت اور خدمات کو متعارف کرانے کا ابتدائی خیال اس کاوشِ ناکام و ناتمام کے بنیادی محرّک و عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اوّلین تصور کی اوراقِ ہٰذا میں قلمی صورت گری کو کسی طرح بھی للّولال جی کوی کی بھاری بھرکم اور ثقہ و موقّر شخصیت نیز ان کے وقیع و مؤثر تصنیف کے مقابلہ میں مہتم بالشان نہیں کہا جا سکتا ہے۔ "للّولال جی کوی: ایک ادبی سوانح"، کو بہرحال اور بہ ہر نوع ایک بنیادی خیال کے طور پر ہی پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔ یہ کاوش حرفِ اوّل بے شک ہے لیکن نفیس موضوع شخصیت اور اس کے قلمی آثار پر حرفِ آخر یقیناً نہیں ہے، اور خدا کرے کہ حرفِ آیندہ کے لیے زمانے کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔

یادش بخیر! وہ بھی کیا دن تھے کہ ہفتوں بلکہ مہینوں للّولال جی کوی کے "پریم ساگر" سے چند عکس میز پر سامنے ہی دھرے رہے اور میں اس سارے عرصے میں یہ سوچ سوچ کر رہ جاتا تھا کہ للّولال جی کوی کی زندگی اور خدمات سے دلچسپی کجا واقفیت ہی یہاں کسے ہوگی جو انہیں روشنی میں لانے کی سعی کی جاتی۔ ایک دن یہی سوجھی کہ اپنے یہاں موجود "پریم ساگر" کے بے حد کمیاب برطانوی ایڈیشن کے حوالے سے للّولال جی کوی پر چند جامع تعارفی سطور ہندوستان ہی ارسال کر دی جائیں۔ اسی اثنا میں "قدیم ہندی علوم و ادب کا اردو منظر نامہ" کے منصوبے کا کام آگے بڑھنے پر وقتاً فوقتاً یہ خوش آیند سا اندازہ ہوا کہ ہمارے یہاں للّولال جی کوی سے بالکل ہی لاعلمی کا معاملہ تو نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ ان کے اپنے ہم عصروں کو ہندی یا برج متون پر مبنی للّولال جی کوی کی ادبی استمداد کے مذکور کے طور پر ان کا جہاں تہاں کچھ نہ کچھ حوالہ مل جاتا ہے، خاص کر حضرت گوہر نوشاہی نے "بیتال پچیسی" کے ہندی متن کو وِلا سے منسوب کر کے اردو میں شائع کرتے ہوئے للّولال جی کوی کی معاونت کی بنیاد پر ان کے بھی مختصر کوائف تحریر کر کے ان سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔

راقم نے جب ۱۹۸۹ء کی آخری سہ ماہی میں "پریم ساگر" کے ایسٹ وِک ایڈیشن پر نمونتاً چند سطریں قدیم ہندی علم و دانش پر اصل منصوبے میں شامل

کرنے کا ارادہ کیا تو اسی موقع پر خیال آیا کہ للّولال جی کوی کو کسی قدر تفصیل سے متعارف کرانا چاہیے وگرنہ مختصرات سے ان کا حق شاید ہی ادا ہو۔ اس کے بعد سے مسلسل ایک ذہنی تقاضا سا رہا کہ للّولال جی کوی کی مجموعی خدمات دراصل ایک مکمل کتاب کا استحقاق رکھتی ہیں خواہ اس کی نوعیت اور حیثیت بھی محض تعارفی ہی کیوں نہ ہو۔ بعدازاں اہم ہندوستانی تحقیقات سے استفاضہ ممکن ہو گیا جن سے اس خیال کو اس حد تک تقویت حاصل ہو گئی کہ یہ ارادہ عملی شکل اختیار کر سکا ہے۔ یہ ہے اس کاوش کی اپنی غریب و سادہ و رنگین سی داستانِ ادب۔

۲

"اربابِ نثرِ اردو" مطبوعہ ۱۹۲۷ء سے قبل للّولال جی کوی کا شخصی و ادبی احوال بہت ہی مختصر بلکہ محض اشارتی سے انداز میں ان کے اپنے رفقائے کالج کے ہاں مذکور ہوا ہے' جنھوں نے بربنائے احکامات ان کی مدد سے فائدہ اٹھایا۔ یہ بیانات جو مختلف وسیلوں سے منقول ہیں صرف اسی ادبی اعانت سے متعلق ہیں اور للّولال جی کوی کا سرے سے کوئی حال نہیں بتاتے ہیں۔ مولوی سید محمد نے فورٹ ولیم کالج کے اردو مصنفین و مترجمین کے بالتفصیل کوائف کے ذیل میں "للّولال جی کوی" کے ہندی کارناموں اور اردو ادب پاروں کا تعارف بہ صفحات ۴۶ ۲ تا ۲۷۵ "سنگھاسن بتیسی" اور "لطایف ہندی" کی رعایت سے کرایا ہے اور کل چھ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس شبہ کی بہ مشکل ہی گنجائش ہے۔ پروفیسر سید محمد نے کالج کی تمام تر مطبوعات اور للّولال جی کوی کی زیرِ حوالہ کتب میں سے بیشتر خود ملاحظہ کی ہوں گی یا نہیں۔ غیر مطبوعہ کتابوں کے حوالے سے انہوں نے ان منابع کا نام لیا ہے جن سے متعلقہ نسخوں کی چند سطور حسب ضرورت "اربابِ نثرِ اردو" میں اقتباس کی ہیں جب کہ شایع شدہ تصانیف و تالیفات اور تراجم کی نشان دہی انہوں نے ان کے مختلف و متعدد ایڈیشنوں کے سالہائے طباعت کے ساتھ کی ہے۔ بعد کے کئی اہم ادبی مؤرخین مولانا حامد حسن قادری سے لے کر پروفیسر وقار عظیم تک نے پروفیسر سید محمد کے اسی افتتاحی تذکرہ فورٹ ولیم کالج کو اپنے مصادر میں شریک کر کے ضروری تفصیلات اخذ کی ہیں۔

عجیب سی بات ہے کہ بعض معاصر فضلاء کے انداز تحریر سے جن میں "ارباب نثر اردو" کے سوانحی و ادبی کوائف سے ضرورتاً خوشہ چینی کرنے والے ناقلین شامل ہیں۔ نہ صرف پروفیسر سید محمد کے پیش کردہ نتایج بلکہ ان کے اقتباس کیے ہوتے حوالوں اور بیانات کے تئیں بھی شکوک کا اظہار ملتا ہے۔ نتایج و آراء سے اختلاف تو خیر ایک قدرتی امر ہے اور تنقیدی عمل کے صحت مند ارتقاء کا ضامن، لیکن اس باب میں کسی اشتباہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ "ارباب نثر اردو" میں محولہ کتب یا متعلقہ ایڈیشنوں میں سے اکثر مولوی سید محمد کے ملاحظہ میں نہ آتے ہوں۔ خواہ پروفیسر سید محمد کی ذاتی تحویل میں فورٹ ولیم کالج وغیرہ کی ساری زیر تذکرہ کتابیں رہی ہوں یا نہیں، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور کتب خانہ آصفیہ (اب اسٹیٹ لائبریری) کے عظیم اور کثیر ذخائر میں ان ساری مطبوعات کے ہر ایڈیشن کی ایک سے زائد جلدیں موجود رہی ہوں۔ دونوں مراکز میں مخزونہ ان سبھی قیمتی کتابوں تک صبح سے رات تک بارہ گھنٹے اور کھلے عام رسائی مولوی سید محمد ایسے بزرگ اساتذہ ہی نہیں، اس حقیر جیسے لاتعداد عام طلبائے ادب کے لیے تک کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہی۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ممدوح نے ایک سے زائد مقامات پر اشارہ فرمایا حیدرآباد کے مقامی اکابر کے ذاتی ذخیروں سے بھی بربنائے تعلقات مطالعہ و استفادہ جاری رہتا تھا۔

چند مصنفین کے فرمودات سے اندازہ ہوتا ہے اور یہ ضرور ممکن ہے کہ کسی کسی جگہ معلومات کی ترتیب یا تحریر میں کوئی اتفاقیہ غلطی راہ پا گئی ہو جب کہ "ارباب نثر اردو" کے متعاقب ایڈیشنوں میں چھاپے کی غلطیاں زیادہ در آئی ہیں۔ ہندوستان و پاکستان میں ایسے زیادہ تر ایڈیشنوں کی اشاعت ہمیشہ ہی محض غیر مجاز ہی نہیں بڑی غیر ذمہ دارانہ طرز کی بھی ہوتی رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں اچھی اچھی کتابوں کی طباعت اغلاط و نقایص سے پُر رہتی ہے۔ ان اسقام اور غلطیوں کا بعد کے سارے ایسے ہی غیر مستند ایڈیشنوں میں متواتر اعادہ ہوتا چلا آتا ہے۔ اس عامۃ الورود اور تلخ حقیقت سے "ارباب نثر اردو" کے طبع اوّل کے سوا دوسرے سبھی ہندوستانی پاکستانی ایڈیشنوں کو استثنا حاصل نہ ہو سکا، لیکن اس کے باعث اصل کتاب کے

متذکرہ سنین یا ناموں میں شبہات کا اظہار بہرطور غیر مناسب ہی ہوگا۔

اس احقر کو مادرِ جامعہ میں ایک مضمون کے بطور اردو پڑھنے کا شرف وافتخار تو حاصل نہ ہو سکا تھا البتہ کسی نہ کسی ہم جماعت کی خیر خواہی میں یا ہمراہی میں اور کبھی کبھار ازراہ فسادفی الجماعت پچھلی نشستوں میں جا بیٹھنے کی عزت ضرور نصیب ہوتی۔ اب یہ باقاعدہ مستحضر نہیں کہ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۲ء شعبۂ فارسی سے بی۔اے کے دوران اُس عرصے میں کون کون سے افاضل شعبۂ اردو سے منسلک تھے، البتہ پروفیسر حمیدالدین شطاری اور پروفیسر حفیظ قتیل کی موجودگی یاد ہے۔ "کلیۂ اناث" سے ہفتے دو ہفتے میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی آمد بھی رہتی تھی۔ جہاں تک یادداشت کام کرتی ہے صدر نشینِ شعبہ پروفیسر عبدالقادر سروری ہی تھے جنہیں پروفیسر آل احمد سرور کے تئیں ان کی عقیدت اور سرور صاحب کی حیدرآباد تشریف آوری کے مواقع پر سروری صاحب کی ان کے ہم راہ مستقل وابستگی کی بنا پر سروری کی بجائے سُروری کہنا فی الجملہ طالب علمانہ نالائقیوں کا لازمی جُز تھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کی وظیفہ حُسنِ خدمت پر سبک دوشی کے بعد جامعہ عثمانیہ میں بطور صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا انتخاب ہوا تھا۔ غرضیکہ یہ بالکل یاد نہیں ہے کہ پروفیسر سید محمد اس زمانہ میں شعبۂ اردو سے منسلک تھے یا نہیں، تاہم نظام آباد سے سائلانہ مراسلت کے علاوہ پرانی حویلی کے قریب چھتہ بازار میں واقع ان کے "اعجاز پریس" میں کسی نہ کسی طالب علمانہ سوال کے ساتھ چند مرتبہ حضوری کا عزّو شرف نصیب ہوا تھا۔ پروفیسر سید محمد اس بڑی عمر میں بھی نوجوانوں سے زیادہ مستعد و چست اور فعال رہا کرتے تھے۔ "اربابِ نثر اردو" میں بھی ان کا قلمی پیکر ان کے فضائل علمی اور ادبی کمالات سمیت انھیں کا نقوش مرتسم دکھائی دیتا ہے۔ عرض کرنے کا منشا یہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پروفیسر سید محمد کی تحریر فرمائی ہوئی، للو لال جی کوی کی ادبی سوانح کی یہ حقیر سی توسیع ان کے معتبر وموقر الفاظ کے شایان نہیں ہے، اور اگر واقعی یہ ایک سعادت ہے تو پھر اس کا زور بازو یعنی اصل قوت اور بنیادی جوہر بھی وہی ہے جو خدائے بخشندہ نے "اربابِ نثر اردو" کی صورت بخش دیا ہے!

راقم کی یہ سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے کہ پروفیسر سید محمد اور ان کے اس رفیع الشان سے تاسیسی کارنامے Pioneering work کو تحسین و عقیدت کا خراج اور نذرانہ پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مختلف اصحاب علم و قلم "ارباب نثر اردو" کی ایک ایک موضوعِ تحقیق شخصیت پر مستقل تصانیف تحریر کریں تاکہ اس بہترین و عمدہ ترین ادبی تصنیف کی توسیع ممکن ہو۔ علماء و اساتذہ ادب کے اعزاز میں یا ان کے فضل و کمال اور احسانات کی یاد میں مجلات کی روایت خاصی مستحکم ہو چکی ہے۔ اعترافِ خدمات کی اس نئی تجویز کا معمولی سا نمونہ پیش کرنے کی سعادت یہ خاکسار حاصل کر رہا ہے۔

۳

افسوس یہ ہے کہ تمام تر کوشش کے باوجود تاریخی اور تحقیقی و تنقیدی اعتبارات سے اہمیت کے مالک چند قدیم و جدید ذرائع سے فیض یابی کا اہتمام بوجوہ ممکن نہ ہو سکا جو حسب تفصیل ذیل ہیں (بلحاظ تاریخی ترتیب)

۱۔ کلاڈیس بچانن: "کالج آف فورٹ ولیم اِن بنگال" ۱۸۰۵ء

۲۔ تھامس روبک: "انلس آف دی کالج آف فورٹ ولیم" کلکتہ ۱۸۱۹ء (یہ ۱۸۱۶ء تک کی تاریخ ہے)

۳۔ ایڈورڈ ایسٹ وِک: "پریم ساگر" انگریزی ترجمہ ہرٹفورڈ ۱۸۵۱ء

۴۔ جارج گریرسن: "ماڈرن ورنیکلر لٹریچر آف ہندوستان" کلکتہ ۱۸۸۹ء

۵۔ فریڈرک چارلس ڈینورس: "میموریلز آف اولڈ ہیلی بری کالج" لندن ۱۸۹۳ء

۶۔ شیام سندر داس: "چھتر پرکاش للو لال جی کوی" بنارس ۱۹۰۳ء

۷۔ جی ایس اے رینکنگ: "بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ" مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۱ء وبعد جلد ۲۱ تا ۲۴ کلکتہ ۱۹۲۰ء/۱۹۲۲ء ابواب "تاریخ فورٹ ولیم کالج"

۸۔ لکشمی ساگر وارشنے: ا۔ (ہندی) "فورٹ ولیم کالج" الہ آباد بکرمی ۲۰۰۴ (نیز ۱۹۴۷ء)

ب: "آدھونک ہندی ساہتیہ کی بھومکا: ۱۷۵۷ تا ۱۸۵۷ء" الہ آباد ۱۹۵۳ء

۹۔ رام چندر شکل: "ہندی ساہتیہ کا اتہاس" کاشی بکرمی ۲۰۲۹ (۱۹۷۲ء)

۱۰۔ محمد عتیق صدیقی: ا۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" دہلی ۱۹۶۰ و ۱۹۷۹ء
نیز: ب: "اوریجن آف ماڈرن ہندوستانی لٹریچر: سورس میٹیریل
گل کرائسٹس لٹر" علی گڑھ ۱۹۶۳ء

۱۱۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ: ا۔ "بنگال میں اردو زبان وادب"
کلکتہ ۱۹۶۳ و ۱۹۷۶ء نیز۔ ب: "تذکرۂ تصانیف بنگال" (طباعت نامعلوم)

۱۲۔ رام چندر تیواڑی: "ہندی کا گدیہ ساہتیہ" ۱۹۶۸ء

۱۳۔ پرتاپ نراین ٹنڈن: "ہندی ساہتیہ کا پروری گت اتہاس" لکھنؤ ۱۹۶۸ء

۱۴۔ شاردا دیوی ودیالنکار: "ڈیولپمنٹ آف ہندی پروز لٹریچر ان ارلی
نائینٹینتھ سنچری: ۱۸۰۰/۱۸۵۶ء" الہ آباد ۱۹۶۹ء

۱۵۔ ایس پی سین: "ڈکشنری آف نیشنل بلیوگرافی" کلکتہ ۱۹۷۴ء

۱۶۔ چندر دیو کوڈے: "بھارتیندو پورو ہندی گدیہ" کانپور ۱۹۷۵ء

۱۷۔ سسر کمار داس: "صاحبس اینڈ منشیز: این اکاونٹ آف کالج
آف فورٹ ولیم" دہلی ۱۹۷۸ء

۱۸۔ نیرج گوئل: "فورٹ ولیم کالج ایک اتہاس: ۱۸۰۰ تا ۱۸۵۴" دہلی ۱۹۸۶ء

۱۹۔ ہرمیندر سنگھ: (ڈاکٹر صاحب موصوف کی تحقیق کا علم ڈاکٹر نیرج گوئل
کی محولہ بالا تصنیف کی کتابیات سے ہوتا ہے)
"ہندی ساہتیہ اتہاس: پاشچاتیہ استروتوں کا ادھیین" ہوشیارپور ۱۹۸۵ء

۲۰۔ عبدالحفیظ: "فورٹ ولیم کالج" (ڈاکٹرل تھیسس
شعبۂ اردو جامعہ پنجاب لاہور' غیر مطبوعہ)

۲۱۔ عبدالخالق بلوچ: "فورٹ ولیم کالج" (مقالہ ایم اے اردو
جامعہ بلوچستان کوئٹہ' غیر مطبوعہ)

حضرت رام لعل نابھوی نے اوایل ۱۹۹۱ء کے نامہ ہائے لطف و کرم میں نادم سیتاپوری کے مولفہ کتابچہ "للولال کوی" مطبوعہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۹ء کی دریافت اور موجودگی کا بھی انکشاف فرمایا ہے جو ایک بڑی اہم اطلاع ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم صاحبہ نے بنارس کے ادارے چوکھمبا وشوابھارتی

کے "پریم ساگر" کے ایک جدید اور پروفیسر اے سی چٹکیر صاحب نے بنارس کی ہی ناگری پرچارنی سبھا کے ایک گذشتہ ایڈیشن سے مطلع فرمایا ہے۔ للولال جی کوی کی اور کتب کے قدیم یعنی ان کے معاصر اور معاً بعد کے ایڈیشنوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ خاکسار خواہاں و کوشاں ہے کہ للولال جی کوی کی مطبوعات کے ہر نودریافت ایڈیشن سے کم از کم متعلقہ لایق مرتبین کے مقدمات سے اکتساب کا موقع مل سکے۔ ان کے حصول میں تاخیر کی بنا، پر اندازہ یہی ہے کہ گردآوری کی کوشش مسودہ ہذا کی اشاعت کے بعد ہی بار آور ہوسکیں گی!

اتفاقاً عدم دستیاب مصادر کی یہ فہرست خود مختلف ماخذ سے منقول ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ کتابیں ہم دست ہوتیں تو فورٹ ولیم کالج اور ہندی ادب پر معلومات کا سمندر اور وسیع ہوجاتا اور خود زیرِ مطالعہ شخصیت اور ان کی قلمی کاوشوں پر خاصی اطلاعات کے علاوہ مفید آرا کا اضافہ بھی ممکن ہوتا۔ بحالات موجودہ ان سب کتب کا حصول بالکل ناممکنات میں سے ہے بلکہ جاریہ فضا سے قبل کسی نہ کسی کتاب سے عکسی اوراق کی جو امید ذرا پہلے تک بندھی ہوئی تھی اس تک کے برآنے کا فی الوقت محدود سا امکان ہی باقی رہ گیا ہے۔ الغرض فورٹ ولیم کالج پر اتنا بہت سا کام سامنے آچکا ہے کہ اس ادارے پر یہاں کچھ عرض کرنا محض اور بالکلیہ مبتدیانہ سا ہوگا۔ اس لیے براہ راست موضوع جائزہ شخصیت کی ادبی زندگی کی بیش از بیش تفصیلات اپنی بساطِ فکر و قلم کے مطابق مرتب انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

"للولال جی کوی: ایک ادبی سوانح" کی اپنی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ عرض کردہ اصل اور وسیع الذیل منصوبے موسومہ "قدیم ہندی علم و دانش کا اردو منظر نامہ" پر کام کے دوران اور اسی ضمن میں للولال جی کوی کے احوال و آثار پر یہ خواہش معرضِ تحریر میں آگئی ہے۔ اس سقیم و ناقص اور ابتدائی بلکہ مبتدیانہ مساعی سے خواہ ترغیب پاکر خواہ مشتعل ہوکر کوئی واقعی اہل فرد آگے بڑھے اور للولال جی کوی کے مجموعی ادیبانہ عمل کو ایک بھرپور تحقیق و انتقاد کا عنوان بنالے تو محض اچھا ہی نہیں بلکہ بلاشبہ مستحسن ہوگا۔ اب تک جو کچھ علم ہوسکا ہے اس کی رو سے

جدید ہندی ادبیات کے اس پیش رو ہی نہیں بلکہ بانی مبانی پر خود ہندی کے نئے ریسرچ اسکالروں نے کوئی باضابطہ اور خصوصی کام نہیں کیا ہے۔ یہ صورت حال تمام تر توقعات کے برخلاف ہی نہیں بلکہ سخت حیران کن بھی ہے اور شدید افسوسناک بھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان میں بطور قومی زبان ہندی کے سرکاری طور پر نفاذ و رواج اور عوامی سطح پر قبولِ عام کے باوجود ادب کے اکابر کو نظر انداز کرنے کا رویہ جاری ہے جو یقیناً بڑی عجیب سی بات ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندی کے جدید محققانہ اور مورخانہ منصوبوں میں للولال جی کوی کے بنیادی کارناموں پر بیش از بیش نئی روشنی فراہم کر کے ان کی خدمات کا مقام و مرتبہ متعین کیا جائے۔ نیز للولال جی کوی کی کتب کے نئے ایڈیشن ضروری تصیح و تحشیہ کے ساتھ سامنے لائے جائیں۔ یہ بالکل بجا طور پر للولال جی کوی کا تاریخی استحقاق ہے اور ہندی نہ سہی اردو سہی، خدا کرے کوئی پختہ کار اور اہل نظر ہستی میدان عمل میں وارد ہو اور للو لال جی کوی کی تمام ہندی اور اردو مطبوعات کے سبھی یا زیادہ سے زیادہ ایڈیشن کھوج نکالے تاکہ ان کی صحیح معنوں میں ایک مستند اور معیاری سوانح تیار ہو سکے۔

غرض ہندی کا موضوع ہونے کے باعث للولال جی کوی پر ہندوستان میں بڑے عمدہ طریقے سے ریسرچ ممکن ہے لیکن شرط اوّل یہی ہے کہ اس کام کا بیڑا اٹھانے والے اہل قلم کو ایک خاص استعداد کا مالک اور کام کا دھنی ہونا چاہیے۔ حشر کے تازہ وارد ہندوستانی محقق و نقاد ڈاکٹر محمد شفیع نیز فورٹ ولیم کالج کے بحث کی جدید ہندوستانی فاضل ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے تاریخی نوعیت کے متعلقہ علمی ادبی نوادر کی کھوج اور بازیافت نیز حقایق کی محض جستجو ہی نہیں بلکہ تفتیش و تصدیق کے لیے جاں فشانی اور ریاضت کے جو معیارات قایم کر دیے ہیں انہیں رہ نما بنانا ہوگا۔ اس قدر جاں کاہ اور اس درجہ سنجیدہ انداز میں کام کر کے ہی للولال جی کوی کے گم گشتہ کارناموں کو بازیاب بھی کیا جا سکے گا اور ان کی تخلیقی ریاضت کا حق بھی ادا کیا جا سکے گا۔

میدان عمل میں اترتے وقت اور اس پورے سلسلہ جہد کے دوران تصور بھی رہنا چاہیے کہ کیا للولال جی کوی کی اتنی بڑی دماغی فتوحات کا اتنا بھی استحقاق نہیں ہے کہ ان کی خلاقی کے مظاہر جمع اور پیش کیے جائیں۔ اگر خدا نخواستہ اس سوال کا (اور یہ کوئی کانٹے کا سوال بھی نہیں ہے بلکہ سیدھی سی بات ہے) جواب اثبات میں نہ ہو تو پھر اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ بقائے دوام کے دربار کے اتنے بڑے منصب داروں کے محض کفش بردار انبوہ کثیر میں شمول کی حسرت بھی ترک کرنی پڑ جائے گی!

مختصر ترین الفاظ میں ان معروضات اور راقم کے منشاو مقصود کا خلاصہ یہ ہے کہ:

فورٹ ولیم کالج کے اپنے موضوعات پر کام کا سلسلہ اس کے قیام سے ہی شروع ہوا اور جاری بھی ہے؛

اردو میں کالج کے ثمرات اور اثرات کا محققانہ تعارف اولاً پروفیسر سید محمد نے "ارباب نثر اردو" تصنیف کر کے کرایا جس کے بعد ہی کالج کے ادبا کے مجموعی سرمائے کو ادبی تواریخ میں اہمیت ملی؛

اب تک کالج اور اس کی اہم ترین شخصیت گل کرسٹ پر علمی ادبی ریسرچ کے وسیلے سے بہت کچھ انکشافات اور معلومات کی اشاعت ہو چکی ہے حتیٰ کہ فورٹ ولیم کالج کا مبحث ایک سمندر بن چکا ہے۔

کالج کی شخصیات میں سے کسی ایک کے تخلیقی آثار کو دریافت اور ایڈٹ کر کے سامنے لایا جا چکا ہے جن میں سے میر امن ممتاز ترین ہیں اور ان ہی پر سب سے زیادہ سوانحی و تالیفی کام ہوا ہے۔

ادارے کے وابستگان اور ان کی تصنیفات و مترجمات پر تحقیق و تنقید ایک مسلسل ادبی عمل کا نام ہے جس میں جامعاتی اور غیر جامعاتی دونوں سطحوں پر بہت خاصا کام ہوا ہے۔

اردو ادب میں سے بہت سوں پر ابھی کام کرنے کی خاصی گنجائش باقی ہے اور ضرورت ہے کہ انہیں فرداً فرداً عنوان بنا کر ان کی خدمات کو مفصل طور پر پیش کیا جائے۔

غیر اردو شعبوں میں سے ہندی اور برج در کنار عربی اور فارسی زبان و ادبیات کے افراد اور کارناموں پر اردو میں کوئی تخلیق نہیں ہوئی ہے اور یہ اہم گوشہ ابھی تک "گوشے" میں ہے۔

للو لال جی کوی کو ابھی تک غیر اردو شخصیت سمجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے۔ حالانکہ ان کی تین کتابیں اردو میں ہیں نیز ولا اور جوان سے منسوب چاروں تراجم ان کے بغیر اردو میں ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

اردو ہندی تنازعے کے آغاز سے متعلقہ مفروضات اور غلط فہمیوں کی بنا پر بھی وہ بطور اردو ادیب نمایاں نہیں ہو سکے ہیں جب کہ نزاعی سلسلۂ بحث و عمل میں انگریز محرک تھے۔

تشکیک اور دھندلاہٹ کی فضا سے للو لال جی کوی کو باہر نکالنا اور ان کے علمی ادبی خد و خال واضح کرنا بڑا ہی ضروری ہے کیوں کہ خود اردو دنیا کے لیے ان کا وجود مسعود ناگزیر رہا ہے۔

اس سمت میں پہلی بار یہ مختصر و مجمل اور نامکمل و ناتمام سی کاوش کی جا رہی ہے کیوں کہ اس خاص عنوان کے اپنے مرکز تحقیق سے دور افتادہ ایک طالب علم و ادب کے لیے اس سے زیادہ خدمت عملاً ممکن نہیں ہو سکی ہے، چنانچہ اور راقم لہٰذا کو للو لال جی کوی کا ایک ادبی خاکہ یا تعارف ہی خیال کیا جائے تو بسا غنیمت ہوگا۔

راقم الحروف ان سطور کو اپنی خواہر زادی نور النساء نہالہ کے نام معنون اور ہندوستانی ایڈیشن کے جملہ حقوق بھی اسی کے لیے محفوظ کر رہا ہے۔ یہ بچی اس وقت انٹرمیڈیٹ کی طالبہ ہے اور خلاف توقع طور پر اردو داں بھی ہے۔ اس میں شاید کوئی خاص بات نہ ہو، خاص بات یہ ہے کہ یہ پیدائشی طور پر دونوں ہاتھوں سے معذور ہے۔ قدرت کی اس ستم ظریفی کے

باوجود یہ بچی نہ صرف اچھی طرح پڑھ لکھ رہی ہے بلکہ دونوں ہی ہاتھوں سے سارے کام انجام بھی دیتی ہے۔ ناظرین کرام دعا کریں کہ خدا اس بچی کی زندگی کو خوشیوں کا باغ بنا دے اور دونوں جہاں میں اس کو اپنے خزانۂ غیب سے خرّمی و شادمانی عطا کرے آمین یارب العالمین!

ابوسعادت جلیلی

تعارف کتابیات

تحقیقی تصانیف میں مصادر کے حوالے کا عام رواج یہی ہے کہ متعلقہ ماخذ کا اوّلین اندراج تفصیلی کرکے آیندہ حواشی میں اختصار سے حوالہ دیا جاتا ہے اور آخر میں اپنے منابع کی فہرست سازی کی جاتی ہے۔ کچھ عرصے سے غالباً جامعاتی ضوابط کے زیرِاثر یہ تبدیلی آئی ہے کہ صفحہ بہ صفحہ تحشیہ نویسی کے بجائے ہر باب کے اخیر میں تمام حوالوں کو جمع کر دیا جاتا ہے اور اس طرح حواشی کے یک جا ہونے سے ہر صفحہ پر حاشیوں کی جگہ بچ جاتی ہے۔ یہ انداز بھی کافی زمانے سے رائج ہے کہ اقتباسات کو خواہ طویل ہوں یا بالکل مختصر متن سے علیحدہ تحریر کرکے ان کے ماخذ کو عین اسی مقام پر درج کر دیا جاتا ہے۔ ان سبھی طریقوں کے اچھے اپنے فواید بھی ہیں اور نقصانات بھی، جن سے سرِدست کوئی بحث مقصود نہیں ہے تاہم ان میں تبدیلی ممکن ہے۔

راقم نے اپنی حد تک یہ ضرور خیال کیا ہے کہ آغاز میں ہی زیرِ کتاب ماخذات کی نشان دہی بمع ممکنہ تصریحات کر دی جائے، چنانچہ اوّلاً سارے ہم دست وسایل کی فہرست سازی کر رہا ہے۔ یہ تعارفی فہرست الفبائی طرز کے بجائے تاریخی ترتیب سے تیار کی گئی ہے اور چار اقسام پر مشتمل ہے۔ (ا) مطبوعات (کتب و رسایل)؛ (ب) نگارشات (مقالات و مقدمات)؛ (ج) مکتوبات، (د) عکسیات۔ اس ادبی سوانح میں ماخذ کی توضیحی فہرست کو اوّلیت دینے کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ آیندہ اوراق کو حواشی کے متعدد و بکثرت اندراجات سے محفوظ رکھا جا سکے۔ چنانچہ دورانِ متن آنے والے ہر اقتباس یا حوالے کے ماخذ کو تمام مواقع پر بہر ذریعے کے ذکر کے ہم راہ قوسین میں

نشان زد کر دیا گیا ہے۔ اس طرح حاشیے میں بامر مجبوری آنے والے حوالے معدودے چند سے زیادہ نہیں ہیں۔

عدم دستیاب ذرائع میں سے کئی کتابوں کے متعدد عکسی صفحے چند کرم گستر معاصرین کی خصوصی توجہات کے فیضان جاریہ کے طور پر اس خاکسار کو حاصل ہو گئے ہیں۔ ایسے سب عکسی اوراق چوں کہ فرداً فرداً بڑے اہم وسیلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں علیحدہ سے درج فہرست کرنا بھی راقم نے ضروری خیال کیا ہے تاکہ ان سے ماخوذ و مقتبس اطلاعات و بیانات کی سند میں کسی اشتباہ کی گنجایش نہ ہو۔ محصلہ عکسی عطیات بلحاظ تعداد خواہ کتنے ہی قلیل ہوں لیکن کم مقدار ہونے کے باوجود ان عکسیات کا رتبہ ان سے اخذ و استفاضہ کے اعتبار سے کم سے کم الفاظ میں رفیع مقدار ہے۔

ایک تصور یہ بھی ہے کہ جو اہم مطبوعات سرے سے حاصل نہیں ہو سکی ہیں ان کی وضاحت کرنے میں کسی قسم کے تکلف و تامل سے کام نہ لیا جاتے کیوں کہ اپنی کم علمی کو چھپانا زیادہ نقصان کا باعث ہو سکتا ہے، خاص کر ایسی صورت میں کہ غیر موجود کتب متعدد بھی ہیں اور کئی حوالوں سے اہمیت کی مالک بھی۔ چناں چہ زیر جائزہ موضوع کی حد تک ایسی کتابوں کی تعداد (۲۰) ہے جن سے استفادہ محض ضروری ہی نہیں ناگزیر ہے، مگر ان کا مکمل در کنار جزوی حصول بھی تاحیات ناممکنات میں سے ہے۔ مسودہ ہٰذا کے افتتاحیہ "کتاب کہانی" میں ایسے سارے نایاب ذرائع کو بھی بالتفصیل نشاں زد کر دیا گیا ہے تاکہ راقم الحروف کی حدود و قیود کا اندازہ کرنے میں فاضل قارئین کو کسی طور دشواری پیش نہ آتے۔

دراصل ایک ایسے طالب علم و ادب کو جس کا سراسر انحصار اپنی صلائے فقیرانہ کے انتہائی مفید و مثبت جواب کے طور پر حاصل ہونے والی اہل کرم کی مسلسل جود و سخا پر رہا ہے اپنی بے مائگی و بے بضاعتی اور احتیاجات کے اظہار میں کیا عار ہو سکتا ہے ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

تعارف کتابیات

(باعتبار سن وار ترتیب)

(ا) مطبوعات (ب) نگارشات
(ج) مکتوبات (د) عکسیات

ا۔ مطبوعات
(کتب و رسایل)

ا۔ فقیر دکنی: "سنگھاسن بتیسی" مصنفہ (عہد شاہ عالم) قبل ۱۸۰۰ء کراچی ۱۹۸۴ء

نامعلوم نظم نگار نے بقول خود "جواب شاہ عالم کے اس دور میں" یہ مثنوی تخلیق کی۔ از راہ انکسار آخر میں خود کو "کم تر فقیر" لکھ کر شاعر نے دکنی زبان میں "سنگھاسن بتیسی" کو قصۂ بیر بکرم" کے نام سے موسوم کیا:

اول دور میں جو ہوتے راویاں — قصہ ہندوی میں کیے ہیں بیاں
بیاں بیر بکرم کا کہہ کر تمام — "سنگھاسن بتیسی" رکھے اس کا نام
جہانگیر کے وقت میں یہ کتاب — کیے ترجمہ فارسی میں صواب
یہ تصنیف در وقت اورنگ زیب — قدیمی زباں پر کیا ہے فریب
جو اس شاہ عالم کے اب دور میں — یہ دکھنی زباں میں کیا غور میں
کیا دکھنی بولی میں اس کی تمام — "قصہ بیر بکرم" رکھا اس کا نام
ہے بندوں میں بندہ یہ کم تر فقیر — کہا جس نے یہ قصہ بے نظیر
رکھے شوق نامہ کرے سیر او — پڑے حق میں مجھ فاتحہ خیر او
یہ نامے کوں یاں میں کیا ہوں تمام — محمد پو پڑ کر درود اں سلام

للو لال جی کوی کی اردو "سنگھاسن بتیسی" کے متن کی نایابی کے باوجود

جو کچھ معلومات اس پر زیرِ نظر ہیں ان کی روشنی میں اندازہ ہوتا ہے کہ فقیر دکنی کے ماخذ اور للو لال جی کوی کے اصل قصوں کی نہ صرف جزئیات میں بلکہ متنی ترتیب اور ۳۲ داستانوں کے واقعات میں بھی بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ باضابطہ تقابل اور تجزیے کی صورت میں حتمی طور پر یہ طے پا سکے گا کہ بہ لحاظ تعداد کتنے قصص مختلف واقع ہوئے ہیں اور مماثل حکایات کی تفصیلوں میں بھی کس قدر اختلافات رونما ہو چکے ہیں۔ محصلہ اطلاعات سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ افسانوی ادبیات کی دیگر مثالوں کی طرح "سنگھاسن بتیسی" کے اپنے متعدد متون بہ اعتبار قصص مختلف النوع واقع ہوتے ہیں اور مجموعی طور پر کہانیوں کی تعداد دوگنی یعنی ۶۴ سے متجاوز ہو چکی ہے۔ یہ بہرحال ایک دل چسپ لیکن مستقل اور وسیع مبحث ہے جس کا احاطہ کرنے کے لیے ایک اور نئی کتاب درکار ہوگی اور اس کی پہنائیوں کے ہی خیال سے راقم نے اوراق ہذا میں اس قصے کو اجمالاً بھی نہیں شامل کیا ہے۔ چند صفحوں سے اس کا حق ادا نہیں ہو سکے گا۔

سوئے اتفاق کہ فقیر دکنی کی مثنوی "سنگھاسن بتیسی" کے فاضل مقدمہ نگار مرحوم افسر صدیقی صاحب نے دکنی زبان و ادب کے تئیں شاید عدم دل بستگی کے باعث دکنی شعر و محاورہ پر چند در چند اعتراضات صادر فرمائے جو محض بر بنائے غلط فہمی ہیں لیکن اس منظومے کے زمانۂ تخلیق پر کوئی گفتگو نہیں فرمائی۔ "مخطوطات" ج ۵ ص ۱۳۴ ع ۳/۲۳۶ پر مثنوی ہذا کے تذکرے میں بزرگ مغفور نے "سنہ تصنیف قبل از ۱۱۱۹ ہجری" تحریر فرمایا ہے لیکن سند یا توجیہہ بیان نہیں کی۔ یہاں احتیاطاً مصنفہ قبل ۱۸۰۰ء ظاہر کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

(۲) للو لال جی کوی: "پریم ساگر" (مترجمہ ۱۸۰۳ء) ہرٹفورڈ ۱۸۵۱ء ترتیب دادہ ایڈورڈ بی ایسٹ وِک۔

بھگوت پران کے دسویں کھنڈ کے برج ترجمے کا ہندی قالب جو کرشن بھگتی کی حیثیت رکھتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی تحقیقی تواریخ میں اس ایڈیشن کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے' گارساں دی تاسی کے ایک خطبے میں ایسٹ وِک کے

اس کارنامے کا صرف ذکر ہے۔ یہ نادر و نایاب اور غالباً بہترین و عمدہ ترین ایڈیشن راقم کے پاس محفوظ ہے۔

(۳) مظہر علی خاں ولا: "بیتال پچیسی" مترجمہ ۱۸۰۳ء لاہور ۱۹۶۵ء
یہ دراصل للولال جی کوی کے ہندی متن کا اردو روپ ہے جس کو ولا سے منسوب کرکے شایع کیا گیا ہے۔ مرتب کتاب ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس غرض سے ناگری رسم خط کا مضمون اردو میں منتقل کروایا۔

(۴) دی تاسی: "خطبات گارساں دی تاسی" ۱۸۵۰ تا ۱۸۶۴ء حصہ اول ۱۹۳۵ء
کراچی ۱۹۷۹ء۔ (۱۹۷۴ء)
اس جلد سے للولال جی کوی اور ان کے کارناموں پر جستہ بالراست بھی اور بالواسطہ بھی دی تاسی کی اپنی قیمتی رائیں اور اس کی فراہم کردہ مختلف اطلاعیں بھی حاصل ہوتی ہیں جن کو متعلقہ مقامات پر سمویا گیا ہے۔ "پریم ساگر" کے خاص حوالے سے کرشن بیتی اور سیرت علیسوی ملتے جلتے سے واقعات اور اختلافات پر بھی دی تاسی کا بیان ذرا طویل ہو گیا ہے اور اس کے مذہبی زاویہ نگہ کے باعث "پریم ساگر" کی تفصیلوں سے خاصا غیر متعلق بھی۔ اس حد تک صرف اشارتی ذکر اور حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے اور اس کے سوا باقی سب مواقع کے اظہارات کو مترجمہ الفاظ میں ہی اقتباس کیا گیا ہے۔ "خطبات گارساں دی تاسی" حصہ دوم میں للولال جی کوی کا کوئی مذکور نہیں ہے۔

(۵) دی تاسی: "مقالات گارساں دی تاسی" ۱۸۰۷ تا ۱۸۷۷ء جلد اول و دوم
(۱۹۴۳ء) کراچی ۱۹۶۴ تا ۱۹۷۵ء
فورٹ ولیم کالج اور للولال جی کوی کے متعلقات پر اطلاعیں اور آرا حاصل ہوتی ہیں جن سے موقع بموقع فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ دی تاسی نے اپنے معاصرین کے ساتھ چند جگہوں پر للولال جی کوی کے محسن اور "پریم ساگر" کے مرتب و مترجم ایڈورڈ بی ایسٹ وِک کے علمی منصوبوں کے علاوہ اس کے سفر ہند کی مصروفیات کا بھی جلد ۲ میں ذکر کیا ہے، جس کی اس قدر تفصیل کسی اور ذریعے سے دریافت نہیں ہو سکی ہے۔

(۶) مونیر ولیمس: "نل اوپکھیانم" ترجمہ ڈرین لمین لندن ۱۸۷۹ء
مہابھارت کے چھٹے کھنڈ کی داستان نل دمینتی کا اصل و مترجمہ متن
بالمقابل صفحات پر۔

(۷) پروفیسر سید محمد: "اربابِ نثر اردو" حیدرآباد ۱۹۲۷ء صفحات ۳۴۲
فورٹ ولیم کالج کے متعدد اہلِ کمال کا اوّلین مستقل و مفصل تذکرہ جس سے مولانا حامد حسن قادری (صاحب "داستانِ تاریخ اردو") سے لے کر پروفیسر وقار عظیم (مصنف "فورٹ ولیم کالج: تحریک اور تاریخ") تک نے بنیادی معلومات اخذ اور خلاصہ کیں۔ پروفیسر سید محمد کے بعد کی باقاعدہ و منضبط تحقیقات سے مزید چند شخصیتوں اور کئی ایک کتابوں کا اضافہ ہوا جب کہ مولوی سید محمد کی فراہم کردہ کچھ اطلاعات کی تصحیح اور تردید بھی ہوئی ان نئے اور کثیر اضافوں کے باوجود بطور افتتاحی ماخذ اور بنیادی وسیلہ "اربابِ نثر اردو" کی قدر و قیمت میں یقیناً کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

حسن اتفاق کہ "بنگال میں اردو تذکرہ نگاری" میں طویل عرصہ بعد پروفیسر سید محمد کے اس اساسی کام کی قدردانی کا مظاہرہ ڈاکٹر عبدالمنان نے کیا ہے۔ فاضل موصوف کے قدر شناس الفاظ کے مطابق: "فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے منشیوں کی ادبی خدمات پر جس نے پہلی بار قدرے تفصیل سے توجہ مبذول کی اور اردو دنیا کو اس کالج کے ماتحت اردو نثر کی خدمات سے روشناس کیا وہ سید محمد ہیں، جن کی کتاب "اربابِ نثر اردو" اردو ادب کی تاریخ میں ناقابلِ فراموش حیثیت کی حامل ہے۔ ناقابلِ فراموش اس اعتبار سے کہ انہوں نے فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کی نثری خدمات کا اختصار کے ساتھ ذکر کر کے تفصیلی مطالعے کا دروازہ کھول دیا اور بعد کے محققوں کی اس گوشہ پر نظر پڑی" (ص ۱۲۶)

"سید محمد اور اربابِ نثر اردو" نامی باب کے ان ابتدائی تعارفی کلمات کے علاوہ تذکرہ نگار موصوف نے اختتامی سطور میں بھی بصفحہ ۱۳۱، پروفیسر سید محمد کے افتتاحی کارنامے کے تاریخی اثرات کی نشان دہی کرتے ہوئے ان متعاقب مورخین اور محققین و ناقدین کی فہرست درج کی ہے جنہوں نے صاحب "ارباب

نثر اردو کے نقشِ قدم پر عمل کرتے نئے کارنامے پیش کرنے کی تحریک اور قوت حاصل کی۔ ڈاکٹر عبدالمنان کا فرمودہ ہے کہ "سید محمد کی اس کوشش کے بعد فورٹ ولیم کالج پر خامہ فرسائی کرنے کا دروازہ پاک و ہند میں کھل گیا' اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اوّلاً تو یہ کہ سید محمد نے جس اختصار کے ساتھ اس وسیع موضوع کو پیش کیا تھا۔ اس میں فورٹ ولیم کالج کی کل روداد کی شمولیت ممکن نہیں تھی۔ لیکن بعض محققوں کے دلوں میں یہ جذبہ لہریں مارنے لگا تھا کہ اس وسیع موضوع کو پوری جامعیت اور معنویت کے ساتھ اُردو دنیا کے سامنے لایا جائے تاکہ نثر کی تاریخ کا ایک اہم باب روشن ہو۔ دوئم جدید تحقیق کا وہ غایتی میلان ہے جو ادب کے کسی موضوع پر خصوصی مطالعے کا دروازہ کھول دیتا ہے' ایسی صورت میں ہند و پاک کے ممتاز محققوں نے بطور خاص فورٹ ولیم کالج پر توجہ صرف کی۔"

(۸) علامہ نیاز فتح پوری: "ہندی شاعری کی تاریخ" (مصنفہ ۱۹۳۶ء)
"نگار" کا "ہندی شاعری نمبر" کراچی ۱۹۸۴ء۔

افسوس کہ اس تاریخی تحقیق کا کتابی ایڈیشن آج تک شایع نہیں ہوا۔ ادبیات ہندی کی باقاعدہ اردو تواریخ کی عدم موجودگی میں علامہ نیاز کی افتتاحی تصنیف بساغنیمت معلوم ہوتی ہے۔ للولال جی کوی کے تعارفی تاثر سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ ایک مستقل تاریخ ہے۔

(۹) "نگار" کا "ہندی شاعری نمبر" (لکھنؤ ۱۹۳۶ء) کراچی ۱۹۸۴ء

علامہ نیاز فتح پوری کی مختصر مفید و مستقل تصنیف "ہندی شاعری کی تاریخ" کے علاوہ رام کمار ورما و احتشام رضوی صاحبان کے مقالات اور ڈاکٹر اعظم کریوی کی کتاب "ہندی شاعری" کے اجزاء زیر استفادہ ہیں جن کا فہرست ہذا میں فرداً فرداً ذکر موجود ہے۔

(۱۰) ڈاکٹر گیان چند جین: "اردو کی نثری داستانیں"
(مصنفہ ۱۹۵۴ء) کراچی ۱۹۶۹ء۔

للولال جی کوی پر راست تو نہیں البتہ متعلقہ مباحث کے کسی ایک

پہلوؤں پر مفید و قیمتی آرا، سے فیضان حاصل کرکے آیندہ صفحات میں شامل کیا جارہا ہے۔

(۱۱) **پروفیسر حبیب اللہ غضنفر:** "ہندی ادب" (مصنفہ ۱۹۵۵) کراچی ۱۹۸۸
مختصر مفید تاریخ جس میں سے "للولال جی کوی پر تاثر" سے بحث کی جائے گی۔

(۱۲) **پروفیسر وقار عظیم:** "ہماری داستانیں" (۱۹۵۶) دہلی ۱۹۸۰ء۔
"بیتال پچیسی" پر ایک عمدہ ادبی انتقاد اس مجموعے کے مندرجات میں اہمیت کا مالک ہے، جس کو بعدازاں سید وقار عظیم کے ترتیب دادہ "بیتال پچیسی" کے طبع کراچی میں بطور مقدمہ شامل کیا گیا ہے۔

(۱۳) **پروفیسر وقار عظیم:** "فورٹ ولیم کالج: تحریک اور تاریخ" (قریب ۱۹۵۷) لاہور ۱۹۸۸ ص ۲۴۸

"للولال جی کوی" کا تذکرہ تین صفحات میں ہے۔ کتاب کے اخیر میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے چند متعلقہ نگارشات وقار کے ہم راہ سبطِ حسن و ضمیر نیازی صاحبان کے بھی دو مقالے اضافہ کیے ہیں۔ پروفیسر سید محمد کے بعد سید وقار عظیم نے بھی للولال جی کوی سے "سنگھاسن بتیسی" کا اردو ترجمہ منسوب کیا ہے اور اس کے کسی ایڈیشن سے چند عبارتیں اقتباس فرمائی ہیں۔

تاریخ تصنیف چوں کہ مرحوم مصنف کے تیار کیے ہوئے مسودے پر درج نہیں ہے اس لیے فاضل مرتب نے اپنے مخصوص محققانہ انداز میں اس کو قریب ۱۹۵۷ 'متعین' کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے فرمودات کے بموجب سید وقار عظیم نے یہ کتاب ۱۹۵۳ تا ۱۹۵۷ کے دوران تحریر فرمائی تھی۔ پروفیسر وقار عظیم کے "للولال جی کوی" کی اردو "سنگھاسن بتیسی" سے متعلقہ تاثر بصفحہ ۱۳۳ سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کے ملاحظات ۱۹۵۰ء کے قبل و بعد کے قریبی عرصے کے ایڈیشن پر مبنی ہوں گے۔ چوں کہ مرحوم نے کوئی حوالہ درج نہیں کیا، اس لیے یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے کہ ان کے زیر مطالعہ "للولال جی کوی" کی مترجم "سنگھاسن بتیسی" کا کوئی نیا ایڈیشن رہا ہوگا یا پرانا۔ البتہ ان کے مطالعہ میں وہ کب آیا ہوگا اس کا بھی تعین نہ صرف تحقیق طلب ہے بلکہ

ممکن ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر کتاب کی تاریخ تصنیف کے از سر نو تعین کا بھی امکان سامنے آتا ہے۔ سید وقار عظیم کا مجموعہ مقالات "ہماری داستانیں" ابتداً ۱۹۵۶ء کا مطبوعہ ہے جس میں "بیتال پچیسی" پر مضمون کے آخری کلمات میں موجود "سنگھاسن بتیسی" کے سرسری ذکر سے باور آتا ہے کہ اردو "سنگھاسن بتیسی" اس وقت ہم دست نہ تھی، مرحوم بزرگ کے یہ الفاظ ہیں کہ "ان کہانیوں کا پس منظر خالص ہندوستانی ہے اور یہ امتیاز اردو میں لکھی ہوئی قدیم کہانیوں میں صرف "بیتال پچیسی" کا امتیاز ہے یا اس سے کم تر درجے پر "سنگھاسن بتیسی" کا۔ (ص ۳۴۶) "بیتال پچیسی پر وقار صاحب کا یہی جائزہ "ماہ نو" نومبر ۱۹۵۶ء میں بھی شایع ہوا اور ظاہر ہے کہ اردو "سنگھاسن بتیسی" کا کوئی ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں حاصل ہو جاتا تو "ہماری داستانیں" میں ایک نئے مضمون کا نہ سہی کم از کم "بیتال پچیسی" والے مقالے میں ہی چند ایک تقابلی سطروں کا اضافہ ضرور ہو جاتا۔ دوسری طرف اسی "بیتال پچیسی" کا متن ایڈٹ کر کے سید وقار عظیم نے ۱۹۶۲ء میں حوالہ ناشر کیا جیسا کہ "بیتال پچیسی" کے آخر ورق پر اختتامیہ ناشر سے مظہر ہے، نئے مقدمے سے مزین کرنے کے بجائے پروفیسر وقار عظیم نے "ہماری داستانیں" اور "ماہ نو" والا پرانا مضمون ہی "بیتال پچیسی" کے اپنے ایڈیشن میں بطور مقدمہ استعمال کرنے پر اکتفا کیا جس میں "سنگھاسن بتیسی" کا حوالہ منقولہ بالا الفاظ تک محدود ہے۔ اس رویے سے عیاں ہے کہ ۱۹۶۲ء تک للو لال جی کوی کی اردو "سنگھاسن بتیسی" کا وہ ایڈیشن ممکن ہے پروفیسر صاحب کے مطالعہ میں نہ آسکا ہو جس سے فورٹ ولیم کالج پر کتاب میں اقتباس انہوں نے شریک کیا۔ تمام تر اعتبارات سے صرف یہ امکان باقی رہ جاتا ہے کہ مسودہ کتاب میں حسب ضرورت وقتاً فوقتاً اضافوں کا عمل جاری رہا اور کسی موقع پر للو لال جی کوی کی اردو "سنگھاسن بتیسی" فراہم ہونے پر متعلقہ حصۂ مضمون کا اضافہ کیا گیا۔ اس طرح فورٹ ولیم کالج: تاریخ اور تحریک" کا عرصۂ تصنیف خواہ ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۷ء مقرر کر لیا جائے۔ اس کی تاریخ تکمیل ۱۹۶۲ء کے بعد کی ہی طے پا سکتی ہے۔

یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ "بیتال پچیسی" پر گذشتہ مضمون (مصنفہ ۱۹۵۶ مشمولہ "ہماری داستانیں") کو بطور مقدمۂ بیتال پچیسی، ۱۹۶۲ء میں حوالہ ناشر

کسے تک اردو "سنگھاسن بتیسی" کا متن پروفیسر وقار عظیم کو حاصل نہ ہوا ہوگا وگرنہ "فورٹ ولیم کالج" پر کتاب میں کچھ نہ کچھ تقابل کا اضافہ ہوتا' اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ للولال جی کوی کے اردو ترجمہ "سنگھاسن بتیسی کے ذکر میں دونوں کا مقابلہ انہوں نے ان لفظوں میں کیا: "اس مجموعے کی کہانیوں کی فضا اور ماحول اور پس منظر بھی "بیتال پچیسی" کی کہانیوں کی طرح خالص ہندوستانی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے تخیل فکر اور اسلوب کے لحاظ سے یہ مجموعہ "بیتال پچیسی" سے کم تر درجے کا ہے" (ص ۱۳۴)۔ یہاں اس بے داد پر کچھ عرض کرنے کا محل نہیں ہے البتہ ظاہر ہے کہ سید وقار عظیم نے "فورٹ ولیم کالج" میں منقولہ الفاظ کا اضافہ ۱۹۶۲ء کے بعد کیا ہوگا۔

(۱۴) **انتظام اللہ شہابی:** "قاموس الکتب" جلد ا' انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۶۱ء

اس ضخیم تذکرہ مخطوطات و مطبوعات میں لاتعداد ہم موضوع اندراجات موجود ہیں تاہم "للولال جی کوی" کے "پریم ساگر" کے اصل ماخذ یعنی بھگوت گیتا کے دسویں کھنڈ کے برج ترجمے سے ہم رشتہ کتابوں کے اندراجات کے انتخاب تک فی الحال محدود رہنا پڑا ہے۔ "قاموس الکتب" کے مندرجات کی کثیر تعداد اپنی جگہ قیمتی اور فائدہ بخش ہے لیکن تصریحات کی مجمل و تشنہ کیفیت سخت غیر تسلی بخش ہے اور اس کی افادیت کو متاثر کرتی ہے۔ موضوعات و ضمنیات کی تقسیم و ترتیب بھی بہ مشکل ہی درست کہی جا سکتی ہے۔

(۱۵) **پروفیسر عزیز احمد:** "اسٹڈیز ان اسلامک کلچر ان دی انڈین انوائرنمنٹ" (مصنف ۱۹۶۲) کراچی ۱۹۷۰ء

عزیز احمد نے چند مقامات پر للولال جی کوی کے خاص حوالے سے ہندی اردو تنازعوں پر جائزوں کے دوران گریرسن اور سنتی کمار چیٹرجی کے اقوال سے سند لی ہے جن سے متعلقہ مباحثے میں فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا ترجمہ کتاب لاہور سے زیر طبع ہے۔

(۱۶) **ڈاکٹر سہیل بخاری:** "اردو داستان تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" (مصنفہ ۱۹۶۳ء) اسلام آباد ۱۹۸۷ء

پروفیسر سید محمد اور وقار عظیم صاحبان کے بعد ڈاکٹر سہیل بخاری وثوق اور قطعیت سے ترجمہ "سنگھاسن بتیسی" کو للولال جی کوی کی کاوش قرار دیتے ہیں اور ایک اور اردو ایڈیشن سے بمع اقتباس استدلال کرتے ہیں۔ دیگر مترجمین کی کتابوں پر للولال جی کوی کے تصرف و اثر کی جانب بھی اشارات واضح ہیں۔

(۱۷) افسر صدیقی امروہوی: "مخطوطات انجمن ترقی اردو" جلد اوّل تا ششم، کراچی ۱۹۶۵ تا ۱۹۸۲۔

(۱۸) سید سرفراز علی رضوی: "مخطوطات انجمن ترقی اردو" (فارسی، عربی اجمالی فہرست) کراچی ۱۹۶۷ء

دونوں تذکروں سے اہم اندراجات حاصل ہوئیں۔

(۱۹) ڈاکٹر جاوید نہال: "بنگال کا اردو ادب انیسویں صدی میں" (مطبوعہ ۱۹۶۹ء) کلکتہ ۱۹۸۴ء

پروفیسر جاوید نہال کی محققانہ تصنیف کے مشمولات کا معتد بہ حصہ فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات سے متعلق ہے، للولال جی کوی کا تعارف "لطایف ہندی" کے خصوصی حوالے سے کرایا ہے۔ کتاب کے بیانات افسوس کہ بلا تحفظات لایقِ اکتساب و حوالہ نہیں ہیں اور خود للولال جی کوی کے ہی تعلق سے بڑی احتیاط کی ضرورت پیش آتی۔ حیرت یہ ہے کہ اس طبع تازہ میں گذشتہ تحقیقی فروگذاشتوں سے محفوظ رکھنے پر توجہ نہیں دی گئی حالاں کہ اس سے غالباً کافی قبل ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا کارنامہ سامنے آچکا تھا۔

(۲۰) ڈاکٹر سہیل بخاری: "اردو کا روپ" لاہور ۱۹۷۱ء

"اردو کا گھر اور گھرانا" کے تعین کی لسانی بحث میں للولال جی کوی کے استعمال کیے ہوتے نام "کھڑی بولی" پر بھی ڈاکٹر سہیل بخاری نے روشنی ڈالی ہے جس سے جدید ہندی کی تجدیدی کاوشوں میں للولال جی کوی کے حصے پر معروضات میں استفاضہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔

(۲۱) ڈاکٹر فرمان فتحپوری: "اردو کی منظوم داستانیں" کراچی ۱۹۷۱ء

"سنگھاسن بتیسی" نامی اردو مثنویوں پر معلومات کا اضافہ ہوتا ہے۔

(۲۲) **ابراھیم یوسف**: "اندر سبھا اور اندر سبھائیں" لکھنؤ ۱۹۸۰ء
للولال جی کوی کے "پریم ساگر" کے اردو روپ اور مترجم کا سراغ اوّلاً اسی سے ملتا ہے۔ مع دو اقتباسات جنہیں شریک بحث کیا گیا ہے۔

(۲۳) **پروفیسر عتیق احمد**: "مضامین پریم چند" کراچی ۱۹۸۱ء
پریم چند کے مقالے متعلقہ ست سئی بہاری لال سے استفادہ بہ سلسلہ "لال چندریکا" مصنفہ للولال جی کوی۔

(۲۴) **سید مقیت الحسن**: "کلکتہ کے قدیم اردو مطابع اور ان کی مطبوعات: ایک تذکرہ" کلکتہ ۱۹۸۲ء۔

فورٹ ولیم کالج کے متعلقات کے من جملہ ہندوستانی پریس کی جس قدر تفصیل صاحبِ موصوف نے بصفحات ۲۹ تا ۴۳ جمع کی ہے وہ کالج کی تحقیقی تواریخ میں بھی اس ترتیب کے ساتھ پیش نہیں کی گئی۔ تاہم ہندوستانی پریس کی مطبوعات کے ذکر میں للولال جی کوی کے اردو تراجم اور تصنیفی کارناموں کی اشاعت کی کوئی نئی تفصیل حاصل نہیں ہوتی ہے صرف ان کتابوں کے ناموں کی جستہ جستہ نشان دہی ملتی ہے۔ البتہ متفرق امور پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔ کرم فرما حضرت شہزاد منظر نے کتاب عاریتاً عنایت کی۔

(۲۵) **ڈاکٹر عبیدہ بیگم**: "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" لکھنؤ ۱۹۸۳ء ص ۲۳۷

پروفیسر سید محمد کا یہ ابتدائی تاثر آج بھی قریب قریب درست ہوتا کہ "اُن (للولال جی کوی) کے حالات زندگی بالکل پردۂ تاریکی میں ہیں، صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ ـــــ "اور اسی "صرف" میں محض کسی قدر اضافہ ان ساٹھ سے زاید برسوں میں ممکن ہو سکتا، اگر ڈاکٹر عبیدہ بیگم فورٹ ولیم کالج کے متعدد متعلقین کی طرح للولال جی کوی کی زندگی کا ایک مرتب سفرنامہ پیش نہیں کرتیں۔ کتاب کیا ہے فورٹ ولیم کالج پر انسائیکلو پیڈیا ہے، اپنے مبحث پر ایک ایسی ضخیم ترین ریسرچ ہے جو فاضل مصنفہ کے ذوقِ جستجو کی آئینہ دار

ہے۔ یہ تصنیف ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی علمی دقیقہ رسی کے علاوہ لسانی ہمہ دانی کی بھی مظہر ہے۔ چنانچہ موصوفہ محترمہ نے ہندی کے ساتھ ساتھ برج بھاشا کی کتابوں سے بھی خاطر خواہ استفادہ کر کے اہم اقتباسات جمع کیے ہیں جو بڑے نادر اضافے ہیں۔ کتاب خانہ خدا بخش کے زیرِ اہتمام جدید اردو تحقیق پر منعقدہ ایک بڑے سیمینار میں جہاں پی ایچ ڈی کی کسی تصانیف کے علمی معیار پر شکوک کا اظہار کیا گیا، ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے اس کارنامے کی خصوصیت سے ستائش کی گئی جس کا پورا پورا استحقاق اس کو ہر طور اور ہر نوع حاصل ہے۔

البتہ ابواب کی جو ترتیب قایم کی گئی ہے اس کی بنا پر تمام متعلقہ ادبا کے کارہائے نمایاں مختلف شعبوں کے تحت منقسم ہو گئے ہیں اور نتیجتاً ہر ایک شخصیت کے کاموں کی تفصیل اکٹھی ہم دست نہیں ہوتی ہے بلکہ متعدد مقامات پر منتشر سی ہو گئی ہے۔ مثالاً للولال جی کوی کی سوانح مصنفین کے باب میں نمبر ۴ پر بہ صفحات ۵۲ تا ۱۵۶ مفصل تحریر ہے جب کہ ان کی کتابوں کے تذکرے تصانیف کے باب میں داستان، مذہب، تاریخ، دواوین وغیرہ عنوانات کے تحت پھیلے ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ خود للولال جی کوی کے ہی بارۂ خاص میں یہ تحقیق نئے انکشافات نیز بسیط معلومات اور مفید آرا کا مجموعہ زیبا ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ اگر عرض کردہ ترتیب کے ساتھ جیسے خود پروفیسر عبیدہ بیگم صاحبہ کی پیش رو معاصر محترمہ ڈاکٹر نثار دادیوی نے بھی کیا ہے۔ مثلاً للولال جی کوی کے احوال و آثار بمع مزید تفصیلات یک جا ہو جاتے تو شاید فرداً فرداً ہر ایک مکلف پر الگ الگ کتاب کی ضرورت کا خیال نہ آتا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ انسائیکلوپیڈیائی تصنیف کس قدر تازہ اطلاعات کو جامع ہے اور کتنی دقیق النظری اور علمی ریاضت کی حامل۔

(۲۶) **جمیل نقوی** :" اردو نثر کا ارتقا: چودھویں صدی سے فورٹ ولیم کالج تک" در تنقید و تفہیم کراچی ۱۹۸۴ء

کالج کے تقریباً سارے نثر نگار اردو افاضل کو شریک جائزہ کیا گیا ہے لیکن اس مختصر مفید تذکرے میں للولال جی کوی کا صرف نام لینے پر اکتفا کیا گیا ہے ... قطع نظر یہ ایک مستقل تصنیف ہے چنانچہ ناشرین نے اس

کا علاحدہ ایڈیشن بھی طبع کیا ہے۔

(۲۷) ڈاکٹر شہناز انجم: "ادبی نثر کا ارتقا" دہلی ۱۹۸۵ء

فورٹ ولیم کالج کی ادبیات پر قابلِ استفادہ انتقاد کا مجموعہ چند عمدہ اظہارات منقول ہیں۔ کتاب لاہور سے بھی شایع ہو گئی ہے۔

(۲۸) مانک ٹالا: "پریم چند اور تصانیف پریم چند: کچھ نئے تحقیقی گوشے" دہلی ۱۹۸۵ء۔

"بہاری ست سی" کے ایک ہندی ایڈیشن پر منشی پریم چند کے تبصرے سے استفادہ متعلقہ "لال چندریکا" تصنیف للولال جی کوی۔

(۲۹) اختر راہی: "ترجمہ ہائے متون فارسی بہ زبان ہائے پاکستانی" اسلام آباد ۱۹۸۶ء

"سنگھاسن بتیسی" کے سلسلہ تراجم پر معلومات حاصل ہوتی ہیں، یہ قابلِ قدر تصانیف فاضل مرتب کا عطیۂ خلوص ہے۔

(۳۰) ڈاکٹر عبدالمنان: "بنگال میں اردو تذکرہ نگاری" کلکتہ ۱۹۸۸ء

"سید محمد اور ارباب نثر اردو" کے عنوان سے ایک عمدہ جائزے کے علاوہ کتاب اپنے متعلقات پر خاصی فایدہ مند اطلاعات پیش کرتی ہے۔

(۳۱) ڈاکٹر سمیع اللہ: "فورٹ ولیم کالج ایک مطالعہ" سلطان پور ۱۹۸۹ء ص ۲۲۸

تازہ ترین تصنیف جو اپنے موضوع کی تفصیلات و جزئیات پر قدرے مختصر ہونے کے باوجود کافی نئی معلومات اور قیمتی اضافوں کی حامل ہے۔ "للولال کوی" کا ذکر کل دو صفحوں میں محدود ہے جن میں صرف دو اردو کتب کا اجمالی حوالہ اور احوال زندگی بھی اختصار سے دیا گیا ہے۔ زیادہ اہمیت ان اطلاعات کو حاصل ہے جو کالج کے بعض نسبتاً کم معروف امور و مسایل کی تفصیل میں ہیں جب کہ قدرے مشہور حقائق پر بھی اضافی کیفیات کو مفصل طور پر پیش کیا گیا ہے۔

اضافۂ کتب:

پروفیسر سید محمد عبداللہ کی ان دو تصانیف عالیہ کا شمول تاریخی ترتیب میں رہ گیا ہے۔

(۳۲) ڈاکٹر سید عبد اللہ :- "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ" (۱۹۳۵ء) لاہور ۱۹۶۷ء

(۳۳) ڈاکٹر سید عبد اللہ : "فارسی زبان و ادب : مجموعہ مقالات" لاہور ۱۹۷۷ء

دونوں تحقیقات سے مختلف مفید حوالے حاصل ہوتے ہیں جنہیں متعلقہ موقعوں پر درج کیا گیا ہے۔

(ب) نگارشات

(مقالات و مقدمات)

(۱) مرزا کاظم علی جوان : مقدمہ "شکنتلا" مترجمہ ۱۸۰۰ء لاہور ۱۹۶۳ء کراچی ۱۹۶۴ء۔

جوان کے سبب تالیف کتاب میں للولال جی کوی کے اور ان کے اس کام میں اشتراک باہمی کا حوالہ ملتا ہے مگر اس میں اس حقیقت کی پردہ پوشی ہوئی ہے کہ اصل کارنامہ للو لال جی کوی کا ہے کیوں کہ کاظم علی برج زبان وادب سے نابلد تھے۔ مرتبین میں سے صرف پروفیسر عبادت بریلوی نے اپنے فاضلانہ مقدمے میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے۔

(۲) مظہر علی خان وِلا : مقدمہ "مادھونل کام کندلا" مترجمہ ۱۸۰۱ء کراچی ۱۹۶۵ء

وِلا نے اشارہ بھی نہ کیا کہ آخر انھوں نے برج متن کو اردو کا روپ کیوں کر دیا لیکن خدا بھلا کرے ڈاکٹر عبادت بریلوی کا جنھوں نے تحقیق سے ثابت کیا کہ وِلا ایک اور ترجمے کے مقدمے میں للولال جی کوی کی معاونت بہ سلسلہ "مادھونل کام کندلا" کا اعتراف کر چکے تھے۔

(۳) **عبدالحق** (بابائے اردو): اہلِ یورپ نے اردو زبان کی کیا خدمت کی" "اردو" اورنگ آباد، جولائی ۱۹۲۴ء، قسط دوم "انگریزوں کی سعی: فورٹ ولیم کالج کلکتہ"۔

فورٹ ولیم کالج کی تاریخ اور خدمات پر اوّلین جدید تعارفی تحریر۔ قسط اوّل جنوری ۱۹۲۴ء ص ۱ تا ۱۷ کے حاشیہ ع ۱ کے مطابق "یہ اردو زبان و ادب کی تاریخ زیرِ تالیف کا ایک باب ہے، اس کا ابتدائی اور تاریخی حصہ کتب ذیل سے ماخوذ ہے: تاریخ پرتگال بنگالہ، دی انڈین اینٹکیوپرین، لنگوسٹک سروے آف انڈیا، ہابسن جابسن، تاریخ فورٹ ولیم کالج، مختلف سفرنامے، اسکیچ آف ہندوستانی لینگویج (از) لاہل وغیرہ" دوسری قسط "انگریزوں کی سعی: فورٹ ولیم کالج" ص ۴۸۵ تا ۵۰۰ میں مولفین اور مترجمین کے نام مع ان کی تالیفات "بغیر کسی ذیلی سرخی کے صفحہ ۴۹۶ سے شروع ہوتے ہیں" "سری للولال کوی" کی کیفیت ع ۱ پر درج ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق نے ان کی "فی الحقیقت ہندی نثر کے حق میں مسیحائی" کی توصیف کی ہے اور اعتراف کیا ہے کہ "فصیح ہندی نثر کی بنیاد اس شخص نے ڈالی"۔ تاہم قریب ۲۵ برس بعد بابائے اردو نے للولال جی کوی پر سخت تنقید بھی کی، ہر دو بیانات منقول ہیں۔

(۴) **ڈاکٹر اعظم کریوی**: "ہندی کا مشہور حسن نواز شاعر بہاری" "نگار" کا "ہندی شاعری نمبر" (۱۹۳۶ء) کراچی ۱۹۸۴۔

بہاری ست سی کی للولال جی کوی کی مصنفہ شرح کے سلسلے میں محولہ۔

(۵) **رام کمار ورما**: "ہندی شاعری اور قومی جذبات" "نگار" کا "ہندی شاعری نمبر" (۱۹۳۶ء) کراچی ۱۹۸۴ء

للولال جی کوی کی ایک کتاب کی ہم موضوع ایک اور تصنیف کا انکشاف ہوتا ہے۔

(۶) **احتشام رضوی**: "مغلیہ حکومت اور ہندی شاعری" "نگار" کا "ہندی شاعری نمبر" (۱۹۳۶ء) کراچی ۱۹۸۴ء

"سنگھاسن بتیسی" کا اردو ترجمہ للولال جی کوی سے موسوم کیا ہے۔ راقم نے

اپنے دلایل میں اس تاثر سے بھی مدد لی ہے۔

(۷) **پروفیسر وقار عظیم** : مقدمہ (۱۹۵۶ء) بیتال پچیسی ولا کراچی ۱۹۸۷ء
یہ مقالہ دراصل سید وقار عظیم کی کتاب "ہماری داستانیں" کے مشمولات میں سے ہے جس کو اس ایڈیشن مرتبہ مرحوم میں بھی درج کر دیا گیا ہے۔ تنقیدی اعتبار سے اعلا پائے کی تجزیہ نگاری کا نمونہ ہے مگر مترجم کے تعین سے سرے سے کوئی سروکار نہیں رکھا گیا ہے۔

(۸) **ڈاکٹر محمد اسلم قریشی** : مقدمہ "شکنتلا" جوان لاہور ۱۹۶۳ء
فاضل مقدمہ نگار نے للولال جی کوی کی ادبی اعانت کے تعلق سے متضاد معلومات جمع کی ہیں اور خود کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا ہے۔ اس امر پر کوئی توجہ منعطف نہ فرمائی کہ جوان برج لٹریچر اور زبان کا کتنا علم رکھتے تھے۔ چنانچہ مترجم کے تعین سے کوئی غرض نہ رکھی۔

(۹) **ڈاکٹر عبادت بریلوی** : مقدمہ "شکنتلا" جوان کراچی ۱۹۶۴ء۔
ترجمہ "شکنتلا" میں للولال جی کوی کے اپنے بنیادی عطیے پر فاضل محقق کا اپنا موقف صاف واضح ہے۔ اس امر واقعہ کا صراحت سے مذکور ہے کہ جوان برج ادب و زبان میں کس حد تک دخل رکھتے تھے انھوں نے سبب تالیف میں للو لال جی کوی کی بنیادی اعانت کے حوالے سے اجتناب ہی برتا تھا لیکن حقیقت مقدمہ مرتب میں صراحت سے عیاں کر دی گئی ہے۔

(۱۰) **ڈاکٹر عبادت بریلوی** : مقدمہ "مادھونل کام کندلا" ولا کراچی ۱۹۶۵ء
فاضل مرتب کتاب نے مبسوط مقدمے میں تحقیقی بنیاد پر اس امر کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ ولا نے یہ ترجمہ للولال جی کوی کی ہی مدد سے کیا تھا جس کا کوئی ذکر ولا نے اپنے سبب تالیف میں نہیں کیا۔ کئی برس بعد ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے بھی اپنے ضخیم تھیسس میں ولا کے ترجمہ "جہاں گیر شاہی" کے مقدمے کی ان عبارات کو ایک اور نسخے سے اقتباس کیا جن میں "مادھونل کام کندلا" کی اردو میں منتقلی کے لیے للولال جی کوی کی امداد کا حوالہ ہے۔

(۱۱) **ڈاکٹر گوہر نوشاہی** : مقدمہ "بیتال پچیسی" ولا لاہور ۱۹۶۵ء

فاضل مؤلف نے مختصراً سہی للّولال جی کوی کی ادبی سوانح کا بھی اہتمام کیاہے اور پروفیسر گیان چند کے اس تاثر پر بھی گفتگو فرمائی ہے کہ "بتیال پچیسی" کے اسلوب پر للّولال جی کوی کے اثرات موجود ہیں۔ للّولال جی کوی کے ادبی کمالات کا تذکرہ پہلی بار ایک پاکستانی اسکالر کے قلم سے نکلاہے اور خوش آیند ہے۔ البتہ یہ بات عجیب ہے کہ للّولال جی کوی کے ہندی متن کو اردو رسم خط کا قالب دے کر مترجمہ وِلا سے موسوم کر دیا گیاہے۔

(۱۲) پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب: "ناٹک بزم سلیمانؑ" مقالہ "نقوش" ۱۱۲ء اگست ۱۹۶۹ء نیز "لکھنویاتِ ادیب"

للّولال جی کوی کے ماخذ برج ترجمے سے بالراست مستفاد مثنوی "پریم ساگر" مصنفہ دیا شنکر فرحت کا اوّلاً اسی مقالے سے انکشاف ہوا۔

(۱۳) افسر صدیقی: مقدمۂ "سنگھاسن بتیسی" منظومہ فقیر دکنی کراچی ۱۹۸۴ء

مقدمہ نگار مرحوم ایک وسیع المطالعہ اور بزرگ محقق تھے مگر انہوں نے چتر بھوج کے فارسی ترجمے کو للّولال جی کوی کا ماخذ قرار دیاہے۔ جب کہ دکنی زبان و شعر پر ان کے ناقدانہ نکات قرین حقیقت نہیں ہیں بلکہ بہت بڑی حد تک سطحی واقع ہوتے ہیں۔

(۱۴) ضمیر نیازی: "فورٹ ولیم کالج" مشمولہ وقار عظیم: "فورٹ ولیم کالج" (۱۹۸۶ء) طبع ثانی ۱۹۸۸ء لاہور۔

للّولال جی کوی کے ادبی کردار کے ایک زاویے پر نگاہِ تنقید کرتے ہوئے راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند کا ایک قول نقل کیاہے جس کو راقم نے متعلقہ باب میں شریک رکھاہے۔ کیوں کہ اس کا ماخذ حاصل نہیں ہو سکاہے۔

(۱۵) پروفیسر اُمِ سلمٰے: "ثلاثہ غسالہ حصّہ اردو پر ایک نظر" "قومی زبان" کراچی، جولائی ۱۹۹۰ء

ڈھاکہ کے حکیم حبیب الرحمٰن کے مصنفہ تذکرہ کتب میں سے للّولال جی کوی کی دو اردو مطبوعات کا جائزہ شریک کیاہے، راقم کی گذارش پر فاضل موصوفہ نے "سنگھاسن بتیسی" اور "لطایف ہندی" پر اقتباسات تحریر

کر کے عطا کیے ہیں۔

(۱۹) Moti Lal Banarsi Dass, M.L.B.D

News Letter on Indological Bibliography,

New Delhi, November 1990 to March 1991

ان معلومات کے علاوہ جو اس بے حد مفید مطلب کتاب نامہ سے ماہ بہ ماہ یک جا اور خاصی تعداد میں حاصل ہو جاتی ہیں۔ للولال جی کوی کی اس ادبی سوانح کی خصوصی مناسبت سے چند اہم مطبوعات کی اشاعت کی اطلاع بھی حالیہ شماروں سے ملی ہے۔ جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(ا) **ڈاکٹر کرسٹوفر شیکل اور آر اسنیل:** "ہندی اینڈ اردو سنس ۱۸۰۰۔اے کامن ریڈر"

دہلی ۱۹۹۰ء۔ اوایل انیسویں صدی کے مشترکہ اردو ناگری متون سے ۲۴ منتخبات دونوں رسوم خط میں، ہر اقتباس سے پہلے تعارفی خلاصہ میں مطالب کی ترجمانی کے ہم راہ متعلقہ تاریخی اور اسلوبی سیاق و سباق کو بھی واضح کیا گیا ہے نیز حوالوں اور تشریح کو بھی شریک رکھا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی خاص کر ہندی کتب کے جدید ایڈیشنوں کی عدم موجودگی میں اس تالیف کی افادیت عیاں ہے، ممکن ہے اس میں للولال جی کوی کے اردو میں کرواتے ہوتے اور ہندی میں کیے ہوتے چاروں تراجم سے اقتباسات کا شمول ہوا ہو۔ اس صورت میں ان ترجموں کے دونوں قسم کے متون کے مترجمین سے نسبت بھی روشنی میں آتے گی۔

(ب) **پروفیسر بھگوتی لال راج پروہت:** "راجا بھوج کا رچناوشو" جے پور ۱۹۹۰ء۔ دھار کے راجا بھوج کو "سنگھاسن بتیسی" کے مرکزی یا کلیدی کردار کی تو نہیں مگر ان کہانیوں کی دوسری اہم شخصیت کے طور پر پہچانا جاتا ہے جس سے ۳۲ پتلیاں یا مورتیاں بکرماجیت کی کہانیاں بیان کرتی ہیں۔ فاضل مصنف نے خاص تحقیق سے اسی راجا بھوج کے اپنے سیاسی اور علمی پس منظر کو روشن تر کر دیا ہے۔ "سنگھاسن بتیسی" کی وجہ سے بھوج کی شہرت

خاصی محدود و مشتبہ سی ہے مگر اس ریسرچ کے ذریعے اس کی تاریخی شخصیت کو جیتی جاگتی تصویر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ نیز کتاب کا تعارف مظہر ہے کہ راجا بھوج مذہبی علوم اور معاشرتی فنون از قسم ادبیات اور لغت و قواعد نیز سیاست اور آیورویدی طب کے علاوہ دھرم شاستروں اور علم نجوم کا بھی ماہر اور فاضل تھا۔ بھوج کی سنسکرت و پراکرت تصانیف نظم و نثر کا بھی کھوج لگایا گیا ہے۔ جن کی روشنی میں اس کے فضل و کمال کی جانچ پرکھ کی گئی ہے۔ غرضیکہ راجا بھوج کے سوانح اور کردار پر پڑے ہوئے غلط فہمیوں کے پردے چاک ہو گئے ہیں۔ البتہ یہ مترشح نہیں ہے کہ "سنگھاسن بتیسی" کے سلسلے کی منظوم و نثری داستانوں کی دھار کے اسی راجا سے واقعاتی نسبت ان جدید تحقیقات کی رو سے کس حد تک صحیح یا غلط قرار پاتی ہے، اغلب ہے کہ پروفیسر بھگوتی لال راج پروہت نے یہ عقدہ بھی حل کر لیا ہو گا۔

(ج) **بہاری لال**: "ست سئی" مع تعارف کرشنا بہادر، دہلی ۱۹۹۰ء۔ اس ۴۰۴ صفحوں کے ایڈیشن کی تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا ہے، ممکن ہے کہ مقدمہ نگار موصوف کا ہی ترتیب دادہ ہو۔ قیاس یہی ہے کہ کرشنا بہادر نے "بہاری ست سئی" کی تدوین و پیش کش میں للو لال جی کوی کی متنی تہذیب و تنظیم کو بھی رہنما کیا ہو گا اور ان کی شرح "لال چندریکا" پر افادی تبصرہ بھی۔

ج۔ مکتوبات

راقم کی حقیر گذارشوں کو قابلِ اعتنا خیال فرماتے ہوئے ثقہ و معتبر حاضرین کرام نے چند ضروری امور پر فاضلانہ رہبری سے فیض یاب فرمایا ہے۔ ان مکاتیب عالیہ میں تحریر فرمائی ہوئی معلومات اور آرائے گرامی سے مختلف مسایل کے حل میں آسانی ہوئی ہے اور بیش قرار اطلاعات کا بھی اضافہ ہو سکا ہے۔ ان خطوط کے قیمتی فرمودات سے آیندہ اوراق کے مباحث و معروضات کی ضرورتوں کے مطابق فائدہ اٹھایا گیا ہے، چنانچہ دورانِ اکتساب حوالہ و اقتباس کے مواقع آئیں گے۔

(۱) **ڈاکٹر شہناز انجم صاحبہ :** مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۹۰ء کے نامہ کرم میں فاضل موصوفہ نے "سنگھاسن بتیسی" کے اردو ترجمے کو "للولال جی کوی اور مرزا کاظم علی جوان کا مشترکہ کارنامہ ہونے کے بارۂ خاص میں اپنی رائے گرامی سے مستفید فرمایا ہے۔

(۲) **پروفیسر ام سلمٰے صاحبہ :** "مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۹۰ء کے نامۂ عنایات کے ہم راہ محترمہ موصوفہ نے تذکرہ "ثلاثۂ غسالہ" مصنفہ حکیم حبیب الرحمٰن ڈھاکہ کے حصہ اردو سے للولال جی کوی کی دو مطبوعات "سنگھاسن بتیسی" اور "لطایف ہندی" کے ایڈیشنوں کا احوال اپنے دست خاص سے نقل کر کے عطا کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ بقول پروفیسر صاحبہ: "ثلاثۂ غسالہ" اتنی خستہ حالت میں ہے کہ عکسی مشین میں اس کا اٹھانا ناممکن ہے، ہاتھ لگانے سے صفحے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں، لہٰذا میں مطلوبہ تین کتابوں کے تذکرے ہاتھ سے لکھ کر آپ کو روانہ کر رہی ہوں جو مختصر ہی ہیں۔"

(۳) **سلیم الدین قریشی صاحب :** "مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۹۰ء کے مراسلۂ گرامی کے ہم راہ للولال جی کوی کی "پریم ساگر" کے انگریزی ترجمۂ ایسٹ وِک کی عکسی نقول مرحمت کرتے ہوئے محترمی سلیم قریشی صاحب نے یہ اطلاع تحریر فرمائی کہ مذکورہ ایڈیشن ۱۸۶۷ء کا نہیں ۱۸۵۱ء کا مطبوعہ ہے جو اہم ترین انکشاف ثابت ہوئی۔ ٹھیک ایک ماہ بعد مرسلہ بلوم ہارٹ کے کیٹلاگ کے عکسی اوراق سے اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ "ارباب نثر اردو" کا متذکرہ سال ۱۸۶۷ء واقعتاً غلط تھا اور یہ کہ ایسٹ وِک کے ترتیب دادہ "پریم ساگر" کے ایڈیشن اور ترجمۂ انگریزی دونوں ہی کی اشاعت ۱۸۵۱ء میں عمل میں آئی تھی۔ ۲۰ نومبر ۱۹۹۰ء کے نامۂ والا میں ممدوح نے مطلع فرمایا کہ برطانیہ کے قومی شخصیات نامہ میں تذکرہ ایسٹ وک مشہور مورخ پروفیسر اسٹینلے لین پول کا تحریر کیا ہوا تھا اور ایڈیشن تھا ۱۹۶۴-۶۳ء سنہ کا طبع نو۔ ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ء کے لطف نامہ میں آپ نے اس کی توثیق فرما دی کہ "ایسٹ وک" کے "پریم ساگر" ہرٹفورڈ ایڈیشن کا مقدمہ صرف ایک صفحے پر ہی محیط ہے۔ اس کا عکس میں آپ کو ارسال کر چکا ہوں، اس کے علاوہ اس کی کوئی

مزید عبارت نہیں"۔ دراصل انگریزی ترجمے کے مقدمۂ ایسٹ وِک کے اس پہلے اور آخری صفحے پر خاتمۂ تحریر کی کسی نشانی از قسم تاریخ و جگہ کا کوئی اندراج نہیں ہے جس کی وجہ سے اشتباہ تھا کہ اس ورق کی پشت پر متن جاری نہ ہو۔ اتفاقاً عین یہی کیفیت راقم کے یہاں موجود اصل ہندی "پریم ساگر" کے ایسٹ وِک کے ایڈیشن کے بھی مقدمے کی ہے۔

(۴) **پروفیسر اے سی ٹکیکر صاحب:** مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کے تلطف نامہ میں آپ نے ڈاکٹرز سسیر کمار داس و نیرج گوئل کی انگریزی و ہندی تصنیفات فورٹ ولیم کالج کا انکشاف فرمایا۔ پروفیسر صاحب موصوف نے ۲۰ر دسمبر ۱۹۹۰ء کے کرم نامہ میں یہ ارشاد کیا کہ متذکرہ محققین کی کتب سے باوجود تلاش للولال جی کوی پر زیادہ تفصیلات نہیں مل سکی ہیں اور دونوں کی کتابیات کے ہم راہ متعلقہ حوالوں والے چند عکسی اوراق بھی ارسال فرماتے۔

(۵) **رام لعل نابھوی صاحب:** مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کے مفصل شفقت نامہ میں لالہ سوامی دیال اور منشی شنکر دیال فرحت صاحبان کی علی الترتیب نثری و منظوم اردو مطبوعات بنام "پریم ساگر" کے علاوہ للولال جی کوی کی اور کتب "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" پر مفید اور بکثرت اطلاعیں بزرگ ممدوح نے جمع فرما دی ہیں۔ حضرت رام لعل نابھوی نے ۳ر جنوری ۱۹۹۱ء کے مکتوب والا میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ "للولال جی کوی پر ایک مختصر چند سطروں کا احاطہ نادم سیتاپوری کا لکھا ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ سے ۱۹۵۹ء میں چھپا ملا ہے" نادم سیتاپوری اپنی دیگر تحقیقات کے علاوہ میر اکرام علی پر سوانحی کتاب کے بھی مصنف تھے اور دونوں تصانیف فورٹ ولیم کالج سے ان کی محققانہ دل بستگی اور ذہنی پیوستگی کی علامت ہیں۔ اہم تر یہی ہے کہ انہوں نے کتابچہ کی صورت میں سہی للولال جی کوی پر اولین تصنیف پیش کی۔ سطور ہذا کے "تعارف کتابیات" کے بطور تحریر ہونے تک راقم کی اپنی کاوش کا مبیضہ مکمل ہو چکا ہے اور یہ کتابچہ بھی وسط اپریل ۱۹۹۱ء تک حاصل نہیں ہو سکا ہے جس کا سخت افسوس ہے۔

(۶) **ڈاکٹر عبیدہ بیگم صاحبہ:** مورخہ ۲۲ر نومبر ۱۹۹۰ء کے

والانامہ میں "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" کی فاضل مصنفہ نے بنارس کے ادارے پرچو کھمبا وشوا بھارتی کے مطبوعہ للّولال جی کوی کی "پریم ساگر" کے جدید ایڈیشن سے مطلع فرمایا جس کا راقم کو سرے سے علم نہ تھا۔ بہ ایں ہمہ موجودہ ناشرین سے ربط ضبط کی کوششیں افسوس کہ کامیاب نہ ہو سکیں۔

(۷) جناب عطا خورشید صاحب: مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۹۰ء کے والانامہ میں آپ نے ایما فرمایا ہے کہ "للّولال جی کوی کی تصنیف "پریم ساگر" اردو خدابخش میں بھی موجود ہے جو ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ طباعت درج نہیں، دیہاتی پستک بھنڈار دہلی سے شائع ہوئی ہے" تفصیل کا انتظار ہے۔

(۸) ڈائرکٹر صاحب پنجاب آرکائیوز پٹیالہ: مورخہ ۷/۱/۱۹۹۱ کے موقر مراسلے میں فارسی "سنگھاسن بتیسی" کے مخطوطہ نمبر ایم ۵۴۴ پر تفصیلات کا خلاصہ تحریر فرمایا گیا ہے، دیگر تصریحات کا انتظار ہے۔

د۔ عکسیات

(نقول ابواب اور اجزائے کتب و مخطوطات اور مضامین

غیر معمولی اور خصوصی عطایا۔ کے طور پر چند کرم گستر و گرامی قدر افاضل نے بعض اہم مصادر کی عکسی نقول سے سرفراز فرمایا ہے جس کی تفصیل ان سب محسنین کے فرداً فرداً حوالے سے نذر ہے۔ ان عکسیات سے حسبِ موقع و ضرورت مختلف موقعوں پر اکتساب و استناد کیا گیا ہے۔ بہ لحاظ تعداد اوراق ان کے قلیل ہونے کے باوجود ان کی حیثیت راقم کے بنیادی ماخذ کے من جملہ دوسرے ذریعوں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان عکسی صفحات کی عدم موجودگی میں کتنے ایک پہلو تشنۂ تحقیق رہ جاتے اور یہ کاوش ناگزیر اطلاعات سے محروم محض رہتی۔ یہ حالت موجودہ ان گراں مایہ و گراں قدر اور فیاضانہ عطایا۔ نے اوراق ہٰذا کو بیش از بیش معلومات سے صحیح معنوں میں مالا مال کر دیا ہے۔ اس تعلق سے جزاک اللہ فی الدارین کی دعا پر قناعت نہ کافی ہوگی نہ مناسب، قارئین کرام کی جانبِ خاص سے خیر و برکت کی سب دعائیں اس حقیر کاہش میں دستگیری فرمانے والے علما۔ کے حق میں وقف ہیں!

(۱) جناب سلیم الدین قریشی، کیوایٹر شعبۂ اسلامی ذخائر جنوبی ایشیا،

برٹش لائبریری لندن:

(۱) للّولال جی کوی: "چھتر پرکاش" "چھترسال" مرتبہ ولیم پرلیس کلکتہ ۱۸۲۹: عکس سرورق انگریزی و ہندی بمع فہرس ابواب"

(۲) للّولال جی کوی: "پریم ساگر" انگریزی ترجمہ ایسٹ وِک ہرٹفورڈ لندن ۱۸۵۱ء عکس سرورق، پیش لفظ، متن ص ۱ تا ۳،

(۳) للّولال جی کوی: "بیتال پچیسی" انگریزی زیر لفظی ترجمہ ڈبلیو بی بارکر مرتبہ ایسٹ وِک ہرٹفورڈ ۱۸۵۵: عکس سرورق، پیش لفظ صفحہ ۵ تا ۱۸ (اولین پیراگراف میں ہندی متن ہذا کو دو جگہ للّولال جی کوی سے منسوب کیا ہے)

(۴) للّولال جی کوی: "لال چندریکا" مشمولہ "بہاری ست سئی" مرتبہ گریرسن کلکتہ ۱۸۹۶ء: عکس سرورق، پیش لفظ گریرسن، فہرست ص ۱ تا ۳، متن تعارفی مقدمہ گریرسن، للّولال جی کوی کی نظم نیز آپ بیتی اور تعارفی نگارش"

(۵) سی ای بک لینڈ: ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی" لندن ۱۹۰۶ء عکس سرورق، متن ص ۱۳۰ و ۱۳۱ متعلقہ ایسٹ وِک"

(۶) لزلی اسٹیفن: "ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی" ج ۶ آکسفورڈ (۱۹۲۱) طبع نو ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء: عکس سرورق، متن صفحہ ۴۲۳ و ۴۲۵ بابت ایسٹ وِک مصنف اسٹینلی لین پول"

(۷) بلوم ہارٹ: تذکرہ ہندی مطبوعات انڈیا آفس لندن: عکس اوراق ص ۱۹، ص ۳۲، ۳۳، ص ۳۸ و ۳۹، ص ۶ تا ۴۵، ص ۱۰۲ و ۱۰۳، ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

(۲) جناب پروفیسر اے سی ٹکیکر، یونیورسٹی لائبریرین، جامعہ بمبئی:

(۱) نامعلوم مترجم: "سنگھاسن بتیسی" فارسی مورخہ ۱۲۲۵/۱۸۱۰ء: عکس ابتدائی ۱۰ اوراق کا متن"

(۲) فریڈرک پنکاٹ: "پریم ساگر" (انگریزی ترجمہ) لندن ۱۸۹۷: عکس مقدمہ مترجم، ملخص ترجمانی شریک ہے۔

(۳) پروفیسر عبد القادر (سرفراز؟) سروری: انگریزی تذکرہ مخطوطات اردو

و فارسی جامعہ بمبئی: عکس متعلقہ فارسی "سنگھاسن بتیسی"۔

(۴) ورجبرتن داس: "پریم ساگر" ۱۹۹۲ء: عکس مقدمہ مرتب بمع سوانح "شری للّوجی لال کا جیون چرِت" تراجم پیش ہیں،

(۵) ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے: "آدھونک ہندی ساہتیہ" ۱۹۵۲ء: عکس ص۲۲ تا ۲۹، ص۳۴ تا ۳۸، ص۱۰۴ و ۱۰۵،

(۶) ڈاکٹر شارداد یوی ودیالنکار: "ڈیولپمنٹ آف ہندی پروز لٹریچر: ۱۸۰۰ تا ۱۸۵۶ء" دہلی ۱۹۶۹ء:
عکس صفحات ۲۴ تا ۷۷۔ شاردا دیوی صاحبہ نے یک جا ص۵۲ تا ۷۰، للّولال جی کوی کی کتابوں سے اقتباسات کے ہم راہ ادبی تبصرہ نیز لسانی و لغوی زاویوں سے تجزیہ بھی تحریر کیا ہے۔ بہ خصوصیت "پریم ساگر" کے حوالے سے بھرپور اکتساب کیا جارہا ہے۔"

(۷) ڈاکٹر سسر کمار داس: "دی صاحبس اینڈ منشیز" ۱۹۷۸ء:
عکس ص۱۸/۱۹، ص۷۰/۷۱، ص۸۴/۸۵، ص۱۰۴/۱۰۵، ص۱۸۰ تا ۱۸۵،

(۸) ڈاکٹر نیرج گوپل: "فورٹ ولیم کالج: ایک اتہاس" ۱۹۸۶ء
عکس ص۴۳/۴۴، ص۷۲/۷۳، ص۹۴ تا ۹۷،

(۹) دوارکا پرشاد شرما چترویدی: "چرتر کوش" (شخصیت نامہ) عکس صفحہ متعلقہ "للّولال" "ہندی ساہتیہ کوش" سے ماخوذ اس ۴۲ سطری تذکرہ للّولال جی کوی کا اختتامی تاثر یہ ہے: "ہندی کی کھڑی بولی کے نرماتاؤں میں للّولال کا استھان اُلیکھنیہ ہے۔" فہرست سازی میں سہو کچھ کتابیں درج نہیں ہیں اور کچھ نام غلط تحریر ہوتے ہیں۔

(۳) جناب رام لعل نابھوی:

(۱) منشی شنکر دیال فرحت: "پریم ساگر" لکھنؤ ۱۸۷۹ء:
عکس سرورق نیز متن ص۲ تا ۵

(۲) لالہ سوامی دیال: "پریم ساگر" لکھنؤ ۱۸۹۵ء:
عکس سرورق فہرس ص۳ تا ۴ نیز متن ص۱ تا ۳

(۳) رام لعل نابھوی: "بیتال پچیسی" "ہماری زبان" دہلی ۱۵ر جولائی ۱۹۸۷ء
عکسِ مقالہ ص۷و۸

(۴) رام لعل نابھوی: "ہماری داستانیں: سنگھاسن بتیسی" "ہماری زبان"
یکم ستمبر ۱۹۸۷ء عکسِ مقالہ ص۶ (پاکستان اور کشمیر کے فارسی نسخوں سے نئی فہرست
سازی" تازہ اضافوں کے ساتھ از سرِ نو تحریر کر کے مسودہ بغرض اشاعت انجمن
ترقی اردو کراچی کو مرسلہ)

④ جناب عطا خورشید کتاب خانہ خدا بخش، پٹنہ:

(۱) لالہ سوامی دیال: "پریم ساگر" لکھنو ۱۹۱۰ء
عکسِ سرورق نیز فہرست ص۲تا۴ متن ص۱ اور ص۲۲۶

⑤ جناب سید سراج الدین موسوی ڈائرکٹر خانہ فرہنگ ایران کراچی:

(۱) ڈاکٹر احمد منزوی: "فہرست مشترک پاکستان" (فہرست نسخہ ہائے
خطی پاکستان) مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد: عکس ج۶
ص۱۱۸/۱۲۱ نیز ص۱۴۱۲/۱۴۱۵ متعلقہ قلمیات موسومہ "سنگھاسن بتیسی" / "قصہ بکرماجیت"

حالاتِ زندگی

توطن، خاندان اور ولادت:

للولال جی کوی کے "پریم ساگر" کے مقدمے میں ان کے اپنے الفاظ "شری للولال کوی برہمن گجراتی سہسرادوتیچ آگرے والے نے ــــــ الخ" سے ظاہر ہے کہ للولال جی کوی برہمن خاندان کے تھے جو علاقہ گجرات یا ہندوستان کے موجودہ صوبہ گجرات کا متوطن تھا اور آگرے میں مقیم تھا۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے ادبیات ہندی اور فورٹ ولیم کالج کے جدید ہندوستانی مورخین سے استناد کے ساتھ جو معلومات پیش کی ہیں ان کی رو سے للولال جی کے والد کا نام چین سکھ[1] تھا، للوجی کی پیدائش آگرہ میں ہوئی" (ص۱۵۲) نیز یہ کہ للوجی کی تعلیم و تربیت آگرہ میں ہی ہوئی" (ص۱۵۳) البتہ اس سلسلے کی کچھ تفصیل نیز للولال جی کوی کے افراد خاندان اور اہل خانہ یعنی بھائی بہنوں اور ازدواج اور اولاد کے من جملہ صرف چند ایک کا "جیون چرت" سے علم ہوتا ہے۔ خاندان سہسرادوتیچ کہلاتا تھا۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اپنے مختلف مصادر سے محصلہ اطلاعات کی بنا پر للولال جی کوی کی ولادت "۱۷۶۲ء/۱۷۶۳ء" کے قریب متعین کی ہے جس کی تفصیل موصوفہ کے الفاظ میں منقول ہے: "ان کا سنہ پیدائش دریافت کرنے کی سب سے مضبوط بنیاد یہ ہے کہ ۱۹؍ دسمبر ۱۸۱۶ء کو سکریٹری لاکٹ نے ایچ ووڈ کے پاس کالج کی تفصیلات بھیجی تھیں جس سے یہ علم ہوتا ہے کہ اس وقت للوجی کی عمر ۵۵ سال کی تھی[2]۔ اس حساب سے ان کا سن پیدائش ۱۷۶۲-۱۷۶۳ء

۱۔: بحوالہ ڈاکٹر پرتاپ نراین ٹنڈن: "ہندی ساہتیہ کا پرورتی گت اتہاس" حصہ نثر جلد دوم لکھنؤ ۱۹۶۸ء ص۵۰۵

۲۔: ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے ص۹۲ بحوالہ انگریزی "فورٹ ولیم کالج پر متفرقات محکمہ داخلہ" بابت ۲۷/۱۰/۱۸۱۶ء تا ۲۲/۴/۱۸۱۸ء جلد ۶ ص۲۹۰/۲۹۳

کے قریب متعین ہوتا ہے لیکن لکشمی ساگر وارشنے نے مذکورہ تفصیل کی بنیاد پر للوجی کا سن پیدائش ۱۷۴۷ء درج کیا ہے[3]۔ وارشنے صاحب سے سہو ہوا ہے انھوں نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ کالج میں ملازمت حاصل کرنے کے وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی جب کہ دراصل ۱۹ دسمبر ۱۸۱۶ء میں وہ ۵۵ سال کے تھے۔ آچاریہ رام چندر شکل[4] نے للوجی کی پیدائش سمبت ۱۸۲۵ مطابق ۱۷۶۳ء میں بتائی ہے" (ص ۱۵۲/۱۵۳) یہاں یہ وضاحت ناگزیر ہے کہ پروفیسر وارشنے نے اپنی دوسری تصنیف "آدھنک ہندی ساہتیہ" کے پس منظری تعارف نامی باب کے ص ۳۸ پر یہ صراحت کر دی ہے کہ کالج کے دوران کے الوسار للولال کا جنم ۱۷۶۱ میں ہوا تھا تاہم ڈاکٹر سسر کمار داس نے بھی للولال جی کوی کا دوران حیات قریب ۱۷۴۷ تا ۱۸۲۴ء درج کیا ہے۔ (بہ صفحات ۱۸ و ۱۹) جو تاریخوں میں غلط فہمی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

کلکتہ آمد اور کالج سے وابستگی:

للولال جی کوی کے والد یا پرکھوں کے آگرہ میں توطن اختیار کرنے کے باوجود خود انہیں شمال سے مشرق کی سمت ہجرت کرنی پڑی شاید کسبِ معاش کی غرض سے جیسا کہ ڈاکٹر علیدہ بیگم راوی ہیں: "غالباً تلاش معاش نے للوجی کو آگرہ چھوڑنے پر مجبور کیا ہوگا' وہ آگرہ سے کب نکلے اس کا علم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر پرتاپ نرائن ٹنڈن نے ان کے مرشد آباد آنے کا ذکر کیا ہے جہاں للوجی کے تعلقات کرپا سکھی کے شاگرد گوپال داس سے تھے۔ اُن ہی کے توسط سے للوجی کی شناسائی مبارک الدولہ سے بھی ہو گئی تھی[5] لیکن وہ یہاں مطمئن نہ رہ سکے اور فورٹ ولیم کالج کی شہرت انہیں کلکتہ کھینچ لائی۔ یہاں انہیں کامیابی بھی حاصل ہوئی اور وہ شعبہ ہندوستانی میں ملازم ہو گئے۔ للوجی کا بیان ہے کہ "سمبت ۱۸۵۷ء (مطابق ۱۸۰۰ء) میں روزگار کمپنی کے کالج میں مقرر ہوا[6]" (ص ۱۵۳) اس ذیل میں بنیادی اطلاعات "جیون چرت" کے علاوہ

۳۔: وارشنے ص ۹۳۔ ۴۔: آچاریہ رام چندر شکل: "ہندی ساہتیہ کا اتہاس" (مطبوعہ کاشی) ص ۲۸۶

۵۔: ڈاکٹر ٹنڈن ص ۵۰۵

۶۔: ڈاکٹر وارشنے ص ۴۹، محقق موصوف کا اپنا ماخذ غیر مذکور۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ اسی باب کا آئندہ عنوان "للولال جی کوی کی آپ بیتی: کوی پریچے" اس سرخی کے تحت کوی پریچے کا اصل متن منقول ہے۔

خود للولال جی کوی کے اپنے الفاظ میں دوا گلے عنوانات کے تحت پیش ہوں گی۔

ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کے منقولہ للولال جی کوی کے ان الفاظ کے علاوہ ان کے ذریعے اور معلومات دستیاب نہیں ہوسکیں،[7] تاہم اس اجمال کی تفصیل میں کچھ اور اطلاعیں ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے ہی تحریر کی ہیں: "گل کرسٹ کو جب شعبۂ ہندوستانی میں بھاکھا منشی کی ضرورت کا احساس ہوا تو انہوں نے کالج کونسل کو ۴ جنوری ۱۸۰۲ء میں ایک خط تحریر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے پچاس روپے مشاہرے پر ایک بھاکھا منشی کے تقرر کی درخواست کی تھی۔[8] ۱۹ فروری ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل نے اس درخواست کو بہ خوشی منظور کر لیا اور فروری ۱۸۰۲ء میں بہ حیثیت بھاکھا منشی بہ مشاہرہ پچاس روپے للوجی کا تقرر عمل میں آیا۔ کالج کونسل نے ان کا یکم اگست ۱۸۰۱ء سے ۳۱ جنوری ۱۸۰۲ء تک کا بقیہ مشاہرہ ادا کر دینے کا حکم بھی دیا۔ لکشمی ساگر نے اس سے یہ اندازہ قایم کیا ہے کہ للوجی اس وقت تک "سرٹیفکیٹ منشی" کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔[9]" (ص ۱۵۴)۔ اس عہدے کو "سندی منشی" بھی کہا گیا ہے۔

"سرٹیفکیٹ منشی" یا "سندی منشی" فورٹ ولیم کالج کی تواریخ کے مطابق "چیف منشی" یا "ہیڈ منشی" یا "میر منشی" نیز "سیکنڈ منشی" اور "نائب منشی" یا "ماتحت منشی" کے علاوہ اور آخرالذکر عہدے سے بھی بعد کے درجے کا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالمنان کی روایت ہے کہ "کچھ سرٹیفکٹ منشی کہلاتے تھے جن کا کام یہ تھا کہ وہ طلباء کی رہائش گاہ پر جا کر پڑھاتے تھے" (ص ۱۲۹)۔ یہ گویا ابتدائی تعیناتی کی سرکاری شکل مقرر ہوئی تھی اور بعد میں عہدہ حسبِ موقع و ضرورت بڑھا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ پریم ساگر کے ایسٹ وِک ایڈیشن کے سرورق پر للولال جی کوی کو "للولال سابق بھاکھا منشی فورٹ ولیم کالج" نیز اس ایڈیشن اور ترجمۂ ایسٹ وِک میں بھی للولال جی کوی کے مقدمے کے مشترکہ انگریزی تعارف میں انہیں "کالج میں منشی" ہی لکھا گیا۔ اساتذہ

۷:- بحوالہ متفرقات مذکورہ ڈاکٹر وارشنے ص ۵۔ ۸:- انلس ضمیمہ ۲ ص ۵۔

اس حاشیے پر ڈاکٹر عبیدہ بیگم صاحبہ کا ارشاد ہے کہ "عتیق صدیقی نے للوجی کے تقرر کی تاریخ، جون ۱۸۰۳ء درج کی ہے (گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۹) یہ درست نہیں۔"

۹:- ڈاکٹر وارشنے ص ۵۱/۵

اور پروفیسروں کے عہدے منشیوں سے اوپر ہوتے تھے جو صرف انگریزوں کے لیے مختص تھے مگر تعلیم و تدریس کی ذمہ داریوں میں پروفیسر سے لے کر سندی منشی تک سبھی شریک تھے۔ کالج کے عہدوں نیز عہدہ داروں اور انہیں تفویض کیے ہوئے فرائض کی تفصیلیں ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے بہ صفحات ۵۸ و مابعد اور ۷۵ تا ۷۷ نیز ڈاکٹر سمیع اللہ نے بہ صفحات ۲۸ تا ۳۱ جمع کر دی ہیں جن کا اعادہ اوراق ہٰذا کی ضروریات سے زیادہ ہوگا۔ شعبۂ ہندوستانی سے للو لال جی کوی کے منسلک رہنے کی مناسبت سے معاصر محققین کے ان بیانات کا اضافہ کافی ہوگا، ڈاکٹر سمیع اللہ کے یہ قول ۱۸۰۲ء میں ۱۹ فروری کو ناگری خوش نویس کی حیثیت سے للو لال کا تقرر عمل میں آیا جو اس سے قبل اگست ۱۸۰۱ء سے سندی منشی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے" (ص ۴۸)، نیز یہ کہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے الفاظ ہیں کہ "شعبۂ ہندوستانی میں تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے فرایض انجام دینے والوں کو منشی کہا جاتا تھا۔ شعبے میں ہندوستانی کے ساتھ ساتھ بھاکھا کی بھی تعلیم دی جاتی تھی چنانچہ بھاکھا کے مشہور منشی سدل مشر اور للوجی کے ساتھ ہندی پنڈتوں یا ہندی منشیوں کا تقرر عمل میں آیا" (ص ۶۰)۔ یہاں بطور وضاحت ایک تو یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ کالج کے دیگر السنہ سے موسوم شعبوں سے وابستہ مدرسین و مصنفین کو بھی منشی قرار دیا جاتا تھا، اور دوسرے یہ کہ اس مقام پر فاضل موصوفہ نے شعبۂ ہندوستانی کے جن اور منشیوں پنڈتوں کی تقرری کی نشان دہی کی ہے ان کی یہ فہرست للو لال جی کوی کے معاصرین کے باب میں پیش ہوگی۔

ملازمت سے علاحدگی اور دوبارہ تقرری

فورٹ ولیم کالج سے گل کرسٹ کی بوجوہ سبک دوشی کے بعد یہ ادارہ چند در چند حوادث کا شکار ہونے لگا اور للو لال جی کوی کی قسمت میں یہ نشیب و فراز بھی لکھا تھا، چنانچہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی تحقیق یہ ہے کہ "گل کرسٹ کی مراجعت فروری ۱۸۰۴ء کے بعد اوّل ماتحت اور قایم مقام پروفیسر کیپٹن ماونٹ نے ۹ مئی ۱۸۰۴ء کو کالج کونسل کے سکریٹری چارلس روتھ من کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط میں انھوں نے شعبۂ ہندوستانی میں بھاکھا منشی کی موجودگی غیر ضروری قرار دی کیپٹن ماونٹ کا یہ خط کالج کونسل کی ۱۱ جون ۱۸۰۴ء کی کارروائی میں پیش ہوا، چنانچہ للوجی کی

تنخواہ یکم جولائی ۱۸۰۴ء سے ملنی بند ہوگئی یعنی وہ شعبے سے الگ کر دیئے گئے" (ص۱۵۵)۔ متصل انکشاف کی رو سے بعد میں کیپٹن ماؤنٹ کو بھاکھا منشی کی ضرورت کا احساس ہوا چنانچہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۴ء کی کالج کونسل کی کارروائی سے علم ہوتا ہے کہ ان کو دوبارہ کالج میں شامل کر لیا گیا اور جولائی سے ہی ان کو برسرِکار تصور کر کے ان کا پچھلا مشاہرہ بھی ادا کر دیا گیا" (ص۱۵۵)۔ ڈاکٹر سمیع اللہ نے "عملے اور اخراجات میں تخفیف اور ہندوستانی شعبے کی تنظیم جدید" کے تحت عہد گل کرسٹ میں ۱۸۰۲/۶/۷ کی تاریخ میں بہ صفحہ ۹۴ عہدے کی نشان دہی کے ساتھ ایک اندراج "للولال بھاکھا منشی ۵۰ روپے ماہانہ تن خواہ" نیز عہد جیمس موویٹ "میں کالج میں تبدیلیوں کا دوسرا دور" کے تحت ۱۸۰۵/۹/۱۶ء کی تاریخ میں بہ صفحہ ۵۸ "سری لال کوی مشاہرہ پچاس روپے کام کی تفصیل ہندوستانی پریس وغیرہ" کے الفاظ کے ساتھ دوسرا اندراج کیا ہے۔ پروفیسر وارشنے "آدھونک ہندی ساہتیہ" کے ص۳۸ پر راوی ہیں کہ ستمبر ۱۸۰۵ء میں بھاشا منشی کی آوشیکتا نہ رہ جانے کے کارن للولال ہندوستانی انوواد ک نیکت ہوئے اور انہیں ہندوستانی پریس تتھا انیہ وودھ پرکار کے کاریہ ملے۔ کنتو کچھ سمے کے بعد وے پھر اپنے پرانے پد پر نیکت کر دتے گئے"۔

چند ماہ کے مذکورہ تعطّل کے زمانے سے قطع نظر للولال جی کوی کی ادبی پیش رفت کالج سے ان کی باقاعدہ و مستقل سبک دوشی تک گویا دو عشروں سے زاید عرصہ تسلسل و یک سوئی کے ساتھ جاری رہی۔ اس دوران انہوں نے نہ صرف چند کتابیں خود تصنیف نیز ترجمہ اور تالیف کیں بلکہ ہندی اور برج کی کتابوں کی اردو میں منتقلی میں کالج کے حکام گل کرسٹ وغیرہ کے کہنے پر رفقائے شعبہ کی مدد بھی کی۔ للولال جی کوی کے اپنے علمی آثار کی تفصیلیں متعلقہ باب میں اور چند کتابوں پر مفصّل جائزے علاحدہ ابواب میں پیش ہیں۔ معاصر مترجمین کی ادبی اعانت کی تفصیلات ہم عصروں کے ضروری کوائف کے طور پر الگ سے ترتیب دی گئی ہیں جن میں ہندی کے دیگر فاضل کی بھی کارکردگی کو یکجا کیا گیا ہے اس

۱۰۔: ڈاکٹر وارشنے ص۶۵۔

طرح للولال جی کوی کے دماغی کارناموں کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھنا مقصود ہے۔

للولال جی کوی کا آخری زمانہ:

۱۸۰۴ء کے بعد اگلے قریب بیس برس للولال جی کوی کالج سے منسلک رہے مگر اس عرصے کی ان کی زندگی کی دوسری مصروفیات کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ یہ بیس سال انہوں نے کلکتہ اور فورٹ ولیم کالج میں ہی گذارے۔ آچاریہ رام چندر شکل کی ادبی تاریخ کی سند پر ڈاکٹر عبیدہ بیگم و سمیع اللہ نے یہ مشترکہ اطلاع دی ہے کہ للولال جی کوی نے کلکتہ میں اپنا ایک ذاتی مطبع موسومہ "سنسکرت پریس" قایم کر لیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر سپسیر کمار داس کی تحقیق یہ ہے کہ مرزاپور یوپی کے بابو رام شرما اس "سنسکرت پریس" کے بانی و مالک تھے اور ناگری مطبوعات کی غرض سے انہوں نے اس کو قایم کیا تھا۔ صفحات ۸۴ و ۸۵ کی روایات کے بموجب للولال جی کوی اس مطبع سے منسلک تھے اور بعد میں وہ اس چھاپے خانے کے مالک بھی بن گئے تھے۔ ڈاکٹر داس کے بہ قول برجیندر ناتھ بنرجی (مصنف بنگلا "ساہتیہ سادھک چرت مالا" جلد ا کلکتہ) راوی ہیں کہ للولال جی کوی اس پریس کے مالک قریب ۱۸۱۴/۱۸۱۵ء میں ہوتے، جب کہ ثانی الذکر نے اپنے ماخذ کے اظہار کے بغیر یہ بھی اطلاع دی ہے کہ للولال جی کوی چھپائی کی یہ مشین اپنے ہم راہ آگرہ لے گئے تھے جہاں انہوں نے بقیہ زندگی کے دن گذارے۔ البتہ اس سلسلے میں ان ذرائع سے للولال جی کوی کی مصروفیتوں اور خدمات کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔ اغلب ہے کہ للولال جی کوی کی زندگی میں اور بعد ازاں بھی ان کے اس "سنسکرت پریس" کی کسی کتاب کا کوئی اردو قالب شائع نہیں ہوا ورنہ کلکتہ کے اردو مطابع میں سنسکرت پریس کا کچھ نہ کچھ احوال ملتا۔ تاہم اس "سنسکرت پریس" کی ناگری مطبوعات کی ایک فہرست دریافت ہو گئی ہے جو "کارہائے نمایاں" کے باب میں "لال چندریکا" کی تفصیلات کے آخر میں درج ہو گی۔

پروفیسر جاوید نہال کی روایت ہے کہ "للولال جی ۱۸۲۴ء تک کلکتہ میں تھے اور کالج سے وابستہ بھی۔ اس کے بعد ان کی حیات پر دۂ گم نامی میں ڈھکی ہے، غالباً کاشی میں انہوں نے انتقال کیا" (ص ۱۷۳)۔ ڈاکٹر سمیع اللہ ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کے قدرے مختلف بیان کے ناقل ہیں: "ڈاکٹر وارشنے کی تحقیق کے مطابق للولال مئی ۱۸۲۳ء تک

کالج سے وابستہ رہے۔[11] محقق موصوف کا خیال ہے کہ انہوں نے مئی ۱۸۲۴ء میں وفات پائی۔[12] (حاشیہ: رام چندر شکل کے مطابق للولال کا انتقال سمبت ۱۸۸۲ مطابق) ۱۸۲۵ء میں ہوا تھا[13]" (ص ۱۵۱) یہ سبھی بیانات مجمل اور تشنہ ہیں اور اس تشنگی کو ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے اخذ کردہ نتیجے سے دور کیا جا سکتا ہے جو خاصا واضح ہے۔

للولال جی کوی کے آخری برسوں کے تعلق سے ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی دریافتیں یہ ہیں: "للولال ۱۸۲۳ء تک قطعی طور پر کالج سے وابستہ تھے۔ کالج کی ۱۵ رمئی ۱۸۲۳ء کی کارروائی میں آخری بار ان کا ذکر ملتا ہے۔[14] لکشمی ساگر وارشنے کا خیال ہے کہ غالباً یکم مئی ۱۸۲۴ء سے قبل ہی ان کا انتقال ہوگیا۔[15] آچاریہ رام چندر شکل کا کہنا ہے کہ للوجی نے سمبت ۱۸۸۱ مطابق ۱۸۲۴ء میں نوکری سے پنشن لے لی تھی اور آگرہ چلے آئے تھے۔ انہوں نے اپنا پریس بھی کلکتہ سے لاکر آگرہ میں قائم کرلیا تھا۔ پریس کا انتظام مکمل کرکے وہ ایک بار پھر کلکتہ گئے جہاں ان کا سمبت ۱۸۸۲ مطابق ۱۸۲۵ء میں انتقال ہوگیا۔[16] مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ ۱۸۲۴ء سے ۱۸۲۵ کے درمیان للوجی نے وفات پائی۔" (ص ۱۵۵/۱۵۶)

اس طرح للولال جی کوی نے اندازاً ۶۵ برس کی عمر پائی اور بالآخر کلکتہ ہی میں جہاں اس کی روشنی طبع نے اتنا نور پھیلایا مٹی کا یہ دیا بجھ گیا۔

کالج کی جانب سے انعامات؟

عہدوں اور مناصب کی دوڑ میں للولال جی کوی اپنے ان معاصرین سے پیچھے رہ گئے جو خواہ پایہ علمی میں برتر رہے ہوں مگر جن کی قلمی کارکردگی للولال

۱۱۔: ڈاکٹر وارشنے ص ۹۷۔

۱۲۔: ایضاً۔

۱۳۔: آچاریہ شکل ص ۲۸۸

۱۴ بحوالہ متفرقاتِ داخلہ منقولہ ڈاکٹر وارشنے ص ۹۷۔ ۱۵ ڈاکٹر وارشنے ص ۹۷

۱۶ آچاریہ شکل ص ۲۸۶-۲۸۵۔ (ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے انھیں منابع سے اکتساب کیا ہے لیکن معلومات مفصل اخذ کرکے مرتب کی ہیں جس سے ایک مفید و مثبت نتیجہ سامنے آسکا ہے جو بہ خوبی عیاں ہے)

جی کوی کی ادبی خدمات کے مقابلے میں عشرِ عشیر بھی نہیں تھیں۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ انہیں مکروہات دنیا سے نہ تو کوئی رغبت رہی ہو اور نہ ہی ان پر اپنا بیش قرار وقت ضایع کرنے کی کوئی توفیق انہیں ہوئی ہو۔ اتنے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دینے والے اعلا رتبے کے اسکالر کو بے تکان اور متصل قلمی خدمت گذاریوں کے علاوہ ظاہری اور مادی فوائد کے حصول سے غرض ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اور اسی لیے آج یہ احساس ہوتا ہے کہ للولال جی کوی کو ایک ایک کارنامے پر جن انعامات کی سفارش کا مستحق سمجھا گیا۔ ان کے محرکین کو ازخود اس کی توفیق ہوئی ہوگی۔ اس سلسلے میں بھی ناقدری زمانہ کا وہ عالم تھا کہ قابلِ انعام کتابوں اور مصنفوں کی فہرستیں مختلف وجوہ سے مسترد کردی جاتی تھیں اور وقتاً فوقتاً اس قدر حوصلہ افزائی کا اہتمام بھی اربابِ بست و کشا کو گوارا نہیں ہوتا تھا۔

نیشنل آرکایوز دہلی کے خطی مسودات کے ذخیرے میں مخزونہ فورٹ ولیم کالج کی انگریزی روداد وں موسومہ "پروسیڈنگس" کی جلد نمبر ۵۵۹ ص ۲۷۷ سے اخذ کر کے ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اپنی عرق ریزی کے نمونے کے طور پر خود گل کرسٹ کا ایک نادر تاثر پیش کیا ہے: "پریم ساگر ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں شایع ہوتی رہی۔ یہ ۱۸۰۳ء میں زیرِ طبع تھی، اس میں ۲۵۰ صفحات تھے۔ گل کرسٹ نے ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لیے سفارشی فہرست میں "پریم ساگر" پر دو سو روپے انعام کی تجویز پیش کی تھی اور رائے کے کالم میں لکھا تھا:

"FOR THE HINDUWEE A MOST USEFUL BOOK AND RATED SO LOW MERELY BECAUSE HE HAS 50 RS. A MONTH AND IS DOING NOTHING ELSE."—477

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ محصلہ اطلاعات کی رو سے ۱۸۰۳ء کا زیرِ طبع "پریم ساگر" دراصل ایک نامکمل اور "سری بھاگوت" نامی ابتدائی ایڈیشن تھا، متعلقہ معلومات "پریم ساگر" کے باب میں آئیں گی۔ یہ امر قطعیت سے معلوم ہو چکا ہے کہ گل کرسٹ کی اس محتاط سفارش کے باوجود "پریم ساگر" کے اس مختصر و ابتدائی ایڈیشن پر تجویز کردہ انعام منظور نہیں ہوا۔ نیز دوسری ایک کتاب کے بارے میں بھی اطلاع یہی ہے کہ وہ اس فہرست میں درج تھی جو پوری کی پوری مسترد کردی گئی۔

للولال جی کوی کی وہ دوسری کاوش تھی "راج نیتی" جس کے بارے میں کالج کی "پروسیڈنگس" کی ہی سند پر ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے انعامی کارروائی کا خلاصہ یہ تحریر کیا ہے: "گل کرسٹ کی ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لیے سفارشی فہرست میں "راج نیتی" مطبوعہ کتابوں کی ذیل میں شامل تھی۔ گل کرسٹ نے اس پر تین سو روپے انعام کی سفارش کی تھی لیکن اس فہرست کو کالج کونسل نے نامنظور کر دیا تھا" (ص ۴۷) اغلب یہی ہے کہ ایک تاریخ میں دو فہرستیں نہیں پیش ہوئی تھیں اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے چوں کہ "پریم ساگر" کو "راج نیتی" کے بعد شریک تذکرہ رکھا اس لیے "پریم ساگر" کے انعامی فہرست میں شامل کیے جانے کا ذکر تو کیا لیکن اس کے ساتھ اس فہرست کے استرداد کی اطلاع کا اعادہ ضروری نہیں سمجھا۔

ڈاکٹر سمیع اللہ نے بعنوان "ضمیمہ الف" صفحات ۱۸۲ تا ۱۸۵ پر گل کرسٹ کی انعام کے لیے ارسال کی ہوئی تصانیف' ان کے مصنفوں کے نام اور سفارشات' کی باقاعدہ فہرست سازی کی ہے جس میں کچھ کم پچاس اندراجات ہیں۔ مزید برآں "ہندوستانی مصنفین کو انعامات" کی سرخی کے تحت بہ صفحات ۵۰ تا ۵۲ متعلقہ کارروائیوں کا خلاصہ بھی بیان کیا ہے جس میں ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی اولین اور مسترد فہرست کے علاوہ ۱۲ ستمبر ۱۸۰۳ء کی دوسری فہرست بھی شامل ہے۔ اس دوسری قابلِ انعام فہرست کے مندرجات غالباً دس سے زیادہ نہیں تھے جن میں سے ڈاکٹر سمیع اللہ نے پانچ کتب نیز ان کے مصنفوں اور انعامات کی نشان دہی کی ہے ان کے علاوہ چار اور کتابوں کو مسترد بتایا ہے۔ ایک اور عنوان سے مختصراً یہ بھی معلوم ہوا کہ قبل ازاں یعنی ۱۸۰۲ء میں "باغ و بہار" پر پانچ سو روپے انعام کے لیے گل کرسٹ نے میر امن کی بھی سفارش کی تھی جو منظور ہوئی مگر نہ تو پہلے اور نہ ہی بعد میں کبھی للولال جی کوی کو ان کے کسی کارنامے پر انعامی رقم کا حق دار قرار دیا گیا۔ غرض یہ ایک عجیب اتفاق ہوا اور اسی لیے للولال جی کوی کو کالج کی جانب سے انعام و اکرام کا معاملہ ان کی ادبی سوانح میں اور اس کے پہلو بہ پہلو خود فورٹ ولیم کالج کی اپنی تاریخ میں ایک سوالیہ نشان کی حیثیت اختیار کر گیا ہے! بہ قول ڈاکٹر سمیع اللہ "جوان کو شکنتلا اور قرآن کے ترجمے پر سو سو روپے اور سنگھاسن بتیسی اور بارہ ماسا کی تصنیف پر دو دو سو روپے کا انعام ملا تھا" (ص ۱۲۷) دراں حالیکہ برج کتب

کی منتقلی کے کام میں مرزا کاظم علی کی حیثیت للولال جی کوی کے املا نویس سے زیادہ نہ تھی۔

یہ امر بھی قابلِ غور محسوس ہوتا ہے کہ آخر گل کرسٹ نے منقولا بالا کلمات میں للولال جی کوی کے حق میں دو کتب پر انعام کی سفارش کے وقت 'پریم ساگر" پر رائے دیتے ہوئے للولال جی کوی کے لیے ایسا تاثر کیوں دیا جس سے حکام بالا کو یہ شبہ ہو کہ ان کی ذمہ داریوں میں کوئی اور کام شامل نہ تھا۔ تمام تر معلومات کی رو سے یہ پہلو توجہ طلب ہے کہ للولال جی کوی دیگر سب منشی حضرات کی طرح تعلیم و تدریس کے فرائض کی بجاآوری کے بھی مکلف تھے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف اور تراجم کے بھی ذمہ دار تھے نیز"ہندوستانی پریس' کے امور بھی للولال جی کوی سے ہی متعلق رہے۔

علمی ادبی کارناموں کی فہرست:

للولال جی کوی کی غیر معمولی اور سالہا سال کی علمی و ادبی ریاضت کے شایانِ شان ثمرات کے طور پر جو کتابیں معرضِ تحریر میں آئیں ان میں تراجم و تالیفات کے علاوہ منظوم و منثور مستقل تصانیف بھی شامل ہیں۔ ان کارہائے نمایاں میں سے تین کتب اردو میں ہیں' ہندی اور برج میں بھی تین تین کتابیں ہیں جب کہ ایک کتاب پوربی میں ہے۔ ان دس کتابوں کے علاوہ "بیتال پچیسی" کا بھی کم از کم ہندی ترجمہ للولال جی کوی کی ہی یادگار ہے کیوں کہ اس کا ناگری ایڈیشن کسی طرح بھی ایک غیر ہندی داں یعنی مظہر علی خاں ولا کے عمل دخل کا ہرگز ہرگز محتاج نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم تاریخی ترتیب سے فہرست ہٰذا اور آئندہ باب میں اس کے مطابق مفصل جائزوں میں "بیتال پچیسی" کو شریک نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ اس بحث کی تفصیل للولال جی کوی کے تمام تر کارناموں کی تذکرہ نگاری کے بعد علاحدہ عنوان سے پیش ہوگی۔

شعبوں کے لحاظ سے للولال جی کوی کی کتابوں کو چند اصناف میں ضرور تقسیم کیا جا سکتا ہے جیسے مذہبی ادب' تاریخ و سوانح اور حکایات وغیرہ لیکن غالب امکان یہی ہے کہ ان سب کتابوں کی بنیادی صنف اور نوعیت

نثری یا منظوم داستان یا حکایت کی بنتی ہے باستثناء" برج بھاشا کی قواعد" نیز ایک شعری انتخاب موسومہ "سبھا بلاس" اور "بہاری ست سئی" کی شرح بہ عنوان "لال چندریکا"۔ تاہم یہاں لسانی اساس یا صنفی تقسیم اختیار کرنے کے بجائے ان کتابوں کی تفصیلات صرف تاریخی ترتیب کو ترجیح دے کر جمع کی جارہی ہیں۔ ان کتب میں سے "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" نیز "لال چندریکا" اور "پریم ساگر" کے ممکنہ وضروری حد تک بالتفصیل جائزے علیحدہ ابواب میں پیش ہوں گے۔ بلوم ہارٹ کے ترتیب دادہ تذکرہ ہندی مطبوعات انڈیا آفس سے ان سبھی کتابوں کے مختلف و متعدد ایڈیشنوں کے سنین اشاعت بمع صفحات وغیرہ برٹش لائبریری لندن کے کیوریٹر جناب سلیم الدین قریشی کی علی الخصوص توجہ فرمائی کے فیض سے حاصل ہو سکے ہیں اور ممدوح کی کرم گستری کے تئیں اظہار امتنان کے ساتھ درج ہیں۔ للولال جی کوی کی ان مطبوعات کی اشاعتوں سے متعلقہ دیگر اطلاعیں بھی ساتھ ہی جمع کردی گئی ہیں۔

(۱) **برج نثری ترجمۂ "راج نیتی"** ۱۸۰۲ء سنین طبع: کلکتہ ۱۸۰۳ء نیز کلکتہ ۱۸۰۹ء (صفحات ۲۵۴)؛ ۱۸۲۷ (ص ۱۴۲)، ۱۸۴۳ (ص ۱۱۷)؛ جے نگر ۱۸۵۱ (ص ۱۹۲)؛ الہ آباد ۱۸۵۴ (ص ۱۶۷+۲۸ مع مقدمہ و تحشیہ اور فرہنگ مرتبہ فٹز ایڈورڈ ہال)؛ بنارس ۱۸۵۴ (ص ۱۱۵)؛ لکھنؤ ۱۸۷۳ (ص ۱۶۸+۱۳ مبنی بر ایڈیشن فٹز ہال)؛ بمبئی ۱۸۷۶ (ص ۲۲۸)؛ کلکتہ ۱۸۷۸ (ص ۱۱۶)؛ کلکتہ ۱۸۸۶ (ص ایضاً طبع سوم) نیز: انگریزی ترجمہ سی ڈبلیو باؤلر بیل کلکتہ ۱۸۶۹ (ص ۱۳۶)۔

"پریم ساگر" کے جدید ایڈیشنوں میں بنارس سے ۱۹۵۴ء اور قبل و بعد کے کاشی ناگری پرچارنی سبھا کی گرنتھ مالا ۲۷ کے بطور دو نیز چوکھمبا وشوا بھارتی کی ایک حالیہ اشاعت کا علم ہوتا ہے۔ بلوم ہارٹ کے اندراجات:

(۲) **ہندی نثری ترجمۂ "پریم ساگر"** ۱۸۵۳۔ سنین طبع: کلکتہ ۱۸۵۳ (مختصر موسومہ "سری بھاگوت" صفحات ۲۵۵)؛ کلکتہ ۱۸۵۵ (مختصرہ باب)؛ نیز کلکتہ ۱۸۱۵ (ص ۴۲۵ مکمل طبع اول)؛ کلکتہ ۱۸۲۵ (ص ۲۲۸ + ۱۵۹ فرہنگ اہم لغات)؛ ۱۸۳۱ (بحوالہ ایسٹ وک)؛ کلکتہ ۱۸۴۲ (ص ۲۲۸) (مرتبہ پنڈت یوگ ادھیان مسرا)؛ میرٹھ ۱۸۴۵ء (ص ۲۱۹)؛ ہرٹفورڈ ۱۸۵۱ء (ص ۲۲۵ + ۱۹۵ مع لغت مرتبہ ایڈورڈ بی ایسٹ وِک)؛ لکھنؤ ۱۸۶۶ (۲۱۸)؛ بمبئی ۱۸۶۸

(ص۲۱۶)، پٹنہ ۱۸۶۸ (ص۱۲۲)، کلکتہ ۱۸۶۹ (ص۳۳۲)، لکھنؤ ۱۸۶۹ (ص۲۱۵)، آگرہ ۱۸۷۵ (ص۵۲۳)، کلکتہ ۱۸۷۵ (ص۳۳۲)، بمبئی ۱۸۷۱ (ص۳۵۵)، میرٹھ ۱۸۷۱ (ص۳۴۵)، کلکتہ ۱۸۷۳ (ص۳۲۰)، دہلی ۱۸۷۳ (ص۳۴۰)، کلکتہ ۱۸۷۴ (ص۳۳۸)، کلکتہ ۱۸۷۴ (ص۳۲۰) مکرر، آگرہ ۱۸۷۵ (ص۳۴۵)، کلکتہ ۱۸۷۵ (ص۳۹۱)، کلکتہ ۱۸۷۵ (ص۱۵۸+۹۴+۱۲) رومن حروف میں مع لغات اور انتخاب ابواب مرتبہ جے ایف بینس، میرٹھ ۱۸۷۵ (ص۳۳۹)، بمبئی ۱۸۷۶ (ص۳۹۱)، کلکتہ ۱۸۷۶ (ص۳۲۸)، دہلی ۱۸۷۶ (ص۳۴۰)، کلکتہ ۱۸۷۸ (ص۶۷۶)، بمبئی ۱۸۷۹ (ص۳۹۸)، بمبئی ۱۸۷۹ (ص۲۵۷)، میرٹھ ۱۸۸۹ (ص۳۴۰)

نیز انگریزی مترجمہ کپتان ڈبلیو ہولنگس کلکتہ ۱۸۴۸ ص۲۴۰ طبع دوم نامعلوم طبع سوم لکھنؤ ۱۸۸۷ ص۳۳۵، مترجمہ ترجمہ ایسٹ وِک مرتبہ فریڈرک پنکاٹ مطبوعہ آرکیپالڈ کانسٹیبل لندن ۱۸۹۷ بحوالہ نقول موصولہ از جامعہ بمبئی جو "Fully annotated and explained exegetically and grammatically" ایڈورڈ بی ایسٹ وِک ہرٹفورڈ ۱۸۵۱ ص۲۷۱، انتخاب بہ مع ترجمہ جے ایف بینس کلکتہ ۱۸۷۷ ص۲۳۱، طبع دوم کلکتہ ۱۸۷۹ ص ایضاً، فرانسیسی ترجمہ ای لامارس پیرس ۱۸۹۳ صفحات ۳۴۶+۴۹ خطبات دی تاسی ج ۱ ص۲۵۹ کے بموجب ۱۸۵۹ میں پریم ساگر کی رومن حروف میں طباعت کے لیے اس کے مصحح و مرتب اور مترجم ایسٹ وک کا ایک منصوبہ تھا مگر اس رومن ایڈیشن کی تکمیل واشاعت کا علم نہ ہو سکا۔

اردو نثری ترجمہ "سنگھاسن بتیسی" ۱۸۰۵، سنین طباعت کلکتہ ۱۸۰۵، ۱۸۱۰۔ للولال جی کوی کی مترجمہ اس اردو "سنگھاسن بتیسی" کے جو ایڈیشن پروفیسر سید محمد، پروفیسر وقار عظیم اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے زیر ملاحظہ رہے ان کے سنین اشاعت مذکور نہیں ہیں نیز ابتدائی ہندی ایڈیشنوں کے بھی سالہائے طبع معلوم نہیں کیے جا سکے ہیں جس کا افسوس ہے۔ برٹش میوزیم سے موصولہ عکسی صفحات میں ہندی ایڈیشن ۱۸۴۲ سے شروع ہوتے ہیں جن کی فہرست درج ہے:

آگرہ ۱۸۴۲ (ص۱۸۳)، کلکتہ ۱۸۴۷ (ص۱۹۰)، اندور ۱۸۴۹ (ص۲۲۶)، بنارس ۱۸۵۰ (ص۲۰۸)، اندور ۱۸۵۵ (ص۱۳۲)، لاہور ۱۸۶۷ (گورمکھی رسم خط ص۱۴۳)، دہلی ۱۸۶۸ (ص۱۶۸)، دہلی ۱۸۶۹ (ص ایضاً)، لندن ۱۸۶۹ (ص۲۱۶+۱۶ طبع نو ترتیب و حواشی سید عبداللہ)، لکھنؤ ۱۸۷۰ (ص۱۰۵)، کلکتہ ۱۸۷۲ (ص۱۲۶)، دہلی ۱۸۷۲ (گورمکھی خط ص۱۴۴)، آگرہ ۱۸۷۳ (۱۵۹)، دہلی ۱۸۷۳ (ص۱۶۸)، لکھنؤ ۱۸۷۳ (ص۲۰۵)، میرٹھ

۱۸۷۴ (ص۱۴۸)، دہلی ۱۸۷۵ (ص۱۴۹)، میرٹھ ۱۸۰۵ (ص۱۵۹)، لاہور ۱۸۰۶ (گورمکھی خط ص۱۴۲) دہلی ۱۸۰۰ء
لاہور ۱۸۷۷ (گورمکھی خط ص۱۴۴)، دہلی ۱۸۷۸ (طبع اردو ص۸۰)، لاہور ۱۸۷۸ (گورمکھی خط
ص۱۴۴)۔ دی تاسی کے دسویں خطبے مورخہ ۷/۸/۱۸۷۱ (ج ا ص۲۴۳) کے مطابق للولال جی
کوی کی ہندی "بیتال پچیسی" کے فاضل مرتب "مسٹر فٹز ای ہال نے حال ہی میں "سنگھاسن
بتیسی" کا ایک ایڈیشن شائع کیا ہے"۔

(۴) اردو نثری تصنیف "لطائف ہندی" ۱۸۱۰۔ سنین طبع: کلکتہ ۱۸۱۰، ۱۸۴۷۔ ۳، ۵،

(۵) اردو نثری تصنیف "برج بھاشا کے قواعد" سال تحریر نامعلوم مطبوعہ کلکتہ ۱۸۱۱ء ص۵۳

(۶) برج نثری تصنیف "اودھ بلاس" قبل ۱۸۱۳ ۔ طباعت نامعلوم / عدم دستیاب۔ بعض
ذرائع میں "ودیا درپن" نامی ترجمے سے موسوم۔

(۷) ہندی شعری تالیف "سبھا بلاس" ۱۸۱۵ ۔ سنین طبع: بحوالہ سید محمد کلکتہ ۱۸۱۵ نیز کلکتہ
۱۸۲۸ و ۱۸۲۹ مرتبہ ولیم پرائس۔ فہرس مطبوعات مخزونہ انڈیا آفس کے اندراجات :
کدر پور ۱۸۱۵ء (صفحات ۳۸)، کلکتہ ۱۸۲۸ مرتبہ ولیم پرائس (ص۸۴)، اندور ۱۸۵۰ (ص۳۰)،
اندور ۱۸۶۰ (ص۹۰)، بنارس ۱۸۶۷ (ص۴۲)، لکھنؤ ۱۸۶۷ (ص۶۴)، آگرا ۱۸۶۸ (ص۴۸)، آگرا ۱۸۶۹
(ص۴۸)، بمبئی ۱۸۶۹ (ص۱۰۲)، لکھنؤ ۱۸۶۹ (ص۴۸)، آگرا ۱۸۷۰ (ص۴۸)، بمبئی ۱۸۷۰ (ص۸۰)، ناگ پور
۱۸۷۲ (خلاصہ ص۹)، الہ آباد ۱۸۷۳ (ص۴۸)، کان پور ۱۸۷۳ (ص۴۸)، دہلی ۱۸۷۴ (ص۴۸)، دہلی ۱۸۵
(ص۴۸)، لکھنؤ ۱۸۷۵ (ص۴۸)، دہلی ۱۸۷۶ (ص۴۸)، دہلی ۱۸۷۷ (ص۴۸)، لکھنؤ ۱۸۷۷ (ص۴۳)۔

(۸) برج منظوم تصنیف "مادھو بلاس" / "مہادیو بلاس"، ۱۸۱۷ ۔ مطبوعہ آگرا ۱۸۴۶ (صفحات ۱۴۸)
نیز سنسکرت پریس سے قبل ۱۸۱۹ شائع شدہ۔

(۹) ہندی نثری تصنیف "لال چندریکا" ۱۸۱۸ ۔ شرح بہاری ست سئی)۔ بلوم ہارٹ
کی فہرس۔ ہندی کتب سے صرف ایک ایڈیشن کا علم ہو سکا ہے جو گریرسن کا مرتبہ ہے اور
کلکتہ سے ۱۸۹۶ کا مطبوعہ۔ یہ بہاری ست سئی کا ایسا ایڈیشن ہے جس میں للولال جی کوی
کی شرح موسومہ "لال چندریکا" شریک ہے۔ گریرسن نے اس کو تعارف اور حواشی کے ساتھ
ایڈٹ کیا ہے، صفحات کی تعداد یوں ہے: ۷ + ۱۳۵ + ۵ + ۲۹۳ + ۲۱ + ۲۶ + ۳ مجموعی تعداد
قریب ۵۰۰ ۔ گریرسن نے پیش لفظ میں للولال جی کوی کی "لال چندریکا" کے ۱۸۱۹ کے
ایڈیشن کا حوالہ دیا ہے۔ اس گریرسن ایڈیشن کا عنوان سرورق کے دیگر مندرجات کے ساتھ

یوں ہے: "ست سئی بہاری مع شرح موسومہ لال چندریکا از شری للّو لال کوی بھاشا منشی فورٹ ولیم کالج مرتبہ مع تعارف و توضیحات جی اے گریرسن سی ای ای پی ایچ ڈی آئی سی ایس۔ کلکتہ دفتر ناظم سرکاری مطبوعات ہند ۱۸۹۶ قیمت پانچ روپے۔" فہرس مشمولات کی رو سے ۱۲ صفحوں کے پُر مغز تعارفی مباحث کے بعد جسونت سنگھ کی "بھاشا بھوشن" پر قریب ایک صد صفحات کا مقدمہ ہے۔ ازاں بعد للّو لال جی کوی کی بہاری ست سئی کی شرح "لال چندریکا" کا متن نئے صفحہ نمبر سے شروع ہوتا ہے جو ۲۹۳ صفحات کو محیط ہے اس کو گریرسن نے جس تہذیب و ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے اس کے صرف تصور سے ہی طبیعت عش عش کر اٹھتی ہے کیوں کہ "لال چندریکا" کے صفحہ پہ صفحہ عنوانیہ میں سے محض جزو اول "نایکا نایکہ ورنن" کے ابتدائی ۱۸۴ دوہوں کی سرخیوں کی بھی فہرس کے دو صفحے زیرِ استفاضہ ہیں۔ گریرسن کے موقر و موثر ملاحظات میں سے متعلقہ مفید مطلب آرا کو مناسب مواقع پر اقتباس کیا جا رہا ہے۔

(۱۰) شرح منظوم تخلیق "چھتر پرکاش" / "چھتر سال" سن تصنیف نا معلوم۔ سنین طبع: کلکتہ ۱۸۲۱، کلکتہ ۱۸۲۹ (مرتبہ ولیم پرایس ص ۲۶۹) بنارس ۱۹۰۳ (ص ۱۴۹) ابواب ۲۶، مقدمہ شیام سندر داس)

ان کتب کے سنین اشاعت اور ایڈیشنوں کی یہ تفصیلیں جو بہرحال فی الوقت نامکمل ہیں اور غالباً خاصی اضافہ طلب بھی، للّو لال جی کوی کے وسیع الذیل اور ہمہ جہت تخلیقاتی عمل کو ملنے والی ہندوستان گیر پذیرائی اور قبولیت عامہ کی دلیل ہیں۔ بڑے پیمانے پر ان کتابوں کی طباعت نے للّو لال جی کوی کی عظمت کے لافانی نقوش ادبی تاریخ میں ثبت کر دیے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کی اردو کی شخصیت میر امن کے علاوہ تمام ترغیر اردو وادبا میں للّو لال جی کوی اعلیٰ مقام و مرتبہ پر فائز اور دوسرے سب ہم زبان اربابِ قلم سے ممتاز و منفرد نظر آ رہے ہیں۔

ہندی نثری ترجمہ "بیتال پچیسی":- اردو کی داستانی تحقیقات اور ادبی تواریخ میں "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" کے تراجم علی الترتیب کاظم علی جوان اور مظہر علی خاں ولا سے بہ طور مترجم منسوب اور مشہور ہیں۔ اس خصوص میں راقم کا حقیر خیال اور جائزہ مختلف ہے جس کی تفصیلات خاکسار اردو "سنگھاسن بتیسی"

پر علاحدہ باب کے علاوہ للّولال جی کوی کی مطبوعات پر ایک اور باب متعلقہ "بیتال پچیسی" میں پیش کر رہا ہے۔ چوں کہ ثانی الذکر کے کم از کم دیوناگری رسم خط کے ہندی ایڈیشنوں کی للّولال جی کوی سے نسبت کا معاملہ ہر طرح کے اشتباہ سے بالاتر ہے اور مسلم الثبوت طور پر وہ للّولال جی کوی سے ہی موسوم ہیں اس کے ان دیوناگری ایڈیشنوں کے اندراجات منقول ذیل ہیں۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے "بیتال پچیسی" کے اوّلین ہندی متن مشمولہ مجموعۂ انتخابات مرتبہ ولیم پرایس وغیرہ کلکتہ ۱۸۲۷ کو اردو میں لکھوا کر مگر للّولال جی کوی کے بجائے مرزا مظہر علی خاں ولا سے منسوب کر کے شائع کروایا ہے۔ ۱۸۲۷ تا ۱۸۴۳ کے ناگری ایڈیشنوں سے لاعلمی ہے۔ برٹش میوزیم سے موصولہ فہرست میں "بیتال پچیسی" کے للّولال جی کوی کے ترجمۂ ہندی کے ایڈیشنوں کا شمار ۱۸۴۳ سے شروع ہوتا ہے۔ سنین طباعت اور تعداد صفحات کی تفصیل یہ ہے:

آگرا ۱۸۴۳ (ص ۱۳۱)، اندور ۱۸۴۸ (ص ۲۳۶)، اندور ۱۸۵۱ (ص ۹۸)، کلکتہ ۱۸۵۲ (ص ۱۴۱ + ۴ مرتبہ ایشور چند ودیاساگر)، ہرٹفورڈ ۱۸۵۵ (ص ۳۶۹ + ۱۰ مع (ص ۳۶۹ + ۱۰ مع بین السطری انگریزی ترجمہ وحواشی از ڈبلیو بی بارکر مرتبہ ایسٹ وک) میرٹھ ۱۸۵۵ (ص ۱۲۶) لندن ۱۸۵۷ (ص ۱۴۰ + ۵۲ + ۸ بہ مع فرہنگ مرتبہ ڈنکن فاربس)، لکھنؤ ۱۸۶۵ (ص ۱۰۱)، کلکتہ ۱۸۶۷ (ص ۱۵۸)، ایضاً (ص ۱۲۰)، لاہور ۱۸۶۷ گورمکھی خط ص ۱۲۷)، کان پور ۱۸۶۸ (ص ۲۹)، کلکتہ ۱۸۷۰ (ص ۱۰۲)، بمبئی ۱۸۷۰ (ص ۱۹۶)، فتح گڑھ ۱۸۷۰ (ص ۲۵)، لاہور ۱۸۷۰؟ (گورمکھی خط ص ۱۲۷)، دہلی ۱۸۷۳ (ص ۱۰۴)، لاہور ۱۸۷۳ (گورمکھی خط ص ۱۱۲)، کلکتہ ۱۸۷۴ (ص ۹۹)، دہلی ۱۸۷۵ (ص ۱۰۴)، کلکتہ ۱۸۷۶ (ص ۱۱۲ رومن حروف میں مع انگریزی ترجمہ وتحشیہ از جے ایف بینس)، دہلی ۱۸۷۶ (ص ۱۰۴) لاہور ۱۸۷۶ (گورمکھی خط ص ۱۱۲)، میرٹھ ۱۸۷۶ (ص ۱۴۴)، دہلی ۱۸۷۷ (ص ۱۰۴)، لکھنؤ ۱۸۷۷ (ص ۱۰۴)، کلکتہ ۱۸۷۸ (ص ۹۹)، ایضاً (ص ۱۰۴)، دہلی ۱۸۷۸ (ص ۱۰۴)، لاہور ۱۸۷۸ (گورمکھی خط ص ۱۱۲)، دہلی ۱۸۷۹ (ص ۹۴)، نیز تراجم انگریزی کلکتہ ۱۸۴۸ کپتان ہولنگس صفحات ۱۲۸ + ۱۰، الہ آباد ۱۸۹۴ مترجم ایضاً ص ۱۰۵ + ۴، لندن ۱۸۷۱ مترجمہ جان پلیٹس ص ۱۸۱ + ۸، ترجمہ جرمن لیپزگ ۱۸۷۳ بہ عنوان از:۔

IN DEUTCHER DEARBEITLING, MIT EINLEITUNG, AMMERKUNGEN AND NACHWEISEN VON HERMANN OESTERLEY

ڈاکٹر گیان چند جین صفحہ ۴۹۳ پر ذکر کرتے ہیں کہ اوسٹرلے کا آخرالذکر جرمن ترجمہ "بارکر کے انگریزی نسخے سے" ماخوذ ہے۔ محولہ بالا ۱۸۵۲ کے کلکتہ ایڈیشن کے مرتب ودیا ساگر کے بارے میں پروفیسر جین کی تحقیق یہ ہے کہ وہ قبل ازاں للولال جی کوی کے "بیتال پچیسی" کے ہندی متن کو خود بنگالی یا انگریزی میں منتقل کر چکے تھے۔ ممدوح کے اصل الفاظ یہ ہیں: "۳۴۔ "بیتال پنچ دم ستی" یا" Tales of a Demon ازایشور چند ودیا ساگر للولال سے ترجمہ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۶ء اس کے لیے بھی واضح نہیں کہ یہ بنگالی ترجمہ ہے کہ انگریزی" (ص ۴۹۴) علاوہ ازیں للولال جی کوی کے ہندی ترجمہ "بیتال پچیسی" سے ماخوذ ایک پیش رو انگریزی ترجمے کی اطلاع بھی ڈاکٹر گیان چند سے منقول ہے: "۳۳۔ ازراجہ کالی کرشن بہادر ۱۸۳۴ء کلکتہ للولال سے" (ص ایضاً) ایشور چندر ودیا ساگر (۱۸۲۰ تا ۱۸۹۱) کا مذکورہ بالا ترجمہ انگریزی میں نہیں بلکہ بنگالی کا ہی رہا ہے جس کی ادبی اہمیت کا بھی ڈاکٹر سکمار سین جیسے مورخ نے واضح اشارہ کیا ہے: "بیتال پنچ دستی سنسکرت اور خاص کر ہندی کی مدد سے لکھی گئی جو ۱۸۴۷ء میں چھپی۔ ودیا ساگر کی اسی تصنیف کی اشاعت بنگلہ نثر کی تاریخ میں ایک اہم قدم ہے" (ص ۳۴ ترجمہ بھٹا چاریا)۔

دی تاسی نے ڈنکن فاربس ایڈیشن کی یہ کہہ کر توصیف کی ہے کہ "ہندوستانی قدیم کتب میں جو حال میں مکرر چھپی ہیں "بیتال پچیسی" قابلِ ذکر ہے۔ اسی کتاب میں مسٹر ڈنکن فاربس نے بڑی محنت سے لغات کے معنی بھی درج کر دیے ہیں۔ نیز اسی کے ساتھ بی بارکر آنجہانی کا بین السطور ترجمہ بھی ہے جس کی مدد سے طالب علم کو اس قدیم کتاب کے سمجھنے میں زیادہ زحمت نہ ہوگی" (دسواں خطبہ مورخہ ۲/۱۸۶۱ ح اص ۲۷) ۔ص ۳۲۱ پر ایک عمدہ مصور ایڈیشن کا ذکر ہے: "موصول شدہ کتابوں میں ایک "بیتال پچیسی" ہے۔ اسے "بکرم ولاس" یعنی بکرماجیت کی کہانیاں بھی کہتے ہیں۔ یہ لاہور میں طبع ہوئی ہے اور اس میں نہایت خوب صورت تصادیر ہیں" (۱۲واں خطبہ مورخہ ۱۲/۱۲/۱۸۶۲)۔ واضح رہے کہ منقولہ بالا فہرست میں سارے لاہوری ایڈیشن ۱۸۶۲ کے بعد کے ہیں اور سبھی گورمکھی میں طبع شدہ ہیں۔

للولال جی کوی کا نام اور کام

عجیب سی بات ہے کہ للولال جی کوی کے نام کے متعدد روپ مختلف مواقع پر مستعمل

ہوتے ہیں جو زیر اکتساب اقتباسات میں منقول ہوتے آرہے ہیں:

للوجی، لالوجی، للّولال، للولال جی، للّوجی لال، للّوکوی، للّولال کوی، للولال جی کوی، سری للوجی، سری لال کوی۔ ان ناموں میں کوی کی جگہ کب کا استعمال بھی بکثرت ہوا ہے جب کہ سری کے ساتھ شری کا تبادل بھی کئی مقامات پر رہا ہے۔ للولال جی کوی کے نام کے ان اختلافی روپوں اوران کے مختلف فیہ استعمالات کا شروع سے ہی چلن رہا ہے اور فورٹ ولیم کالج کی فاضل مورخ عبیدہ بیگم صاحبہ کا ان ہی اسباب سے یہ ارشاد ہے کہ: تحقیق کے دوران جو اہم نکتہ میرے علم میں آیا وہ یہ تھا کہ عام طور پر جو للولال جی کوی لکھا جاتا ہے وہ غلط ہے۔ ان کا نام للوجی تھا اور تخلص لال کوی تھا۔ کل ملاکر انہیں للولال جی کوی لکھا جاتا تھا"(والا نامہ مورخہ غازی پور ۲۲/۱۱/۹۱ء) ممدوحہ کا یہ فرمودہ بالکل بجا ہے اور خود انہوں نے اپنی تصنیف گرامی میں للولال جی کوی کے نام کا بالکل درست روپ اختیار فرمایا ہے یعنی للوجی لال کوی، تاہم اس تصویر کے جو دوسرے رخ ہیں انہیں بھی پیش نگہ رکھنا بہتر ہوگا۔

"للولال جی کوی: ایک ادبی سوانح" میں اپنے ممدوح کے نام کا یہ روپ احقر نے بطور خاص اس خیال سے زیب عنوان کیا ہے کہ ہماری اپنی حد تک ادبی تواریخ اور تذکروں میں وہ اسی نام سے مشہور و معروف رہے ہیں۔ خود انہوں نے اپنی تحریروں میں اپنے آپ کو "للولال جی کوی" سے موسوم کیا ہے لیکن نام کے اس قالب کو عام طور پر اپنایا نہیں گیا یا دوسرے لفظوں میں قبول عام حاصل نہ ہوا یا نہ ہوسکا۔ مثلاً ایڈورڈ بی ایسٹ وک نے "پریم ساگر" کے اپنے انگریزی ترجمے اور ہندی ایڈیشن کے بھی سرورقی اندراجات میں ان کا نام دو طرح سے اور مقدمہ مترجم پر اپنے مشترکہ تعارفی نوٹ میں اور طریقے سے لکھا ہے۔ چنانچہ ترجمہ انگریزی کے سرورق پر یہ نام شری للولال کب اور ہندی ایڈیشن پر صرف "للولال" نیز دونوں میں للولال جی کوی کے پیش لفظ کے مشترک تعارف میں "للولال جی" تحریر کیا ہے۔ راقم نے للولال جی کوی کے نام نامی کے ایسے ہی کئی عددی اختلافی روپوں کے مد نظر اوران سے بچنے کی خاطر بھی اسی ایک صورت کو بطور عنوان ہی زیب داستان نہیں کیا ہے بلکہ اپنی حد تک پوری کتاب میں اسی نام کو قایم و برقرار بھی رکھا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا بھی مشاہدہ ہے للولال جی کوی کے نام کی یہی شکل عام شہرت رکھتی ہے اور خاکسار کا اندازہ یہ ہے کہ منقولہ متفرق قالب یا تو اختصار کی غرض سے یا

محض روا روی اور جلدی میں لکھے جاتے ہیں۔ ان متعدد اور ملتے جلتے ناموں کے استعمال کے باقاعدہ حوالے یہاں طول عمل کے ساتھ ساتھ بوجھل بھی معلوم ہوں گے۔

" شری للوجی لال کوی برہمن گجراتی سہسرادیچ آگرے والے نے اپنا یہ نام 'پریم ساگر' کے پیش لفظ اور آیندہ منقولہ خود نوشت "کوی پریچے" کے علاوہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی تصریحات کے بہ موجب اور بہ حوالہ ص۱۴۷ "راج نیتی" کے برج دیباچے میں بھی بعینہٖ لکھا ہے۔ للولال جی کوی کی دوسری مصنفہ و مترجمہ اور مؤلفہ یا مرتبہ کتب کے اندراجات میں بھی یہی نام یعنی "للوجی لال کوی" مستعمل رہا ہے۔ مثلاً بہ حوالہ پروفیسر عبیدہ بیگم ص۱۴۱ "لطایف ہندی" میں بہ صفحہ ۴۱۹ "نقلیات لقمانی" میں بہ صفحہ ۵۶۲ "چھتر پرکاش" میں بہ صفحہ ۴۵۳ "سبھا بلاس" میں بہ صفحہ ۴۲۸ "برج بھاشا کے قواعد" میں بہ صفحہ ۴۳۱ "لال چندریکا" میں بہ صفحہ ۴۳۲ "مادھو بلاس" میں۔ للولال جی کوی نے ظاہر ہے یہی نام اپنی خود گزشت میں بھی تحریر کیا لیکن وہاں "آگرے والے" کے بجائے "آگرے واسی" کے الفاظ ملتے ہیں۔ للولال جی کوی کی اس تصنیف کو حالیہ زمانے میں اغلب ہے کہ اولاً ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کی دریافت کہا جا سکتا ہے جن سے مستفاد صرف دو مختصر بیانات ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اقتباس کیے ہیں۔ ازاں بعد ڈاکٹر نیرج گوئل نے بھی للولال جی کوی کی اسی سوانح عمری کی روایت پر کچھ گفتگو کی ہے۔ اول الذکر محقق کی سند پر ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے للولال جی کوی کی آپ بیتی سے ایک تو وہ عبارت پیش کی ہے جو فورٹ ولیم کالج سے ان کی وابستگی کے بارے میں ہے اور دوسرے وہ کلمات ہیں جن میں بر بنائے احکامات اردو شعراء کے ذریعے ایک سال میں چار برج کتابوں کو اردو کا روپ دینے کا تذکرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر نیرج گوئل نے للولال جی کوی کے اسی احوال تراجم کی مدد سے اپنے تاثرات تحریر کیے ہیں جو ان کے اپنے الفاظ میں پیش ہیں: "للولال" جنھیں ہندی ساہتیہ میں برج بھاشا کے مہانتم یودھا کے روپ میں یاد کیا جاتا ہے کے سمبندھ میں ایک بہت ہی دل چسپ بات دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے اپنی آتم کتھا میں ایک استھان پر لکھا ہے: "ایک دن صاحب نے کہا کہ برج بھاشا میں کوئی اچھی کہانی ہو اسے ریختے کی بولی میں کہو۔ میں نے کہا بہت اچھا، پر اس کے لیے کوئی پارسی

لکھنے والا دیکھیے تو بھلی بھانت لکھی جاتے۔" انھوں نے دو شاعر میرے تعینات کیے، مظہر علی ولا اور کاظم علی جوان۔ ایک ورش میں چار پوتھی کا ترجمہ برج بھاشا میں (سے) ریختے کی بولی میں کیا: "سنگھاسن بتیسی" "بیتال پچیسی" "شکنتلا" اور "مادھونل"۔ للولال جی کوی کے اس بیان پر ڈاکٹر گوپل موصوف نے بھی یہی سوال اٹھایا ہے کہ کیا یہ سبھی کتابیں خود للولال جی کوی کے اپنے تراجم شمار نہیں ہوں گے؟: اس پرکار کے کتھن سے ایسا پرتیت ہوتا ہے کہ کیا للولال کی یہ سوتنتر رچنائیں نہیں تھیں؟ للولال کا اپنا کتھن بھی سپشٹ نہیں ہے جس کے کارن ان کے لیکھن پر سندیہہ سا ہوتا ہے۔ اس سمبندھ میں انیہ کوئی جان کاری بھی نہیں ملتی۔ ہاں ڈاکٹر ہرمیندر سنگھ کا بھی وچار ہے کہ یہ چاروں رچنائیں للولال کی سوتنتر رچنائیں نہ ہو کر انواد ماتر تھیں" (ص ۴۳/۴۴) پروفیسر لکشمی ساگر وارشنے بھی جوان اور ولا کی قلمی شراکت کی بنا پر ان تراجم کو للولال جی کوی کی اپنی آزادانہ کاوش تسلیم نہیں کرتے۔ عجیب تر یہ کہ ہندی وانگریزی مورخین کے ملاحظے میں اردو بھی ناگری ایڈیشن ہیں پھر بھی سب تذبذب کا شکار ہیں۔

درحقیقت اس امر میں اشتباہ کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ ان جدید اسکالروں کی ان محکم دلایل تک رسائی نہیں ہے جو اس خاص تعلق سے یعنی متذکرہ تراجم کے خود للولال جی کوی کا کارنامہ ہونے کے داعیے کا اثبات کریں۔ ڈاکٹر ہرمیندر سنگھ کی جس رائے کی طرف ڈاکٹر نیرج گوپل نے اشارہ کیا ہے وہ اسی امر کا ثبوت ہے کہ نئے غیر اردو مورخین کم از کم اس ایک بنیادی نکتے پر توجہات مرکوز نہیں کر سکے کہ متعلقہ اردو شعرا۔ برج زبان اور لٹریچر سے ادبی سطح پر کوئی استفادہ یا اخذ و ترجمہ از خود نہیں کر سکتے تھے تبھی تو ان متون کی ریختے میں منتقلی کی غرض سے للولال جی کوی کے ہمراہ انہیں متعین کیا گیا تھا۔ جوان اور ولا کے اپنے بیانات میں اگرچہ للولال جی کوی کے وسیلے کو نظر انداز کیا گیا ہے مگر وہ ان محققین کے پیش نظر ہوتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ للولال جی کوی کے کارنامۂ تراجم کو ثابت نہ کر سکتے۔ غالباً اس قدر تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی یا پھر کوئی زحمت ہی نہ کی گئی کہ کم از کم "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" کے للولال جی کوی کے تالیف کیے ہوئے ہندی متون شایع شدہ موجود ہیں اور

ظاہر ہے کہ ان ترجموں کے ناگری ایڈیشنوں کو للولال جی کوی کے علاوہ اور کسی کا کارنامہ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ چنان چہ "بیتال پچیسی" اور "سنگھاسن بتیسی" للولال جی کوی کی اپنی اور "سوتنتر رچنائیں" ہیں۔

راقم الحروف اپنے محدود وسایل اور لا محدود مسایل کے باعث آیندہ اوراق میں صرف "بیتال پچیسی" کے ہندی متن اور "سنگھاسن بتیسی" کے اردو ترجمے کو للولال جی کوی کا کارنامہ ثابت کرنے پر قناعت کے لیے مجبور ہے۔ چنانچہ اس کا بڑا افسوس ہے کہ "مادھونل کام کندلا" اور "شکنتلا" کے بھی ہندی تراجم کے سلسلے میں للولال جی کوی کی علمی کاوشوں کو بالتفصیل سامنے لانا غیر ممکن رہا۔ البتہ "بہاری ست سئی" کی شرح "لال چندریکا" کے ہمراہ مطبوعہ للولال جی کوی کی زیر تذکرہ سوانح عمری کا متن بازیافت ہو گیا ہے جو اسی مقام پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔

للولال جی کوی کی آپ بیتی "کوی پریچے"

"لال چندریکا" کے گریرسن ایڈیشن کی بسم اللہ للولال جی کوی کی اپنی نگارشات نظم و نثر سے ہوتی ہے۔ گریرسن "تعارف" میں بہ صفحہ ۱۹ راوی ہے کہ "لال چندریکا" کے طبع اول میں للولال جی کوی کا پیش لفظ کتاب کے اخیر میں درج تھا جس کو اس نے اپنی ترتیب میں اصل مقام پر شامل کر دیا۔ للولال جی کوی کی ان منظوم و منثور تحریروں کے ضمن اجزا ہیں یعنی (۱۵) اشعار کی "بھومکا" نامی ابتدائی نظم پر "کوی پریچے" اور تعارف کتاب موسومہ "گرنتھ کا ورتن" کلام منظوم للولال جی کوی کے نمونۂ سخن کے بہ طور آیندہ عنوان سے نقل کیا جا رہا ہے جب کہ "لال چندریکا" کا تعارف متعلقہ باب میں اردو میں منتقل کیا جائے گا۔ آپ بیتی واالاجزو سطور ذیل کی زینت ہے جس کو حرف بہ حرف نقل بہ خط فارسی سمجھیے کیوں کہ "ترجمے کی کوئی خاص ضرورت نہیں محسوس ہو رہی ہے۔" "لال چندریکا" کے تمام تر زیر اکتساب اوراق کا عکسی عطیہ جس کی بنا پر یہ انکشافات او رماحصل ممکن ہو سکے ہیں۔ اس حقیر منصوبے کے ایک فائق سرپرست حضرت سلیم قریشی کیوریٹر برٹش لائبریری لندن کا فیضان کرم ہے۔

للولال جی کوی کی یہ آپ بیتی دراصل وہی ہے جس کا انکشاف اولاً ڈاکٹر لکشمی ساگر

وارشنے نے فورٹ ولیم کالج پر اپنی وقیع تحقیق میں کیا اور جس کے حوالے پروفیسر عابدہ بیگم اور ڈاکٹر نیرج گویل نے دیے۔ تاہم یہ شروع میں معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ پروفیسر وارشنے صاحب کا اپنا اصل ماخذ کیا تھا اور خیال یہی تھا کہ للولال جی کوی کی کتاب "آتم کتھا" نامی یا کسی اور عنوان سے بہ صورت مخطوطہ یا مطبوعہ ضرور موجود ہوگی۔ جناب سلیم قریشی کے ہاں سے "لال چندریکا" سے کچھ عکسی نقول نظر افروز ہونے پر راقم نے یہ گزارش کی کہ للولال جی کوی کا اپنا مقدمہ بھی مرحمت کرنے کا انتظام فرما دیا جائے۔ قریشی صاحب ممدوح نے فوراً یہ زحمت بھی قبول فرمائی اور ان کی بندہ نوازی بلکہ احقر پروری نے اس ذرۂ بے مقدار کو دیگر متعدد اضافوں کی طرح للولال جی کوی کے ان نوادر کی بھی پیش کش کا یہ زریں موقع بخش دیا۔

للولال جی کوی کی یہ خود نوشت سوانح "کوی پریچے" ان کے سارے ہی حالاتِ زندگی کا احاطہ تو نہیں کرتی بلکہ اختصار سے صرف چند واقعات، تاریخ تحریر ۱۸۰۹ء تک کے انھوں نے بیان کیے ہیں۔ گریرسن نے صـ۱۱۲ پر اسی احوال کا "خلاصہ" للولال جی کوی مصنف "لال چندریکا" کے زیرِ عنوان لکھا ہے جس سے یہ نئی اطلاع ملتی ہے کہ للولال جی کوی کے متذکرہ مقصود آباد سے مرشد آباد مراد ہے۔ تاہم اس میں اپنی طرف سے للولال جی کوی کے ہندی کے "موجد" ہونے کا اضافہ کر دیا ہے جو قابلِ بحث ہے اور یہ نکتہ "پریم ساگر" کے باب کی متعلقہ گفتگو میں سمویا جائے گا کیوں کہ گریرسن نے "پریم ساگر" کے خاص حوالے سے ہی ہندی کی ایجاد کو للولال جی کوی سے منسوب کیا ہے۔ "کوی پریچے" کا متن ملاحظہ ہو جو صاف سیدھے سبھاؤ کی ہندی میں ہے اور ترجمے یا ترجمانی سے مستغنی۔ صرف پیراگرافوں میں اس تحریر کو راقم نے تقسیم کیا ہے:

"اتھ کوی پریچے" شری للولال جی کوی برہمن گجراتی سہسر اودیچ آگرے واسی سموت ۱۸۰۳ میں اپنا نگر چھوڑ انّ جل کے آدھین ہو مقصود آباد میں آیا اور کرپا سکھی کے چیلے گوسوامی گوپال داس کے ست سنگ سے نواب مبارک دولہ سے بھینٹ کر سات برس وہاں رہا۔ گوسوامی گوپال داس کے ویکنٹھ واس پانے سے اور ان کے بھائی گوسوامی رام رنگ کو شلیا داس کے برندابن جانے سے اداس ہو، نواب سے بدا ہو، نگر کلکتے میں آیا اور باون لکھوی رانی بھوانی کے پتر راجا رام کرشن سے پریچے کر ان کے پاس رہا جب ان کی

زمین داری کا بندوبست ہوا اور انہوں نے اپنا راج پایا تب ان کے ساتھ ہی کلکتے سے ٹانڈے کو گیا۔ کتی برس پیچھے ان کے راج میں اُپدرو ہوا اور وے قید ہو مقصود آباد میں آتے۔ تب ان سے بدا ہو پھر کلکتے میں آیا۔ یہاں کے بڑے آدمیوں سے بھینٹ کی پر کچھ پراپت نہ ہوا۔ انھوں کے تھوڑے تھے شنتا چار میں جو کچھ وہاں سے لیا تھا سو بیٹھ کر کھایا۔ ندان کتی برس کے بیٹھے بیٹھے گھبرا کے جی میں آیا کہ دکشن کو چلا چاہیے۔ یہ منورتھ کر یہاں سے جگن ناتھ پوری تک گیا، او مہا پربھو کے درشن کیے۔ سنیوگ سے ناگ پور کے راجا منیاں بابو بھی اسی برش شری کشیتر میں آتے تھے۔ ان سے بھینٹ کر ان کے ساتھ جانے کا وچار بیسوں بسوے پکّا ہو چکا تھا پر ان جل پر بل ہے اس نے نہ جانے دیا اور الٹا کھینچ کر لے آیا۔

کچھ دن پیچھے سنا کہ ایک پاٹھ شالا کمپنی کے صاحبوں کے پڑھنے کو ایسی بنے گی کہ جس میں سب بھاشا جاننے والے لوگ رہیں گے۔ یہ سماچار پا کے چت کو اتی آنند ہوا اور سنا کہ ایک پاٹھ شالا کے لیے کتی ایک صاحب مقرر ہوتے۔ یہ بات سُن میں نے جاتے گوپی موہن ٹھاکر سے کہا کہ آپ کچھ سہی کریں تو میری آجیوکا کمپنی میں ہو جاتی ہے۔ انہوں نے سن کر دوسرے دن اپنے چھوٹے بھائی شری ہری موہن ٹھاکر کے ساتھ کر دیا۔ انہوں نے لے جا پادری برم صاحب سے ملایا او صاحب نے کہا تو ہمارے پاس حاضر رہ۔ میں نت ان کے پاس جایا کروں، ایک مہینے تک میں ان کے پاس گیا۔ اس میں میرے جی میں آیا کہ نہ میں ان کی بات سمجھتا ہوں نہ یہ میری سمجھیں اس سے کچھ اور اپائے کیا چاہیے۔ یہ وچار دیوان کاشی ناتھ کے چھوٹے پتر شیام چرن بابو کے وسیلے سے ڈاکٹر رسل صاحب کی چٹھی لے ڈاکٹر گل کرسٹ صاحب سے بھینٹ کی۔ انہوں نے مجھے دیکھ اتی پرسن ہو کہا "ایک بھاشا جاننے والا ہمیں چاہیے تھا، تم نے اچھا کیا جو ہم سے ملاقات کی۔ تمہاری چاکری انس سندیہہ پاٹھ شالا میں ہو گی، تم ہمارے پاس نت آیا کرو۔" اس دن سے میں ان کے پاس جانے لگا او جو وے پوچھتے سو بتاتے۔

ایک دن صاحب نے کہا کہ "برج بھاشا میں کوئی اچھی کہانی ہو اسے ریختے کی بولی میں کہو۔" میں نے کہا "بہت اچھا، پر اس کے لیے کوئی پارسی لکھنے والا دیجیے تو بھلی بھانت لکھی جاتے۔" انہوں نے دو شاعر میرے تعینات کیے، مظہر علی خاں ولا

اور کاظم علی جوان ۔ ایک برس میں چار پوتھی کا ترجمہ برج بھاشا سے ریختے کی بولی میں کیا۔ "سنہاسن بتیسی" بتیال پچیسی، شکنتلا ناٹک اور مادھونل۔ سمبت ۱۸۵۷ میں آجیو کا کمپنی کے کالج میں استھت ہوئی، اسے اُنیس برس ہوتے۔ اس میں جو پوتھیاں برج بھاشا اور کھڑی بولی اور ریختے کی بنائی سو سب پر سدھ ہیں۔ اب سمبت ۱۸۷۵ میں امرچندریکا، انور چندریکا، ہری پرکاش ٹیکا، کرشن کوی کی ٹیکا کوت والی، کرشن والی کی ٹیکا، پٹھان کی ٹیکا کنڈلیوں والی، سنسکرت ٹیکا، یہ سات بہاری ست سئی کی ٹیکا دیکھ وچار شبدارتھ اور بھاو ارتھ او نا میکا بھید اور النکار اداہرن سمیت اکتی یکتی سے پرکاش کری "لال چندریکا" ٹیکا بنائی او چھپوائی نج چھاپے خانے میں شریمان دھیان پنڈت کوی رسک ہری بھکتوں کے آنند ارتھ۔"

للولال جی کوی کی اس مختصر سی سرگذشت میں متذکرہ بکرمی سنین میں سے ۱۸۵۷ سمبت عیسوی ۱۸۰۰ کے اور ۱۸۷۵ سمبت عیسوی ۱۸۱۸ کے مطابق ہے چنانچہ گل کرسٹ سے تعارفی ملاقات کے حوالے سے کالج سے وابستگی کا سال بہ قول للولال جی کوی کے ۱۸۰۰ ہے جس میں کسی اشتباہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا ہے جب کہ ۱۸۱۸ "لال چندریکا" کا سن تصنیف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ للولال جی کوی کے ان بیانات کو مکمل طور پر روشنی میں نہیں لایا گیا ہے، تاہم اب اس انتہائی تشنہ و مجمل خود گزشت کی اپنی وجہ سے بھی متعدد سوالات سامنے آتے ہیں جن کی وضاحت اب شاید ہی کبھی ممکن ہو سکے۔ مثلاً یہی کہ ابتدائی ادوار میں کوئی بڑا نثری کارنامہ للولال جی کوی سے اگر ظہور میں نہیں آیا تو بھی بہ حیثیت شاعر اس اثنا میں وہ خود کو تسلیم یا کم از کم معروف ضرور کروا سکے ہوں گے یا نہیں۔ اب اسی قیاس پر قانع رہنا پڑے گا کہ للولال جی کوی کے اصلی جوہر کالج سے منسلک ہونے پر ہی کھلے خواہ نثر میں ہوں یا نظم میں۔ دوسری صورت میں اس شاعرانہ انکسار کو کیا کہیے کہ للولال جی کوی نے "کوی پریچے" میں ہی اپنی ابتدائی زندگی کیا بعد کے دنوں کی بھی شاعری کا ذکر تک نہ کیا۔ جیسا کہ انہی صفحات میں اسی مقام سے منقولہ "لال چندریکا" کے منظوم افتتاحیے سے عیاں ہوگا، للولال جی کوی اپنی صنف اور نوعیت کی شاعری میں بلاشک و شبہ قادر الکلام رہے ہوں گے۔

"لال چندریکا" کے اس نثری ابتدایئے کے دوسرے حصے میں للولال جی کوی نے "بہاری ست سئی کی کہانی روایت کی ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے تو خیر یہ خیال آ ہی سکتا ہے کہ کیا خوب کہانی لکھی ہے۔ مگر حیرت کی جا ہے کہ یہ ادبی سوانح خود ایک عمدہ کہانی کا مزہ اور

اپنے مصنف کے ایک بڑا کہانی کار ہونے کا پتہ دے رہی ہے۔ زبان کی سادگی اور سلاست وصفائی کے کیا کہنے، شاید ایسی ہی زبان کو گنگا جمنی کہنا چاہیئے۔ خود نوشت میں کہانی کا لطف ہے تو منجھی ہوئی زبان کی اپنی گھلاوٹ بھی ہے۔ غرض یہ آپ بیتی خاصی معلومات سے مستفید تو کرتی ہی ہے للولال جی کوی کو ایک اچھے اور بڑے کہانی کار کے روپ میں بھی سامنے لاتی ہے۔ حسرت سی ہوتی ہے کہ للولال جی کوی نے برج بھاشا کے اپنے متر جمات کی طرح اپنی مصنفہ کتب کی بھی سنہ وار نشان دہی کر دی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ "لال چندریکا" بہ قول خود ۱۸۱۸ میں تحریر ہوئی اور بہ قول گریرسن ۱۸۱۹ میں اس کا طبع اول نکلا۔ اس کے اخیر میں للولال جی کوی کی یہ منظوم و منثور نگارشیں شریک تھیں جنہیں گریرسن نے اپنے ایڈیشن میں ان کے اصل مقام یعنی "لال چندریکا" کے افتتاحیے کے طور پر شریک کیا۔ للولال جی کوی کی ان تحریروں کے خاتمے پر طابع کی طرف سے جو مضمون اضافہ ہوا وہ سنسکرت پریس کی کتابوں کا ایک اشتہار ہے۔ اس طرح صرف اس حد تک یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۸/۱۸۱۹ تک للولال جی کوی کی یہ مطبوعات ان کے اسی سنسکرت پریس سے شایع شدہ تھیں اگرچہ ان کے باقاعدہ سنین تحریر واشاعت مذکور نہیں ہیں: لال چندریکا، مادھو ولاس، سبھا ولاس، سنگھاسن بتیسی، پریم ساگر، راج نیتی، لطایف ہندی۔ نیز ایک اور کتاب موسومہ "بھاشا قاعدہ" جو ظاہر ہے کہ للولال جی کوی کی ہی "برج بھاشا کے قواعد" کا ناگری ایڈیشن تھی۔ یہ بات اہم ہے کہ ۱۸۱۸/۱۸۱۹ تک للولال جی کوی کے اپنے پریس کی مطبوعہ کتب میں "اودھ بلاس" کا نام موجود نہیں ہے اور اس طرح اس کا بھی عقدہ حل ہونے سے رہ گیا ہے۔

"شری للّو جی لال کا جیون چرت"

جامعہ بمبئی کے یونیورسٹی لائبریرین اور کرم فرماتے بندہ قبلہ پروفیسر اے سی ٹکیکر صاحب نے للولال جی کوی کے "پریم ساگر" کے ایک اہم مرتب ورجرتن داس کے ایڈیشن سے احقر کے التماس پر جو عکس ارزانی فرماتے ہیں وہ بھی للولال جی کوی کی حیات ادبی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ دونوں افاضل کے تئیں قلبی شکرانے کے ساتھ مرتب موصوف کے تحریر کردہ سوانح سے ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ البتہ "جیون چرتر" کے

اخیر میں شریک" للولال جی کے گرنتھوں کی سُوچی" میں فراہم کی ہوئی اطلاعات سے اضافے متعلقہ مواقع پر کیے جارہے ہیں۔

"شری للولال جی کا جیون چرتر" سے للولال جی کوی کے حالات زندگی میں جستہ جستہ اضافے کیے جا سکتے تھے لیکن اس کا مکمل اُردو قالب زیادہ افادیت کا حامل رہے گا۔ اس کی مدد سے خاصی اطلاعیں اکٹھی ملتی ہیں جس سے ان کی حیات وشخصیت پر ان معلومات کی اہمیت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے اپنی اولین تحقیق متعلقہ فورٹ ولیم کالج میں للولال جی کوی کی آپ بیتی سے حوالے دے کر اس کا انکشاف کر چکے تھے لیکن جیون چرتر غالباً "آدھنک ہندی ساہتیہ" کی تصنیف کے دوران پروفیسر وارشنے موصوف کے علم میں آیا جس کا ذکر ایک حاشیے میں ہے۔ ممدوح بھی اپنی دونوں کتب کی افزوں تر ضخامت کے باعث ان نایاب متون سے خاطر خواہ اضافے نہ کر سکے۔ البتہ ان کی ثانی الذکر کتاب میں ایک ایسا انکشاف ہے جو ورجرتن داس کے ایک تاثر کا ازالہ کرتا ہے۔ جیون چرتر میں جیسا کہ منقول ہوا چاہتا ہے للولال جی کوی کی ہمہ دانی پر شک وشبہ کا رویہ ملتا ہے جب کہ "آدھونک ہندی ساہتیہ" میں للولال جی کوی کی فارسی دانی تک کا ذکر کیا گیا ہے۔ پروفیسر وارشنے بہ صفحہ ۳۶، ۳۷ راوی ہیں کہ ۱۵ر جنوری کو رڈیل Ruddell نے کالج کونسل کی ایک تجویز کی اطلاع عام فارسی بنگالی اور انگریزی میں نکلوائی تھی جس کے مطابق اشاعت کتب کے خواہشمند اور کالج کی امداد کے امیدواروں سے طباعتی منصوبے طلب کیے گئے تھے۔ اس روایت کے بہ موجب اشتہار کے جواب میں" للولال نے نقلیات ہندی (یعنی لطایف ہندی) اور برج بھاشا ویاکرن کے پرکاشن کی آگیا مانگتے سمے اپنا پرارتھنا پتر فارسی میں لکھ کر بھیجا تھا۔" للولال جی کوی کے" جیون چرتر" میں ان کی فارسی کی اہلیت کا ذکر تو درکنار سنسکرت دانی پر ہی اظہار اشتباہ کیا گیا ہے۔

ورجرتن داس کا مصنفہ "شری للولال جی کا جیون چرت" انھی کے وقیع الفاظ میں پیش ہے:

"ان کا نام للولال، لال چند یا للوجی تھا اور کویتا میں اُپنام لال کوی تھا۔ یہ آدھونک ہندی گدیہ کے اور اس کے آدھونک سَوروپ کے پرتھم لیکھک مانے جاتے ہیں۔

یہ آگرانواسی گجراتی اودیچیہ برہمن تھے اوراس نگر کے بلکا کی بستی گوکل پورہ میں رہتے تھے۔ ان کے پتا کا نام چین سکھ جی تھا جو بڑی دریدراوستھا میں رہتے تھے اور پروہتائی تھا آکاش وروتی سے کسی پرکار اپنا کاریہ چلاتے تھے۔ ان کے چار پتر تھے جن کے نام کرشن للوجی، دیال جی، موتی رام جی اور چینتی لال جی تھے۔ سب سے بڑے للولال جی تھے جن کے جنم کا سمے نشچت روپ سے ابھی تک گیات نہیں ہوا ہے، پر سمبھوت ان کا جنم سموت ۱۸۲۰ وکرمی کے لگ بھگ ہوا ہوگا (یہ مطابق عیسوی ۱۷۶۳) انہوں نے گھر ہی پر کچھ سنسکرت، فارسی اور برج بھاشا کا گیان پراپت کرلیا تھا۔ جب سموت ۱۸۴۰ وکرمی میں ان کے پتا سورگ کو سدھارے تب ادھک کشٹ ہونے کے کارن یہ سموت ۱۸۴۲ وکرمی میں جیویکا کی کھوج میں مرشدآباد آئے۔ یہاں کرپا سکھی کے ششیہ گوسوامی گوپال داس جی کے پریچے اورست سنگ سے ان کی پہنچ وہاں کے نواب مبارک الدولہ کے دربار میں ہوگئی۔ نواب نے ان پر پرسن ہوکر ان کی جیویکا باندھ دی جس سے یہ آرام سے وہاں سات ورش تک رہے۔ سموت ۱۸۵۰ وکرمی میں گوسوامی گوپال داس جی کی مرتیو ہوجانے اوران کے بھائی گوسوامی رام رنگ کو شلیا داس جی کے بردوان چلے جانے سے ان کا چت اس استھان سے ایسا اچاٹ ہوا کہ نواب کے آگرہ کرنے پر بھی ان سے ودا ہو یہ کلکتے چلے گئے۔

ناٹور کی پرسدھ رانی بھوانی کے دتک پتر (متبنّیٰ) مہاراج رام کرشن سے کلکتے میں ان کا پریچے ہوگیا اور یہ کچھ دن انہی کے آشریہ میں وہاں رہے۔ جب ان کے راجیہ کا نتے روپ سے پربندھ ہوگیا اور انہیں ان کا راجیہ بھی مل گیا تب یہ بھی ان کے ساتھ ناٹور گئے۔ کئی ورش کے انتر جب ان کے راجیہ میں اپدرو مچا اور وہ قید کیے جاکر مرشدآباد لائے گئے۔ تب یہ بھی ان سے ودا ہوکر سموت ۱۸۵۳ وکرمی میں کلکتے لوٹ آئے جہاں کچھ دن تک چت پور روڈ پر رہے۔ یہاں کے کچھ بابو لوگوں نے پرکٹ میں تو ان کا بہت کچھ آدرستکار کیا پر کچھ سہایتا نہ کی کیوں کہ وہ لکھتے ہیں کہ "انھوں کے تھوڑے ششٹاچار میں جو کچھ وہاں سے لایا تھا سو بیٹھ کر کھایا"۔ جب کئی ورش انہیں جیویکا کا کشٹ بنا رہا تب انت میں گھبرا کر جیویکا کی کھوج میں یہ جگن ناتھ پوری گئے۔ جب جگدیش کا درشن کیے تھے تب سرچت نردے داشٹک سنا کران کی استتی کی تھی جس کا پرتھم دوہا یوں ہے ۔

وشو بھر بنے بھرت ہو بھلے بنے مہراج ہمری اور نہاری کتے، لکھو آپ کو کاج

سینوگ سے ناگ پور کے راجا مانیہ بابو بھی اسی سمے جگدیش کے درشن کرنے آتے ہوتے تھے اور وے کھڑے کھڑے ان کی اس دَینیہ اِستتی کو جسے یہ بڑی دینتا کے ساتھ پڑھ رہے تھے سنتے رہے۔ اس سے انھیں ان پر بڑی دیا آئی اور انھوں نے ان سے پریچے کرکے اپنے ساتھ ناگ پور لوا جانے کے لیے بہت آگرہ دکھلایا۔ ان کا وچار بھی وہاں جانے کا پکا ہو گیا تھا۔ پر ابھی تک ان کے اُدرشٹ نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا جس سے یہ ان کے ساتھ نہیں جا سکے اور کلکتے لوٹ آتے۔ وِدا ہوتے سمے مانیہ بابو نے سو روپے بھینٹ دے کر ان کا ستکار کیا تھا۔

انہی دنوں صاحبوں کے پٹھن پاٹھن کے لیے جب کلکتے میں ایک پاٹھ شالا کھلی تب انھوں نے گوپی موہن ٹھاکر سے جا کر پرارتھنا کی۔ انھوں نے اپنے بھائی ہری موہن ٹھاکر کے ساتھ انھیں بھیج کر پادری برن صاحب سے ان کی بھینٹ کرا دی۔ انھوں نے آشا بھروسا تو بہت دیا پر ایک مہینہ وِیتیت ہو جانے پر بھی جب ان کا کیا کچھ نہیں ہوا، تب دیوان کاشی ناتھ کھتری کے چھوٹے پتر شیاما چرن کے دوارا ڈاکٹر رسل سے ایک انورودھ پتر پراپت کرکے انھوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ سے بھینٹ کی جو ان دنوں فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل تھے۔ انہی گل کرسٹ صاحب کا جو اس سمے ہندی اور اردو بھاشاؤں کا سروپ نشچت کر رہے تھے ست سنگ للو لال جی کی وکھیاتی کا مُول کارن ہوا۔

صاحب نے انھیں برج بھاشا کی کسی کہانی کو ہندی گدیہ میں لکھنے کی آگیا دی اور رارتھ سہایتا کے ساتھ ساتھ ان کے پارکھن انوسار دو مسلمان لیکھکوں کو جن کا نام مظہر علی خاں ولا اور کاظم علی جوان تھا سہایتارتھ نیگت کر دیا۔ تب انھوں نے ایک ورش سموات ۱۸۵۶ وکرمی میں پریشرم کرکے چار پستکوں کا برج بھاشا سے ریختے کی بولی میں انوواد کیا۔ ان پستکوں کے نام سنہاسن بتیسی، بیتال پچیسی، شکنتلا ناٹک اور مادھونل ہیں۔

آگرے کے تیراک بہت پرسدھ ہوتے ہیں اور للو جی بھی وہاں کے نواسی ہونے کے کارن تیرنا اچھا جانتے تھے۔ دیوات ایک دن انھوں نے تٹ پر ٹہلتے سمے ایک انگریز کو گنگا جی میں ڈوبتے دیکھا۔ تب انھوں نے نڈر ہو کر جھٹ پٹ کپڑے اتار ڈالے اور گنگا جی میں کود دو ہی غوطے میں اسے نکال لیا۔ وہ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی

پداودھیکاری تھا۔ اس نے اپنے پران رکھشک کی پوری سہایتا کی اور انہیں کچھ دھن دے کر چھاپہ خانہ کھلوا دیا۔ اسی کے انرودھ سے فورٹ ولیم کالج میں ان کی وکرم سموت ۱۸۰۵ میں پچاس روپے ماسک کی آجیویکا لگ گئی۔ بس اس کے اننتر ان کی پرتشٹھا اور کھیاتی برابر بڑھتی چلی گئی۔ انہوں نے اپنے پریس میں جس کا نام سنسکرت پریس رکھا تھا اپنی پستکیں چھپوا کر بیچنا آرمبھ کر دیا۔ کمپنی نے بھی اس پریس کے لیے بہت کچھ سہایتا دی جس سے اس میں چھپائی کا اچھا پربندھ ہو گیا۔ یہ ینترالیہ پہلے پٹل ڈانگا میں کھولا گیا تھا۔ ان کے پریس کی پستکوں پر سروسادھارن کی اتنی شردھا ہو گئی تھی کہ ان کے پرکاشت راماین ۳۰،۴۰، ۵۰ کو اور "پریم ساگر" ۱۵، ۲۰، ۳۰ ــــــــ کو بک جاتے تھے۔ ان کے چھاپے خانے کے چھپے ہوئے گرنتھوں کو ایک شتابدی سے ادھک ہو گیا، پر وے ایسے اتم موٹے اور سفید بانسی کاگج پر چھپے تھے کہ اب تک نئے اور درڑھ بنے ہوتے ہیں۔

للولال جی کوی چوبیس ورش تک فورٹ ولیم کالج میں ادھیاپک رہے اور وکرم سموت ۱۸۸۱ (یعنی عیسوی ۱۸۲۴) میں پنشن لے کر سودیش لوٹے۔ وے اپنا چھاپہ خانہ کبھی آتے سمے ناؤ پر لاد کر ساتھ ہی آگرے لائے اور وہاں اسے کھولا۔ آگرے میں اس چھاپے خانے کو جما کر یہ کلکتے لوٹ گئے اور وہیں ان کی مرتیو ہوئی۔ ان کی کب اور کیسے مرتیو ہوئی اس کا اُرت ان کے جنم کے سمے کے سمان نشچت روپ سے گیات نہیں ہوا۔ پرنتو پنشن لیتے سمے ان کی اوستھا لگ بھگ ۶۰ ورش کی ہو چکی تھی۔

یدھیپی ان کے بھائیوں کو سنتان تھی پر یہ نی سنتان ہی رہے۔ ان کی پتنی کا ان پر اسادھارن پریم تھا اور وے ان کے کشٹ کے سمے برابر ان کے ساتھ رہیں۔ یہ وشنو تو ادشیہ ہی تھے پر کس سمپردائے کے تھے، سو ٹھیک نہیں کہا جا سکتا۔ سمبھوت یہ رادھا ولبھیہ گیات ہوتی ہے۔

اتنا تو اسپشٹ ہی ودت ہے کہ یہ کوئی اتکٹ ودوان نہیں تھے اور نہ کسی ودیا کے آچاریہ ہونے کا گرو ہی کر سکتے تھے۔ سنسکرت کا بہت کم ــــــ گیان رکھتے تھے، اردو اور انگریزی بھی کچھ کچھ جانتے تھے، پر برج بھاشا اچھی جانتے تھے۔ کوی بھی یہ کوئی اُچ کوٹی کے نہیں تھے۔ پرنتو جس سمے یہ اپنی لیکھنی چلا رہے تھے اس سمے یہ واستو میں ٹھیٹھ ہندی کا سروپ استھر کر رہے تھے۔ ہندی گدیہ کے کارن ہی یہ پرسدھ اور

دکھات ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یدی یوا جک تول ہوئے کدپی اتنے لیش کے بھوگی نہ ہوئے۔ یہ یہ تو نیوٹن آدی جگت پدنہ و دوالوں کے لیے بھی کہا جا سکتا ہے۔ بطور اختتامیہ درج للولال جی کوی کی کتابوں کی فہرست سازی میں ورجرتن داس نے بھی ''ادھ بلاس'' اور ''چھتر پرکاش'' کو شریک نہیں کیا ہے اور یوں پروفیسر عبیدہ بیگم وہ واحد سوانح نگار ہیں جن کے ہاں ان کتب کا انکشاف ملتا ہے۔

للولال جی کوی کا نمونۂ کلام:۔ پروفیسر عبیدہ بیگم نے ''چھتر سال چھتر پرکاش'' نامی منظوم سوانح سے للولال جی کوی کے چند اشعار زورِ کلام کے ثبوت کے طور پر ناگری اور اردو رسوم خط میں درج کیے ہیں، جس کے علاوہ نمونتہً بھی للولال جی کوی کا کلامِ منظوم جمع نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات'' جیسے زبردست وسعت کے حامل مبحث سے متعلق تمام تر افراد کے اپنے اپنے تخلیقی عمل سے زیادہ مثالیں شامل کرنا کسی طور ممکن نہ ہوتا۔ چنانچہ فاضل ممدوحہ نے راقم کو بالکل بجا طور پر تحریر فرمایا کہ ''میری تحقیق کا کینوس چوں کہ زیادہ وسیع تھا اس لیے للو جی سے متعلق بہت سے حقائق پیش نہیں کیے جاسکتے ہیں''۔ البتہ گمان غالب ہے کہ خود ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کی تحقیقی تصنیف میں بھی (جس کے وسیلے سے للولال جی کوی کی آپ بیتی یا آتم کتھا کا انکشاف اوّلاً ہوا) اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم اور ڈاکٹر نیرج گوئل کے ہاں منقول ''لال چندریکا'' میں دریافت ہونے والی للولال جی کوی کی نظم اور نثر سے زیادہ اقتباسات جمع نہیں ہو سکے ہیں۔ کیونکہ پروفیسر وارشنے صاحب موصوف کی سند پر للولال جی کوی کی اس آپ بیتی سے محولہ اطلاعات مجمل و متفرق ہیں اور خاص کر ''لال چندریکا'' کی افتتاحی نظم و نثر کا ذکر معدوم ہے۔

''بھومیکا'' نامی للولال جی کوی کی پندرہ اشعار کی منظوم تخلیق ''لال چندریکا'' کے گریرسن ایڈیشن کے عکسی نقوش میں شریک ہے اور منجملہ عنایاتِ سلیم قریشی صاحب ہے جن کے عطا کردہ نوادر اس نگار خانے کی زینت ہیں۔ جیسا کہ عرض ہوا للولال جی کوی کی ''لال چندریکا'' کے گریرسن ایڈیشن کی بسم اللہ ان کی اسی نظم اور معاً بعد کی نثری نگارشات سے ہوتی ہے۔ یہ نظم ''بھومیکا'' اپنے خالق کے قلبی جذبات اور ادبی ذوق و شوق کی مظہر معلوم ہوتی ہے جیسا کہ اس کا منقولۂ ذیل اردو روپ ملاحظہ کر کے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں۔

بھومکا

ہوں بنوؤں سب کوِن کے　　چرن کمل سِر نائی
پرگٹ کری یہی لوک میں　　کوِتا جن بہو بھائی

سو کوِتا ہے بھانتی کی　　آرش پورُش جانی
آرش سُراُرمنِن کرت　　نرکرت پورش مانی

پورش کوِتا تری ودھی ہے　　کوی سب کہت بکھانی
پرتھم دیو وانی بہوری ہے　　پراکرتی بھاشا جانی

انیس بھید تین ہوتی سو　　بھاشا بہت پرکار
برنت ہیں بن سبن میں　　گواریاری رس سار

ورج بھاشا بھاوت سکل　　سُروانی سم تُول
تاہی بکھانت سکل کوی　　جانی مہا رس مُول

وِرج بھاشا برنی کوِیئو　　بہو بدھی بہوی ولاس
سب کو بھُوشن ست سیا　　کری بہاری داس

جو کو ورس ریتی کو　　سمجھیو چاہتے سار
پڑھے بہاری ست سیا　　کویتا کو شرنگار

اُدے است لوں او نی پتے　　سب کے یا کی چاہ
سُنَت بہاری ست سیا　　سب ہی کرت سراہ

بھانتی بھانتی کے ارتھ بہو | یامیں گوڑ اگوڑ
جاہی سنے رس ریتی کتو | مگ سمجھواتی موڑ

دِوِدھ نائیکا بھید ارُد | النکار ترُپ انیتی
پڑھے بہاری ست ستا | جانے سب کوئی ریتی

ٹیکا کی کوی سے لال نے | لال چندریکا نام
جو کوئی پڑھی ہے سمجھ کے | ہے ہے گن کو دھام

شِو آنن کر وشی وسُو مہی | سمبت لیہُو وِچار
ماگھ سُدی پانچیں ششنو | بھئیو گرنتھ پرچار

پنڈت جن کو شرم رم | جانت جے مَتی دِھیر
کب ہر بانجھ نہ جانی ہے | تن پر سُوت کی پیر

دوشہی کو اُہتیں کہتیں | گن نہ کہوں کھل لیک
پیئے رُدھر پیے نہ پیے | لگی پیئو دھر جیک

یدپی کاوِیہ بھوشن سہت | دَرجن دوشت تاہی
بگرے ریت بناتے ہیں | سجن سادہ سراہی

للولال جی کی یہ "بھومکا" ناگری خط سے اردو قالب میں تو راقم نے منتقل کردی ہے لیکن اس کی شرح و تفہیم کا حق کوئی برج شناس ماہر ہی ادا کرسکتے ہیں۔

معاصرین اور رفقا

ایک تعارفی نگاہ

للولال جی کوی کے ہم عصروں کی کئی حیثیتیں ہیں۔ مثلاً ان کے انگریز ممدوح جو کالج یا انتظامیہ کے عہدوں پر فائز تھے اور جن میں سے چند للولال جی کوی کے محسن بھی تھے، نیز ان کے ہندی اور اردو رفقائے کار۔ اجمال و تفصیل کی ضروریات کے ماتحت کوائف کی گردآوری کی غرض سے متذکرہ انواع کے ساتھ ساتھ انفرادی طور پر بھی چند حضرات کو یہاں زیب عنوان کیا جارہا ہے، البتہ اس میں کچھ تحفظات بھی مدِنظر ہیں۔ للولال جی کوی کے شناسا اردو داں رفقا۔ میں سے تقریباً سبھی پر مفصّل سوانحی کیفیات اور ان کی خدمات پر مفید و مثبت تبصروں کا اہتمام ادبی تواریخ میں شروع سے کیا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ ادبا کی تعداد بہت ہی کم ہے جن کا للولال جی کوی کے ساتھ قلمی سطح پر ربط ضبط رہا، یہاں محض ان کی بھی شخصی و علمی سوانح کی تفصیلوں کا اعادہ غیر ضروری ہوگا۔ چنانچہ زیر نظر باب کو متعلقہ حضرات کے ساتھ للولال جی کوی کی باہمی ادبی استمداد کے مختصر مفید احوال تک محدود رکھا گیا ہے۔ للولال جی کوی کے ہم شعبہ ہندی اسکالرز اور ان کے کارناموں کا تعارف اختصار کے ساتھ اس غرض سے کیا جارہا ہے کہ یہ امر بخوبی روشن ہو سکے کہ ان ہندی داں علما۔ کی کارگزاری کے بالمقابل تنہا للولال جی کوی ایسے فرد فرید کا مجموعی کارنامہ کس درجہ امتیازات کا مالک اور ان کے انفرادی کمالات کا مظہر ہے۔ اردو مترجمین کے ساتھ للولال جی کوی کے باہمی عملی تعلق کو فرداً فرداً بیان کیا گیا ہے البتہ آیندہ ابواب میں وِلا کے اردو اور للولال جی کوی کے اپنے ہندی ترجمہ "بیتال پچیسی" پر الگ ذیلی عنوان سے اپنا نقطۂ نگہ سامنے رکھنے کی جسارت کی گئی ہے۔ یہاں للولال جی کوی کے ہم شعبہ رفیق کار ہندی داں افاضل پر تعارفی سطریں ایک ساتھ تحریر کی گئی ہیں تاکہ ایک مجموعی منظر سامنے آسکے۔ انگریز ممدوحین اور محسنوں کو شریک تذکرہ رکھنے کے لیے ایک ذیلی سرخی قایم کی گئی ہے البتہ ایسٹ وِک کی خصوصی حیثیت کی بنا۔ پر یہ جو "للولال جی کوی: ایک ادبی سوانح" کے

راقم کے اپنے ہاں موجود واحد راست ماخذ (ایسٹ وِک ایڈیشن: پریم ساگر) کی وجہ سے حاصل ہے اس کے تذکرے کو دوسرے سب انگریزوں پر ممتاز رکھا گیا ہے۔ ایسٹ وِک چوں کہ سرے سے للولال جی کوی نیز فورٹ ولیم کالج میں متعین انگریز تدریسی و انتظامی عملے کے معاصروں میں نہ تھا اس لیے اس کے حالات اس ادارے کی ان تواریخ میں مذکور نہیں ہیں اور اسی لیے خاص طور پر اس کے سوانح کی جستجو کی گئی ہے۔ ایسٹ وِک کے احوال کے ہمراہ اس کے ہیلی بری کالج پر بھی متصلہ اطلاعات کو "پریم ساگر" کے باب میں جمع کر دیا گیا ہے۔

اس حصۂ کتاب سے مقصود یہی ہے کہ للولال جی کوی کی قلمی تصویر میں وہ سارے پس منظری رنگ بھرے جا سکیں جو ان کے ادبی خدوخال کو صحیح تر روپ دیں اور یہ اندازہ ہو کہ ان کے اپنے عصری تناظر میں وہ کس قدر بلند و بالا شخصیت کے مالک تھے۔ للولال جی کوی نے جس طرح جہدِ مسلسل کو اپنا شعار بنایا اور تخلیقی عمل میں بلا تکان مسلسل مصروف رہے اسی کو حقیقتاً ان کے طرزِ زیست کی حیثیت حاصل تھی۔ گویا ان کا طریقۂ زندگی علمی فیض رسانی سے عبارت تھا جس کے سوا۔ انہیں اس دنیا کے مکروہات سے شاید ہی کبھی کوئی تعلق رہا ہو۔ للولال جی کوی کی انتہائی افادی قلمی خدمات ہی ان کے لیے اصل مال و دولت دنیا کا درجہ رکھتی ہیں جن کے باعث انہیں وہ رتبہ و مقام مل گیا ہے جو ان کے ہم عصر ہندی علما۔ و افاضل نہیں پا سکے۔ ان کے کارناموں کے مداح و معترف تمام تر اردو مورخین و محققین اور تذکرہ و جائزہ نگار مصنفین رہے ہیں، مگر للولال جی کوی کی ادبی زندگی کا یہ ایک بڑا عجیب اور افسوس ناک پہلو ہے کہ خود ہندی ادبا۔ ان کے تئیں قدر شناسی کا ویسا مظاہرہ نہ کر سکے جو ان کا حق ہے۔ اس کا علم اور احساس فورٹ ولیم کالج کی حالیہ تحقیقی تواریخ سے ہوتا ہے کہ کالج اور ہندی ادبیات کے جدید مورخوں اور تجزیہ نگاروں نے للو لال جی کوی کے کارناموں اور نتیجتاً ان کے مرتبے سے اغماض برتا ہے۔

ہندی داں رُفقائے شعبہ

للولال جی کوی کے شعبے کے ہندی داں رفقائے کار کے تذکرے سے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ پروفیسر جاوید نہال کا یہ تاثر واقعاتی لحاظ سے ترمیم طلب ہے کہ "للو

لال جی کوی کب فورٹ ولیم کالج کے شعبہ بھاکا کے میر منشی تھے" (ص ۱۶۹) معلومہ کوایف کے مطابق بھاکھا در کنار اردو اور ہندی کے بھی علاحدہ کوئی شعبے کالج میں نہیں واقع ہوئے تھے چناں چہ للولال جی کوی اور دوسرے سبھی اردو ہندی افاضل شعبۂ ہندوستانی کے اراکین تھے۔ دیگر یہ کہ للولال جی کوی بھاکھا کے "میر منشی" نہیں تھا اور عہدہ دارانہ ترقی انہیں صرف منشی کے درجہ تک حاصل ہوسکی جس کی وضاحت ان کے انتقال کے قریب ۲۵ برس بعد شایع شدہ "پریم ساگر" کے ایسٹ وِک کے ترجمے اور ایڈیشن دونوں کی سند پر "حالات زندگی" کے ضمن میں کی گئی ہے۔ جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا گیا ہے للولال جی کوی کی اصل ترقی ان کی علمی و قلمی خدمات کی بنا پر رہی ہے جس میں وہ پروفیسر کے عہدوں پر فایز اسکالروں سے بھی عظیم و بزرگ شخصیت ثابت ہوتے۔ سطور ہٰذا سے بھی عیاں ہوگا کہ للولال جی کوی اپنے کم تر عہدے سے قطع نظر اپنے علم و فضل میں یقیناً ایک فایز اور برگزیدہ ہستی تھے۔ کم تر عہدے پر ان کی تعیناتی اور اعلیٰ منصب تک نارسائی للولال جی کوی کی ناقدری کا باعث رہی ہیں۔

شعبۂ ہندوستانی میں للولال جی کوی کے ہندی داں رفیقوں میں سب سے پہلے سدل مسر کا نام آتا ہے جیسا کہ پروفیسر سید محمد اور بعد کے مصنفوں کے گزشتہ اقتباسات سے ظاہر ہے۔ سدل مشر بھی بھاکھا منشی تھے جن کا مختصر حال ڈاکٹر سمیع اللہ نے صفحات ۱۴۰ تا ۱۴۲ اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے بہ صفحات ۱۵۹ و ۱۶۰ بیان کیا ہے۔ ثانی الذکر محقق نے سدل مشر کے ترجمہ "چندراوتی" کو ص ۴۲۶ تا ۴۴۸ اور "رام چرت" کو ص ۵۰۳ و ۵۰۴ پر متعارف کرایا ہے۔ معلومات کی رو سے سدل مشر کا کام ان ہی دو تراجم موسومہ "چندراوتی" ماخوذ از "ناسکیت اوپکھیان" اور "رام چرت" مبنی بر "ادھیاتم رامایَن" تک محدود ہے جو بالترتیب ۱۸۰۳ء اور ۱۸۰۶ء میں ہوتے۔ سدل مشر کا دوسرا کام بھی "نقلیات لقمانی" کے مترجمین کے گروہ میں ان کی موجودگی اور "ہندی فارسی لغت" نامی تالیف سے زیادہ نہیں، آخرالذکر غالباً ایک اہم منصوبہ تھا مگر بہ قول ڈاکٹر عبیدہ بیگم "مزید تفصیلات دستیاب نہیں" (ص ۴۲۸) یہ بات اہم ہے کہ مولوی سید محمد نیز ان کے بعد علامہ نیاز فتحپوری اور پروفیسر حبیب اللہ غضنفر نے للولال جی کوی کے ہم راہ بہ خصوصیت سدل مشر کو ہی نشان زد کیا جن کی کل کائنات یہ تھی۔

ڈاکٹر سمیع اللہ نے ان "پنڈت سدل مشر" کے علاوہ "منشیوں کو ہندی پڑھانے کے لیے سیتارام کا تقرر" بہ صفحہ ۶۹ بیان کیا ہے لیکن سیتارام سے کوئی کتاب نہیں منسوب کی ہے، نیز بہ صفحہ ۵۰ "مہانند پنڈت ناگری خوش نویس" کو بھی شعبۂ ہندوستانی کے ملازمین کے ساتھ درج فہرست کیا ہے۔ بہ صفحہ ۱۲۶ تارنی چرن متر میر منشی شعبۂ ہندوستانی کی ایک نصابی کتاب ہندی "گولا دھیائے" کا ذکر بھی ہے جو درجۂ پنجم کے لیے تھی۔ تارنی چرن متر کی سنسکرت سے بالراست آسان اردو میں مترجمہ "پرش پریکشا" نامی ہندو اخلاقیات کی کتاب کو ڈاکٹر سمیع اللہ نیز پروفیسر جاوید نہال اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے شامل تذکرہ کیا ہے اور موخرالذکر نے ایک ناگری اقتباس بھی ص۵۰۵ پر درج کیا ہے۔ صاحبۂ موصوفہ نے شعبۂ ہندوستانی کے ہی ایک اور اسکالر کندن لال اور ان کی واحد تالیف "کلا کام" کا بھی تذکرہ ص۱۹۴ پر کیا ہے جس کی نوعیت کا علم نہیں ہوتا ہے گویہ کوئی ہندی مثنوی ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ ایک ہم نام اردو مثنوی "کام کلا" مصنفہ اکرام احمد ضیغم مصنف "مثنوی چندن" مذکورہ بہ سلسلہ "ثلاثہ غسالہ" (حصۂ اردو) سے ہوتا ہے۔

مذکورہ سبھی حضرات اور کتب کے علاوہ چند اور اسکالروں کا ہندی ہی کے لیے تقرر عمل میں آیا تھا جنھوں نے تصنیفی و تالیفی کام کیے لیکن نہ تو ان صاحبان کی اور نہ ہی ان کے کاموں کی تفصیلات سامنے ہیں۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے ہندوستانی شعبے میں ان تقرریوں کی نشان دہی کی ہے جب کہ یہ نام کسی اور ماخذ میں درج نہیں ہیں۔ "شعبے میں ہندوستانی کے ساتھ ساتھ بھاکھا کی بھی تعلیم دی جاتی تھی چناں چہ بھاکھا کے مشہور منشی سدل مشر اور للولال جی کوی کے ساتھ جن دیگر ہندی پنڈتوں یا ہندی منشیوں کا تقرر عمل میں آیا ان میں ایک سُندر پنڈت ہیں، یہ ناگری خوش نویس تھے، ۱۸۱۱ء میں لوجن رام پنڈت کا تقرر ہوا، اندریشور پنڈت کا تقرر ستمبر ۱۸۰۱ء میں ہوا تھا، نرسنگھ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۲۱ء تک ملازم رہے۔ گنگا پرشاد شکلا ۱۸۲۳ء سے ۱۸۲۷ء تک اور خیالی رام ۱۸۲۷ء سے ۱۸۲۹ء تک شعبے سے وابستہ رہے۔ ان تمام پنڈتوں نے وقتاً فوقتاً شعبے سے وابستہ پروفیسروں کی ماتحتی میں طلبا کی مشق کے لیے ہندی میں کتابیں ترتیب دیں یا تالیف کیں، اس کے علاوہ طلبا کو امتحانات کی تیاری میں بھی مدد دیتے تھے۔ ولیم پرایس کے بعد ۱۸۳۱ء ہی سے شعبۂ ہندوستانی میں پروفیسر کا عہدہ ختم ہو گیا لیکن طلبا۔ شعبے سے وابستہ

چند منشیوں اور پنڈتوں سے پہلے کی طرح تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس مدت میں تصنیف وتالیف کا کوئی کام سامنے نہیں آیا۔" (ص ۶۰/۶۱) ڈاکٹر عابدہ بیگم نے یہ سب اطلاعات تھامس روبک کی "انلس" اور ڈاکٹر شاردا دیوی ودیاالنکار کے تھیسس سے اخذ کی ہیں جب کہ شعبۂ ہندوستانی میں بہ طور خاص ہندی داں علما کے تقرر کی تفصیل پروفیسر وارشنے کی "آدھونک ہندی ساہتیہ" میں بھی جمع ہوگئی ہے۔

ان مختصرات سے بھرپور طور پر یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ شعبۂ ہندوستانی علی الخصوص ہندی داں اساتذہ وادبا۔ اور ہندی مصنفین میں للولال جی کوی کی ٹکر کی کسی شخصیت کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ تصنیف وتالیف اور تراجم کی ہمہ جہت کارکردگی میں متذکرہ سارے افاضل کے درمیان للولال جی کوی کے مدمقابل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا علمی فضائل اور تخلیقی کارناموں کے اعتبار سے بنگلا اسکالر ایشور چندر ودیا ساگر ایک بڑی شخصیت ثابت ہوتے لیکن وہ آخری دور کے ہیں ________ صرف تارنی چرن متر کے پس منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علمی اعتبار سے پلے کی شخصیت تھے مگر للولال جی کوی ایک ہفت زبان اسکالر ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے اپنی ہمہ دانی کا فیضان بھی عام کیا۔ یہ ایک یقینی امر ہے کہ للولال جی کوی علمی پس منظر کے پہلو بہ پہلو عملی پیش منظر کے امتزاجات ومؤثرات کے باعث ادبی تواریخ میں ہمیشہ ہی زندہ رہیں گے۔ للولال جی کوی کو نہ صرف شہرۂ عام کے دربار میں اچھی خاصی جگہ ملی بلکہ بقائے دوام کے دربار میں بھی انہیں اعلیٰ مرتبہ نصیب ہوا۔ یہی اصل چیز ہے اور ہندی معاصروں میں اس اعتبار سے ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔

انگریز اساتذہ وافسران

مختلف آثار سے مظہر ہے کہ للولال جی کوی نے ہر کتاب میں چند انگریزوں کا بڑے احترام کے ساتھ ذکر ضروری خیال کیا جن میں سے کچھ تو انتظامیہ کے ارکان اور سرکاری عمّال تھے جب کہ باقی بیک وقت افسر اور استاد بھی تھے۔ ایسے سب انگریزوں کی فہرست سازی کسی طوالت کی موجب نہیں ہے:

"پریم ساگر": (بہ مطابق زیر نگہ ایسٹ وِک ایڈیشن) مارکویس ویلزلی گورنر

جنرل جان گل کرسٹ کل برٹ لارڈ منٹو، جان ولیمس ٹیلر، ڈاکٹر ولیم ہنٹر:

"لطایف ہندی": لارڈ منٹو گورنر جنرل جان ولیم ٹیلر ابراہم لایف (بروایت ڈاکٹر جاوید نہال صہ ۱۶۹ جس میں درمیان سے چند سطور محذوف ہیں اور آخری نام ابراہام لاکٹ کا ہے)

"راج نیتی": مارکویس ویلزلی گورنر جنرل جان گل کرسٹ گل برٹ لارڈ منٹو، جان ولیم ٹیلر، ڈاکٹر ولیم ہنٹر، ابراہام لاکٹ (بحوالہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم صہ ۱۴۷-۱۴۸)

ان لوگوں میں ویلزلی اور منٹو سے یہاں کوئی غرض نہیں کہ کالج کے ادبا نے رسماً ہر گورنر جنرل کا نام آداب فایقہ کے ساتھ لینا ضروری سمجھا۔ البتہ فورٹ ولیم کالج کے قیام و استحکام کی سرکاری کوششوں کو ویلزلی کی جو ذاتی دل چسپی بلکہ سرپرستی حاصل تھی اس کی منظر کشی مراسلت اور نجی خطوط کے اقتباسات سمیت کالج کے مورخین کرچکے ہیں۔ کالج کی ممتاز ترین اور فعال ترین شخصیت گل کرسٹ پر مولوی سید محمد کی ابتدائی تصنیف کے بعد عتیق صدیقی کی تاریخی ریسرچ کے علاوہ بھی دوسرے کئی مصنفوں نے خاصا کام کیا ہے جس سے تفصیلات کا عادہ غیر ضروری رہے گا۔ باقی تین نام ہیں ٹیلر، ہنٹر اور لاکٹ کے جن کے علاوہ للولال جی کوی کا ایک اور محسن تھا ولیم پرایس، ان سب کی سوانح مفصل طور پر کسی ایک مطبوعات میں موجود ہیں۔ ان کی طرف یہاں صرف اشارتی کلمات پر اکتفا مناسب رہے گا۔ کالج کی تاریخ پر بھی متعلقہ کتب سے خلاصۂ معلومات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہ ہمارے ادبی مورخین کا بڑا مقبول موضوع ہے اور للولال جی کوی کے مجموعی کارنامہ کو ادارے سے اتنی تحریک نہیں ملی جتنی ان ذمہ دارانِ ادارہ کی ذات سے ملی جو ان کے ہمدرد بھی تھے۔

ولیم پرایس کا بہ ظاہر للولال جی کوی کے ہاں کوئی تحسینی ذکر درکنار تذکرہ بھی نہیں ملتا ہے مگر ان کی ادبی سوانح میں یہ بڑے اہم نام کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم سے روایت ہے کہ "ولیم پرایس نے "سبھا بلاس" کو ترتیب دے کر ۱۸۲۸ میں کلکتہ سے شایع کیا تھا" (صہ ۶۰) جب کہ بہ قول مولوی سید محمد "سبھا بلاس" کا ہی ۱۸۲۹ میں کالج کے ایک انگریز پروفیسر کپتان ایم پرایس نے ایک اور ایڈیشن چھاپا تھا"۔ (صہ ۲۶۶) اور ظاہراً یہ کپتان ایم پرایس وہی ولیم پرایس ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے انکشافات کے مطابق

"کھڑی بولی یا ہندوی میں 'پریم ساگر' کا لغت بھی ولیم پرایس نے ترتیب دیا تھا، یہ لغت ۱۸۱۴ء میں ہندوستانی پریس سے شایع ہوا" (ص ۲۶) نیز یہ کہ "ولیم پریس نے للولال جی کوی کی "چھتر سال" کی ترتیب کی تھی جو ۱۸۲۱ء میں کلکتہ سے شایع ہوئی" (ص ۶۳) یہ کیپٹن ولیم پرایس وہی ہے جس کا نام اردو ہندی تنازعے کی ابتدا۔ نیز اس میں اضافے اور شدت کی رودادوں میں بہ خصوصیت آتا ہے حتیٰ کہ کالج میں ان کی تقرری و تبدیلی پر مشتمل مختصر احوال بھی اس تذکرے سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ چناں چہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا تاثر ہے کہ "ولیم پرایس نے اپنے عہد میں ہندوستانی اور ہندی کو الگ الگ زبانوں میں تقسیم کرنے کی انتہائی کوششیں کیں اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ وہ خود کو ہندی پروفیسر لکھتے تھے حالاں کہ کالج کونسل کے ذمہ داران انہیں ہندوستانی پروفیسر ہی کہتے رہے پرایس کو سنسکرت اور برج بھاشا سے خصوصی دل چسپی تھی" (ص ۱۰۵ تا ۱۰۶) ڈاکٹر سمیع اللہ نے ولیم پرایس کا تذکرہ مفسنین میں بہ صفحات ۱۰۶ و ۱۱۰ نیز بہ عنوان "ولیم پرایس ہندوستانی شعبے کے صدر اور ریڈر و فیسر" ص ۶۵/۶۶ پر اردو ہندی تنازعے کا عروج ص ۶۷ تا ۶۹ پر کیا ہے' آخر الذکر سے اقتباسات آیندہ ایک موقع پر آرہے ہیں۔

ولیم ہنٹر غالباً مختصر ترین عرصے کے لیے ۱۸۰۵ء میں بہ طور نایب پروفیسر شعبۂ ہندوستانی متعین رہے جس کے قبل و بعد بھی وہ کئی برس کالج کی مجلس کے معتمد رہے۔ انہوں نے ایک ہندوستانی انگریزی لغت کی تدوین کے لیے للولال جی کوی کے ہم راہ تارنی چرن متر کی بھی اعانت حاصل کی اور پھر ۱۸۱۱ء میں جزایر شرق الہند یعنی موجودہ انڈونیشیا کا سفر اختیار کرنے کے موقع پر "ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے مطابق "انہوں نے تھامس روبک کو اس کام کا نگراں بنایا اور تارنی چرن متر اور للولال جی کوی کی خدمات کو برقرار رکھنے کی سفارش کی لیکن یہ کام مکمل نہ ہو سکا' البتہ ۲۷ نومبر ۱۸۲۰ء کے ایک خط میں ولیم ٹیلر نے ہنٹر کا لغت مکمل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا" (ص ۹۹) کپتان جان ولیم ٹیلر ۱۸۰۸ء میں شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوتے اور ۱۸۲۳ء تک فایز رہے' ان کی تحریری کارکردگی اور للولال جی کوی کے ان سے مراسم کے بھی بارے میں کوئی تفصیل سامنے نہیں آسکی ہے۔ مگر للولال جی کوی نے محولۂ بالا اپنی تینوں کتب میں ٹیلر کا نام لیا ہے جس سے خیال یہی ہوتا ہے کہ ان کے باہمی روابط میں دل بستگی اور حوصلہ افزائی کا عمل دخل ضرور رہا ہوگا۔

ولیم ٹیلر کا بھی ہندی اردو تنازعے کی شروعات سے خاص تعلق رہا جس کا حال آخری باب میں مذکور ہوگا۔ ابراہام لاکٹ کا کوئی احوال انہیں زیب عنوان کرکے زیرا کتساب تحقیقات میں درج نہیں ہے اور صرف ڈاکٹر سمیع اللہ نے بہ صفحہ ۴۳ کالج کونسل کے سکریٹری کی حیثیت سے لاکٹ کا تقرر کی سرخی کے تحت لاکٹ کی مئی ۱۸۱۲ میں مجلس کے معتمد اور کالج کے ممتحن کے بہ طور تعیناتی اور جولائی ۱۸۱۲ میں عرب سے واپسی پر ان عہدوں کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے اس کی آمد بیان کی ہے۔ "کلکتہ کے اردو مطابع" (ص۱۵۱) کے بموجب بھی "اے لاکٹ" ہے جس کی دو میں سے ایک عربی کتاب ۱۸۱۴ میں ہندوستانی پریس سے شایع ہوئی، للولال جی کوی کے اس سے بھی ربط ضبط کا حال نہیں کھلتا ہے لیکن یہ تعلق ان کے لیے ہمت افزائی کا باعث یقیناً رہا ہوگا۔

للولال جی کوی کے محسنوں میں کپتان ولیم ہولنگس کے نام کا اضافہ پروفیسر سید محمد کے حوالے سے ضروری ہے کہ یہ بہ قول ممدوح "پریم ساگر" کے انگریزی ایڈیشن ۱۸۴۸ کے مترجم تھے۔ زندگی میں للولال جی کوی کا جن انگریزوں سے رابطہ واستفاضہ کا سلسلہ رہا ان کے علاوہ بھی ان کی ادبی سوانح کی حد تک ان پہ چند اور انگریزوں کے احسانات رہے جن کا کوئی ذکر ظاہر ہے کہ للولال جی کوی کے ہاں نہیں مل سکتا۔ بس مرگ ان پر بہت بڑا کام ایڈورڈ ایسٹ وک نے کیا جو "پریم ساگر" کی ہی تصحیح و طباعت اور انگریزی میں ادبی سطح پر ان کی منتقلی و ترجمانی کا تھا۔ ممکن ہے کہ اس مختصر سی فہرس میں ضروری تلاش و تفحص کے بعد کم از کم چند ناموں کا اور اضافہ ہوجاتے نیز اس تعلق سے اور معلومات بھی جمع ہوجائیں۔ للولال جی کوی کے محسنین میں ان سب اسکالروں کو خاص طور پر شمار کرنا بڑا ضروری ہے جنھوں نے ان کی کتب کے مصحح ایڈیشنوں کی تیاری و پیش کش کا دقیقہ رس کام دیدہ ریزی سے سرانجام دیا۔ اس غرض سے ان سبھی کتابوں کے اصل اور مترجمہ متون کی تمام تر اشاعتوں کے باقاعدہ جائزے کی ضرورت لاحق ہوگی۔ ہندوستان میں آزادی سے قبل تک جو زیادہ تر ایڈیشن طبع ہوئے ان کے سلسلے میں معدودے چند مستثنیات کے سوا باریک بینی اور دقت پسندی کے ساتھ تصحیح و اصلاح متن کے ذمہ دار اسکالروں کی وابستگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے البتہ برطانیہ نیز یورپ اور خود ہندوستان میں مغربی علماء کے تیار کردہ ایڈیشنوں اور

تراجم کے ساتھ مصححین و مترجمین کی کم تعداد میں سہی اہم شخصیتیں منسلک رہیں جن کی خدمات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ غلط نہ ہوگا اگر ان میں ممتاز ترین نام ایڈورڈ بی ایسٹ وک کا قرار دیا جائے جو "پریم ساگر" کا مرتب بھی تھا اور مترجم بھی۔

ایڈورڈ بیک ہاوس ایسٹ وک (۱۸۸۳/۱۸۱۴) ولد رابرٹ ولیم ایسٹ وک (۱۷۷۲ء ۱۸۶۵) مرتب و مصحح نیز مترجم "پریم ساگر" (ہرٹفورڈ ۱۸۵۱) نے یہ دونوں کام ہیلی بری کالج سے اپنی وابستگی (۱۸۴۵/۱۸۵۹) کے دوران سرانجام دیے۔ فورٹ ولیم کالج پر انتظامی و مالی اسباب سے مجلس نظمائے کمپنی کے عتاب کے بعد برطانیہ میں تقریباً ان ہی اغراض و ضروریات کے تحت بہ مقام ہیلی بری (Hailey Bury) قایم کردہ کالج کا کچھ نہ کچھ ذکر تازہ تحقیقات میں مل جاتا ہے لیکن ان میں کالج کے وابستگان کے حالات در کنار نام تک درج نہیں ہو سکے ہیں۔ ایسٹ وک کا اپنا احوال برٹش لائبریری کے جناب سلیم الدین قریشی کے عطا کردہ دو مختصر تذکروں مشمولہ "ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی" (ج ۲ آکسفورڈ ۱۹۶۴) اور سی ای بک لینڈ کی "ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی" (لندن ۱۹۰۶) سے "پریم ساگر" کے باب میں خلاصہ کیا جا رہا ہے۔ اس مناسبت سے ہیلی بری کالج کی کچھ تفصیل بھی پیش ہوگی۔

للولال جی کوی اور مظہر علی خاں ولا

ولا کے دو تراجم "مادھونل کام کندلا" اور بیتال پچیسی کے متعلق مشہور یہ ہے کہ انہیں اردو میں منتقل کرانے کی غرض سے مظہر علی خاں ولا کی مدد کے لیے للولال جی کوی کو "خاصاً" مامور کیا گیا۔ تاہم خود ولا نے اول الذکر کے دیباچے میں سرے سے للولال جی کی کسی رہبری یا امداد کا حوالہ نہیں دیا ہے جو بہر حال تعجب خیز امر ہے کیوں کہ للولال جی کوی کی ناگزیر ادبی استمداد بلکہ رہ نمائی کے بغیر ولا برج زبان یا تحریر کو اردو کا قالب دے ہی نہیں سکتے تھے۔" احقر الناس مظہر علی خاں متخلص بہ ولا بہ قصہ مادھونل اور کام کندلا کا کہ زبان برج میں موتی رام کبیشور نے کہا ہے، بہ موجب فرمایش جناب گل کرسٹ صاحب دام اقبالہ کے بہ محاورۂ زبانِ اردو بیان کرتا ہے۔" (ص ۱۹) فاضل مرتب کتاب ڈاکٹر عبادت بریلوی اسی جگہ حواشی میں دو مواقع پر اس طرح اشارہ کناں ہیں: "مادھونل اور کام کندلا

کی یہ کہانی جس کو مظہر علی خاں وِلا نے اردو میں لکھا دراصل موتی رام کبیشور کی برج بھاشا
میں لکھی ہوئی کہانی سے ماخوذ ہے۔ وِلا خود برج بھاشا نہیں جانتے تھے اس لیے ڈاکٹر
گل کرسٹ نے اس کو پڑھ کر سنانے اور سمجھانے کا کام للولال جی کوی کے سپرد کیا تھا۔
چنانچہ وہ اس کہانی کو پڑھ کر سناتے جاتے تھے اور مظہر علی خاں وِلا اس کو اردو میں
لکھتے جاتے تھے۔" (ص ۱۹) نیز یہ کہ "اردو میں یہ کہانی پہلی بار ۱۸۰۵ء میں مظہر علی خاں وِلا نے
للولال جی کوی کی مدد سے لکھی۔ اس کا صرف ایک قلمی نسخہ لندن میں ہے۔" (ایضاً)

دراصل ڈاکٹر عبادت بریلوی کے انکشافات کا تحقیقی ماخذ مظہر علی خاں ولا کا اپنا
ایک اور بیان ہے جو پروفیسر ممدوح نے اپنے فاضلانہ مقدمہ کتاب میں پیش فرمایا
ہے۔ یہ صفحہ ۱۶ ولا کی منشور اردو کتب ۱) ہفت گلشن " ۲) " مادھونل اور کام کندلا ۳) بیتال
پچیسی ۴) " تاریخ شیرشاہی " اور ۵) جہانگیر نامہ " کو گنانے کے بعد محقق موصوف نے
آخرالذکر کے تعارف میں ارشاد کیا ہے: " جہاں گیر نامہ، فارسی کتاب 'تزک جہانگیری'
کے ایک حصے کا ایک ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ابھی تک شایع نہیں ہوئی اور بعض لکھنے والوں
کا خیال ہے کہ یہ نایاب ہے۔ راقم کو اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ملا ہے لیکن یہ ناقص
ہے" (ص ۱۶) پروفیسر عبادت بریلوی نے یہ صفحات ۱۲ تا ۱۵ ترجمہ " جہاں گیر نامہ " سے ولا
کی خود نوشت اقتباس کی ہے لیکن چوں کہ ان کا دریافت کیا ہوا برٹش میوزیم (اب
برٹش لائبریری) کا مخطوطہ ناقص ہے اس لیے انہوں نے یہ سطور ہندوستانی اسکالر
محمد عتیق صدیقی صاحب کی تحقیق "گل کرسٹ اور اس کا عہد" کے ص ۳۰۶ سے اخذ کی ہیں۔
اور وِلا کا یہ بیان ان میں شامل ہے: " جان گل کرسٹ صاحب کی خدمت میں جو زبان
ہندی کے مدرس تھے متعین ہوا اور صاحب ممدوح کے فرمانے سے " مادھونل " اور
" بیتال پچیسی " سے جو برج بھاشا میں ہیں ان کا ترجمہ للولال کب کی مدد سے اس طرح کیا کہ
بیشتر برج کی بولی " بیتال پچیسی " میں رہنے دی "۔ للولال جی کوی کی ادبی سوانح کی خصوصی
نسبت سے یہاں خود ان کی آپ بیتی کے متعلقہ کلمات کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی تازہ تر تحقیق کی روشنی میں اس موقع پر یہ اضافہ ناگزیر ہے کہ
مظہر علی خاں وِلا کے اس ترجمہ " جہاں گیر نامہ " کے متبادل و معروف عنوان " جہاں گیر شاہی "
سے ایک خطی نسخہ کلکتہ کے ذخایر میں محفوظ ہے، چنانچہ موصوفہ کے مطابق: " وِلا 'جہاں گیر شاہی'

کے دیباچے میں واضح طور سے لکھتے ہیں: صاحب ممدوح (گل کرسٹ) کے فرمانے سے ''مادھونل'' اور ''بیتال پچیسی'' جو زبان برج میں ان کا ترجمہ للولال جی کب کی مدد سے اس طرح کیا کہ بیشتر برج کی بولی 'بیتال پچیسی' میں رہنے دی کہ مرضی صاحب مدرس کی یوں ہی تھی''۔ (ص ۲۹) بحوالہ: دیباچہ جہاں گیر شاہی'' قلمی نسخہ مظہر علی خاں ولا ورق سے) محمد عتیق صدیقی کی کتاب سے ولا کی'' جہاں گیر شاہی'' کا یہ طویل ابتدایہ مرتب 'بیتال پچیسی'' ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے بھی بہ طور ضمیمہ ۱ ۱۴۲ تا ۱۴۴ شریک کیا ہے۔

محض بر سبیل تذکرہ ایک ایسے نکتے کا حوالہ بھی ضروری ہے جس پر ڈاکٹر پرکاش چند مونس کو اختلاف ہے۔ محقق ممدوح کا قول ہے کہ ''ولا کی مادھونل اور کام کندلا' عالم کی ۱۹۹۱ھ بہ مطابق ۱۴۸۳ء میں مصنفہ اسی نام کی اودھی کتاب کا ترجمہ ہے' موتی رام کبیشور کی برج زبان میں لکھی ہوئی کتاب کا نہیں نہ کسی موتی رام نے مادھونل اور کام کندلا' نامی کوئی کتاب لکھی''۔[1] اس مسئلے پر متعلقہ افاضل کی تحقیقی توجہ فرمائی کی ضرورت ہے تاکہ آیندہ ادبی تواریخ اور تذکروں میں یہ معاملہ معلق نہ رہنے پائے۔

للولال جی کوی اور کاظم علی جوان

مرزا کاظم علی جوان کے ساتھ بھی للولال جی کوی کا نام بہ طور معاونِ تراجم آتا ہے چنانچہ ''شکنتلا'' میں دو مقامات پر مرزا کاظم علی جوان کے یہ الفاظ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر اسلم قریشی کے ایڈیشنوں میں یکساں ہیں: ''انھوں (گل کرسٹ) نے نہایت مہربانی و الطاف سے ارشاد فرمایا کہ 'شکنتلا' ناٹک کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کرو اور للولال جی کب کو حکم کیا کہ بلاناغہ لکھایا کرے''۔ نیز یہ کہ: ''ان دنوں میں کہ ۱۸۰۰ء میں اور احقر قرآن شریف کے ہندی ترجمے کا محاورہ درست کرتا ہے۔ صاحب ممدوح (گل کرسٹ) نے فرمایا ہم چاہتے ہیں کہ اب اس کتاب کو از سرِ نو چھپوا دیں نظر ثانی لازم ہے۔ اور اس کب کو فرمایا کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہوئی ہو نہ رہے۔ چنانچہ ہم ان کا فرمانا بجا لاتے''۔ جوان کے اپنے بیانات سے جو طبع اسلم قریشی

---

[1] ڈاکٹر پرکاش چند مونس: ''اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر'' الہ آباد ص ۲۹۶ منقولہ ڈاکٹر شہناز انجم ص ۱۵۳

صلا اور عبادت بریلوی ایڈیشن ص ۳۳ سے منقول ہیں یہ امر عیاں ہو جاتا ہے کہ کاظم علی بھی وِلا کی طرح بھاکھا اور لپی دونوں سے کورے تھے جس کی بنا پر للولال جی کوی کو جو برج بھاشا کے اسکالر تھے جوان کی ادبی معاونت کے لیے متعین کیا گیا تھا اور یوں دونوں سے منسوب دمشہور تراجم معرض نگارش میں آتے۔ تعجب خیز اور تاسف انگیز امر یہ ہے کہ جوان نے بھی اردو "سنگھاسن بتیسی" کے سبب تالیف کتاب' میں حوالہ تک نہیں دیا کہ اس کے اصل مترجم للولال جی کوی تھے جن کا مترجمہ متن جوان نے ایڈٹ کر کے خود سے منسوب کیا۔

اسی طرح وِلا کی مترجمہ کتب "بیتال پچیسی" اور "مادھونل کام کنڈلا" نیز جوان کے ترجمہ "شکنتلا" تینوں میں ہی للولال جی کوی کی ذاتی مدد بہم پہنچانے کا معاملہ بالکل صاف ہے جس کے لیے موخر الذکر کی اس ادبی سوانح کی مناسبت سے ان کا منقولہ گذشتہ قول بھی راجح ہو سکتا ہے۔ البتہ "سنگھاسن بتیسی" کے اردو ترجمے سے جوان اور للولال جی کوی کے تعلق کی حقیقت واصلیت بوجوہ کچھ الجھ گئی ہے اس خصوص میں ضروری بحث ایک آیندہ باب میں پیش کی جا رہی ہے جہاں یہ امر قطعیت سے طے پا جائے گا اگرچہ اس بارۂ خاص میں بھی للولال جی کوی کا قول فیصل موجود ہے جو قابلِ ترجیح ہے۔

کارہائے نمایاں

للولال جی کوی کی منظوم و منثور تخلیقات میں سے "بیتال پچیسی" اور "لال چندریکا" نیز "پریم ساگر" اور راردو" سنگھاسن بتیسی" کے سوا بقیہ سب کتب کا فرداً فرداً تعارف ہدیۂ ناظرین ہے۔ مذکورہ چاروں مطبوعات کے تعارفی جائزوں نیز متعلقہ مباحث و معلومات کو بہ طور علاحدہ مستقل ابواب اس ادبی سوانح کے آیندہ اوراق میں جمع کیا گیا ہے۔ اس کا بہر حال افسوس ہے کہ ماسوا "پریم ساگر" للولال جی کوی کے ان سب غیر معمولی کارناموں کے مخطوطات درکنار مطبوعہ متون تک رسائی نہ ہو سکنے کے باعث یہ حقیر سطور ان میں سے کسی ایک کارنامے کو بھی حقیقی طور پر متعارف کرانے کا حق شاید ہی ادا کر سکیں۔ البتہ راقم خواہاں و کوشاں رہا ہے کہ للولال جی کوی کی شخصیت کی طرح ان کی عظیم الشان دماغی فتوحات پر دستیاب وسایل کی مدد سے ملنے والی تمام تر معلومات کی گردآوری میں کوئی کوتاہی نہ ہونے پائے تاکہ للولال جی کوی کی قلمی تصویر کا ایک مجمل سہی ممکنہ حد تک مکمل خاکہ تیار ہو سکے۔ اس میں معروضات اور اقتباسات کی تکرار سے چند جگہوں پر واسطہ پڑے گا لیکن سیاق و سباق کی ضروریات کے ماتحت اور بامر مجبوری اعادہ مباحث کی صورت بعض مقامات پر اور ہو گئی ہے۔ للولال جی کوی کی ادبی شخصیت کا یہ پہلا جایزہ چوں کہ ایک دور افتادہ طالب علم و ادب کی کوشش کا نتیجہ ہے اس لیے کسی ایک اہم ماخذ کی کمی نے اس خاکے کو بہت سے اصل اور خوب صورت رنگوں سے محروم رکھا ہے۔ اس تصویر میں ابھی کسی ایک نقوش ابھرنے باقی ہیں اور بہت سارے رنگین خطوط کی بھی ضرورت ہے تاکہ یہ للولال جی کوی کی صورت گری حقیقی مکمل اور اصل حالت میں کر سکیں۔ للولال جی کوی کے اپنے وطن میں ان کی قلمی کشور کشائیوں پر ابھی تک علمی ادبی سطح پر وہ توجہ منعطف نہیں کی جا سکی ہے جس کا استحقاق ان کی وسیع اور عظیم خدمات کو بہر نوع حاصل ہے۔ یہ کام بہ حسن و خوبی ہندوستان میں ہی سرانجام دیا جا سکتا ہے جہاں کے ابھرتے ہوتے جدید اردو ہندی اسکالروں سے اس کی توقعات یقیناً وابستہ کی جائیں گی۔ جیسا کہ شروع کتاب میں عرض ہوا اس غرض

سے آغاز کار کا بیڑا اٹھانے والے یونیورسٹی اسکالر کو دقیقہ رس قسم کا ایک اچھا کھوجی ہونا چاہیے۔ ذوق جستجو کے ہم راہ ایسے محقق کا کلاسیکی ادبیات کی جانچ پرکھ پر کامل عبور نیز ہفت زبانی جیسی صلاحیتوں سے بھی لیس ہونا مساوی طور پر ضروری ہوگا۔ للولال جی کوی کے شاہ کاروں کی دریافت اور تہذیب نو کی ضروریات کے مدنظر نئے ہندوستانی افاضل کا علمی معیار صحت مند بھی ہے اور بڑا امید افزا بھی۔ یہ اس لیے کہ مقتضیات وقت کے ماتحت ان کی لسانی واقفیت کو خاصی اونچی سطح اور غیر معمولی وسعت بلکہ ہمہ دانی سی حاصل ہوگئی ہے جس سے ان کی اسکالرشپ میں بیش از بیش اور گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔ اسی لیے یہ امید ہرگز بے محل نہ ہوگی کہ مستقبل قریب میں کوئی نیا ہندوستانی عالم ضرور اٹھے گا جو للولال جی کوی کے فضل و کمال سے اب تک کی بے اعتنائی کا کفارہ ادا کرنے کا بہر طور اہل ضرور ہوگا۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل! حاشا اگر تمھیں سر سیر وفراغ ہو!!

(۱) راج نیتی" برج نثری ترجمہ ۱۸۵۲ء۔

"راج نیتی" کے سال ترجمہ کے بارے میں ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا انکشاف ہے کہ "راج نیتی" "ہتوپدیش" کا برج بھاشا میں ترجمہ ہے، سنسکرت میں "ہتوپدیش" نرائن پنڈت کی تالیف ہے۔ للولال جی نے گل کرسٹ کے حکم پر سمبت ۱۸۵۹م ۱۸۰۲ء میں "ہتوپدیش" کو برج بھاشا میں منتقل کیا اور "راج نیتی" نام رکھا" (ص۲۲۲)۔ ڈاکٹر سمیع اللہ نے بہ طور ضمیمہ الف ۲ جو فہرست گل کرسٹ کی جانب سے انعامات کے لیے مجوزہ کتب کی درج کی ہے اس میں بہ صفحہ ۱۸۴ "راج نیتی" کو خالص برج بھاشا میں "ہتوپدیش" لکھا ہے، تاہم کتاب کے بارے میں ابتدائی تاثر کچھ اور رہا ہے۔

للولال جی کوی کی تذکرہ نگاری میں پروفیسر سید محمد نے غالباً بھاکھا کے ہندی سے التباس کی بنا پر "راج نیتی" کو ہندی ترجمہ خیال فرمایا تھا: "راج نیتی" للولال کی تالیفات میں یہ کتاب بھی خوب مشہور ہوئی۔ اس میں قصص و حکایات کے پیرایے میں ہندوؤں کے اصول اخلاقیات اور فوجی وغیر فوجی پالیسی اور طرز حکومت وغیرہ مختلف امور پر بحث کی گئی ہے۔ "پریم ساگر" کی طرح اس کی زبان بھی نہایت فصیح ہندی ہے۔ یہ کتاب ابتداً سنسکرت میں نارائن پنڈت نے لکھی تھی۔ "راج نیتی" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۹ء میں کلکتہ سے شایع ہوا۔ بعد میں متعدد ایڈیشن شایع ہوتے۔ ایک عرصے تک یہ کتاب ہندی کے نصاب

میں داخل تھی" (ص۲۶۶) دراصل راج نیتی" برج ترجمہ ہے جب کہ پریم ساگر ہم نام برج کتاب کا ہندی قالب ہے"۔ راج نیتی" کے ذریعے ہت اپدیش" کی برج میں منتقلی کا خیال اس سنسکرت تصنیف کے فارسی نقش" مفرح القلوب" کے اردو قالب" اخلاق ہندی مترجمہ میر بہادر علی حسینی بہ سال ۱۸۰۲ طبع اول کی مذکورہ تاریخ دراصل دوسرے ایڈیشن کا سال اشاعت رہی ہے۔

ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اس برج کتاب کے طبع دوم پر مبنی ملاحظات مفصل تحریر کیے ہیں جس میں بھاکھا کے اقتباسات کو ناگری خط کے علاوہ اردو میں بھی کتابت کروایا گیا ہے اس متن کے سوا ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی اطلاعات میں یہ اہم اشارہ بھی ہے کہ للو لال جی کوی کے اس برج ترجمے کا طبع اول دراصل ۱۸۰۳ء کا رہا ہے: "گل کرسٹ کی ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لیے سفارشی فہرست میں "راج نیتی" مطبوعہ کتابوں کے ذیل میں شامل تھی۔ "راج نیتی" ۱۸۰۹ء میں بھی ہندوستانی پریس سے شایع ہوئی تھی۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں "راج نیتی" کا ناگری رسم الخط میں ۱۸۰۹ء کا مطبوعہ نسخہ محفوظ ہے، اس میں کل ۲۵۴ اوراق ہیں" ص۲۸۴ اس کے معنی یہ ہوتے کہ ۱۸۰۹ کا ایڈیشن "راج نیتی" کا طبع دوم رہا ہے۔ مصنفہ موصوفہ نے برج کی عبارتوں کے ساتھ ساتھ ان کا متن اردو رسم خط میں منتقل کیا ہے، ان اقتباسات سے للو لال جی کوی کے دیباچہ مترجم کی کچھ اطلاعات نیز کتاب کی کہانیوں اور ان کی افادیت کے علاوہ اسلوب نگارش کا بھی علم ہوتا ہے۔

للو لال جی کوی کے اس برج ترجمے کے مشمولات پر ڈاکٹر عبیدہ بیگم یہ قیمتی معلومات فراہم کرتی ہیں: "راج نیتی" کا موضوع اخلاقیات اور ہندوؤں کی جنگی و ملکی پالیسیوں کے رموز و نکات پر مبنی ہے سرورق پر بھی اس کی وضاحت موجود ہے۔ یہ تمام نکات حکایتوں کے پردے میں بیان کیے گئے ہیں"۔ راج نیتی" پانچ ابواب پر مشتمل ہے: اول دوستی کے فواید میں مترلابھ دوم ذکر دوستوں کے اختلافات کا سوہردے بھید کتھا' سوم لڑائی کی کہانی و گرہ کتھا، چہارم صلح کا ذکر سندھی کتھا پنجم لبدھ پرناشں کتھا" (ص۲۸۷) راج نیتی" کی حکایات اور زبان کے بارے میں ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے یہ مختصر مشاہدات اہم ہیں: "راج نیتی" کی حکایتوں کے بیش تر کردار جانور ہیں لیکن اپنی فہم و ذکاوت دانش مندی اور حکمت عملی سے مثالی اور علامتی کردار کا نمونہ پیش کرتے ہیں ـــــ "راج نیتی" برج بھاشا میں ہے کہیں کہیں سنسکرت کے الفاظ عبارت کو بوجھل اور ثقیل بنا دیتے ہیں۔ للو جی نے "راج نیتی"

میں سادہ نگاری کا بھی نمونہ پیش کیا ہے۔" (ص ۴۷۳)

پاکستان میں مجلس ترقیٔ ادب نے اردو کے جن لاتعداد نوادر کو تازہ بہ تازہ ایڈیشنوں کے وسیلے سے نئی زندگی بخشی ان میں فورٹ ولیم کالج کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ مجلس کی کوششوں کے علاوہ کئی پاکستانی محققین اور ناقدین نے بھی نادر ادب پاروں کی تصحیح و اشاعت کے عمل میں انفرادی طور پر خاصا حصہ لیا ہے۔ حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان کے بڑے بڑے اداروں اور ممتاز اسکالروں کی توجہات اردو کیا ہندی اور متعلقہ دیگر السنہ تک کے کلاسیکی شاہ کاروں خاص کر فورٹ ولیم کالج کے گم گشتہ یا نادر و نایاب شہ پاروں کی دریافت و پیش کش کے کام کو حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ ہند قدیم کی ادبیات کے احیائی عمل میں بھارت کے کئی ادارے سرگرم ہیں اور نئے پرانے علماء کے مصحح متون کو مسلسل سامنے لانے میں انہیں کامیابی ہوئی ہے۔ تاہم یہ بڑا ضروری ہے کہ اس پُر جوش مہم کو صرف دھارمک لٹریچر تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ہندی نیز برج بھاشا اودھی وغیرہ کی کلاسیکی ادبیات تک جلد از جلد توسیع دی جائے۔

"راج نیتی" کے بارۂ خاص میں اس اطلاع کا اضافہ دل چسپی اور عبرت سے خالی نہ ہوگا کہ ایک انگریز افسر نے فورٹ ولیم کالج کے چند دوسرے بڑے کارناموں کی طرح اس کا درجہ بھی بڑی رعونت سے گھٹانے کی کوشش کی۔ ۲۳/۹/۱۸۵۴ء کی اس روداد کا علم ہوتے ہی گارساں دی تاسی نے چھٹے خطبے مورخہ ۲/۱۲/۱۸۵۵ء میں اس شخص کا نام لیے بغیر اس بد تہذیبی کی سخت خبر لی' چنانچہ ان الفاظ سے اس کی برہمی ظاہر ہے: "یہ آگے چل کر کہتا ہے "راج نیتی" کے پڑھنے سے دماغ پر وہی اثر ہوتا ہے جو ایک مدہوش شرابی کو دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ کتاب "ہتوپدیش" کا صرف ہندی ترجمہ ہے جس کی فضیلت کا ہر شخص معترف ہے۔" (ج ا ص ۱۹۶)

(۲) "برج بھاشا کے قواعد" اردو نثری تصنیف قبل ۱۸۱۱ء

اس کا انکشاف ڈاکٹر عابدہ بیگم نے تھامس روبک کے فورٹ ولیم کالج کے "اٹلس" کی سند پر کیا ہے اور اتفاقیہ اس کا اندراج شعبۂ لغت و قواعد کے بجائے متفرقات کی ذیل میں ہوا ہے: "۴۹۔ برج بھاشا کے قواعد؛ للّوجی کوی؛ اس قواعد میں برج بھاشا کی گردان'

تصرف اور دیگر رموز و نکات بیان کیے گئے ہیں۔ اسے للوجی نے طلبا کے لیے مرتب کیا تھا، یہ ۱۸۱۱ء میں انڈیا گزٹ پریس سے شائع ہوئی" (ص۶۲۸، انلس ص۲۶) کلکتہ کے اردو مطابع میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے جب کہ ڈاکٹر سمیع اللہ نے للولال جی کوی کی دو اردو کتابوں کے ضمن میں اس کا بھی ذکر کیا ہے: "برج بھاشا کے قواعد": یہ کالج کے طلبا کی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی تھی چناں چہ یہ نصاب میں شامل تھی۔ اس کی زبان اردو ہے' یہ ۱۸۱۱ء میں شائع کی گئی" (ص۱۵۱) نیز "فورٹ ولیم کالج کی تالیفات کے باب میں ص۸۹ شمارے ۶ پر کتاب کو "اردو ناگری" میں مطبوعہ قرار دیا ہے۔

اغلب ہے کہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم اپنے علمی ذوقِ تجسس اور تفتیشی طریقۂ کار کے باوجود کتاب کو برآمد نہ کر سکیں وگرنہ وہ اس کی ممکنہ تفصیل تحریر کرتیں، سالِ تصنیف اسی لیے نامعلوم ٹھہرا۔ اگرچہ کتاب کی عدم دستیابی کے باعث یہ متحقق نہیں ہو سکا ہے کہ آیا "برج بھاشا کے قواعد" کی اردو میں تحریر و تسوید میں للولال جی کوی کے معاون و مددگار کوئی اردو داں رفیق کالج رہے تھے یا نہیں' اس باب میں شک کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں کہ "برج بھاشا کے قواعد" تنہا للولال جی کوی کی ہی مصنفہ رہی ہوگی"۔ لطایف ہندی" کے ہلکے پھلکے ادبی و انشائی موضوع کے بعد "برج بھاشا کے قواعد" کے ادق مضمون پر اردو میں للولال جی کوی کی اس تصنیف کے بارے میں یہ انکشاف ایک بڑی قیمتی اطلاع کی حیثیت رکھتا ہے اس سے اردو پر مصنف کا عبور ظاہر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہیرج گوئل نے بہ صفحہ ۳ ۔ للولال جی کوی کی دوسری کتب کے ذکر کے ساتھ اس قواعد کو "برج بھاشا میں ویاکرن" کا نام دیا ہے۔ "لال چندریکا" کے طبع اولین ۱۸۱۹ء میں مندرجہ سنسکرت پریس کے اشتہار میں للولال جی کوی کی دو ایسی کتابوں کے نام دوسری مطبوعات کے ساتھ مذکور ہیں جن پر "برج بھاشا کے قواعد" کے ناگری ایڈیشن کا گمان ہوتا ہے۔ ایک ہے "برج ولاس" اور دوسری "بھاشا قاعدہ" "چترگوشش" کی فہرست میں "بھاشا قاعدہ اور "برج بھاشا ویاکرن" دونوں درج ہیں جو ظاہر ہے کہ للولال جی کوی کی ایک ہی کتاب کے اردو ہندی نام ہیں۔ درجرتن داس اور پروفیسر وار شنے کی فہرستوں میں بھی یہ اندراج بہ طور حوالہ مل سکا ہے۔ ڈاکٹر شاردا دیوی ودیالنکار ہندی کے نثری ادب کے ارتقا کے موضوع پر اپنی تحقیق کے دوران اس تصنیف کا انگریزی قالب دریافت کرنے

میں کام یاب ہو چکی تھیں جس کی تفصیلات یہاں خلاصہ کی جارہی ہیں۔

ڈاکٹر شاردا دیوی نے اپنے تھیسس کے باب "فورٹ ولیم کالج "ہندی ورکس" میں بہ صفحہ ۵۲ و ۵۳ اولاً "کالج پروسیڈنگس" مورخہ ۹ مارچ ۱۸۱۲ کی سند پر کالج کے معتمد کی روداد سے اخذ کر کے للولال جی کوی کی کتب کی فہرست سازی کرتے ہوئے اسی 'برج بھاشا کے قواعد' یا "بھاشا ویاکرن" یا "بھاشا قاعدہ" کا انگریزی نام درج کیا ہے:

GENERAL PRINCIPLES OF INFLECTION AND CONJUGATION IN THE BRAJ BHAKHA I.E. A BRAJ BHAKHA GRAMMAR (1811)

ممدوحہ نے اسی موقع پر حاشیہ میں بتایا ہے کہ گارساں دی تاسی نے اس کا نام " "MACADIR BHAKHA" " لکھا ہے (بحوالہ تاریخ دی تاسی ج ۲ ص ۲۳۲)۔

ازاں بعد شاردا دیوی ودیالنکار صاحبہ نے ایک بحث کے دوران للولال جی کوی کے ایک اہم نکتے سے استناد کی خاطر اسی کتاب کے انگریزی متن کو استعمال کیا 'گویا "برج بھاشا ویاکرن' کی بازیابی نہ ہو سکی تھی"۔ للولال جی کوی کی اس 'بھاشا قاعدہ' یا 'برج بھاشا' کے قواعد کے انگریزی ترجمے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

THE ANCIENT LANGUAGE SPOKEN IN THE CITIES OF DILLEE AND AGRA, AND STILL IN THE GENERAL USE AMONG THE HINDOOS OF THOSE CITIES IS DISTINGUISHED BY THE INHABITANTS OF BRAJ BY THE NAME OF KHUREE BOLEE, AND BY MOOSULMANS INDISCRIMINATERY BY LOOCK HINDEE, NICH, HUCHH HINDEE OR IN THETH HINDEE, AND WHEN MIXED WITH ARABIC AND PERSIAN FURM WHAAT IS CALLED THE REKHTA OR OORDOO."

پروفیسر لکشمی ساگر وارشنے "آدھونک ہندی ساہتیہ" میں ص ۳۸/۳۹ پر اسی کتاب کا نام "جنرل پرنسپلس ــــ الخ" یا "برج بھاشا ویاکرن" درج کر کے یہ تصریح کرتے ہیں کہ "جس میں برج بھاشا یا کھڑی بولی گدیہ نہیں ہے"۔ للولال جی کوی کے سوانح نگار ودیارتن داس نے اپنی فہرست میں یہ تعارف کرایا ہے: "(۹) بھاشا قاعدہ 'ہندی بھاشا کا ویاکرن۔ اردو میں چھوٹے ویاکرن کو قاعدہ کہتے ہیں۔ ایسا نام رکھنے سے یہ گیات ہوتا ہے کہ اس کے ٹرانسلیشن میں انہیں مسلمان لیکھکوں سے سہایتا ملی ہوگی۔ یہ گرنتھ چھپا تھا' پر پرکاشت نہیں ہو سکا۔ اس کی ایک پرتی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں سُرکشت ہے"۔ (ص ۱۲،۱۳)

(۳) "اودھ بلاس"، پوربی نثری تصنیف قبل ۱۸۱۳ء

"بدیادرپن" نامی للولال جی کوی کی ایک کتاب کا انکشاف ابتدأً پروفیسر جاوید نہال نے کیا اور اس کو متعارف کراتے ہوئے لکھا: "للولال جی کب کی ایک اور مشہور کتاب "بدیادربن" یعنی مراۃ العلوم ہے" "بدیادرپن" میں شری رام کی کہانی تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ باپ کے وچن اور آگیہ بنانے کے لیے شری رام ہنسی خوشی بن باس لیتے ہیں۔ اجودھیا ویران اور سوگوار ہو جاتا ہے۔ بن میں راون بھیس بدل کر سیتا جی کو اٹھالے جاتا ہے اور پھر رام جی جنوبی ہند کی پراچین قوم کے ہنومان جی کی مدد سے لنکا پر چڑھائی کرتے ہیں۔ راون کو شکست اور ہلاکت نصیب ہوتی ہے اور سچ کا بول بالا ہوتا ہے۔ "بدیادرپن" میں شری رام کی مفصل داستان اور تاریخ مفصل انداز میں بیان کی گئی ہے" (ص ۱۷۲) فاضل مصنف نے بہ طور حوالہ "انلس" کے ص ۴۲۴ کی چند سطور کا ترجمہ دیا ہے جس میں "بدیادرپن" کو ایک سوستر سال قبل اودھ بلاس نامی شخص کی کتاب ظاہر کیا ہے۔ "انلس" سے اس ترجمے کا یہاں اعادہ بہ وجوہ غیر ضروری ہوگا۔ البتہ "انلس" کا اصل متن سطور آیندہ میں اقتباس ہوگا۔

پروفیسر جاوید نہال کی مترجمہ سطور میں بر بنائے غلط فہمی ایسے کچھ تاریخی نقایص در آئے جن کی تصحیح ضروری تھی اور فورٹ ولیم کالج کی جدید اور تا حال بہترین محقق و مورخ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے یہ کام عمدگی و خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ ان کے فاضلانہ غور و تدبر سے یہ امر بڑی شایستگی سے پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ درحقیقت اودھ بلاس کسی شخص کا نہیں بلکہ خود للولال جی کوی کی اصل پوربی تصنیف کا نام ہے اور "بدیادرپن" للولال جی کوی کی اس پوربی کتاب "اودھ بلاس" کے ترجمے کا عنوان۔ ڈاکٹر صاحبہ ممدوحہ نے "انلس" کے بیان کی طباعتی غلطی کی بنیاد پر اس کی اصلیت بھی ثابت کی جس کے مطابق للولال جی کوی کی پوربی "اودھ بلاس" کا بدیا درپن نامی ترجمہ "انلس" کی روایت سے صرف ۱۷ برس قبل ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے بہ صفحات ۴۲۲ تا ۴۲۴ "انلس" کی متعلقہ عبارت کا اپنا اور پروفیسر جاوید نہال کا بھی ترجمہ نیز اصل انگریزی متن پیش کیا ہے اور یہی موخر الذکر کلمات للولال جی کوی کی پوربی تصنیف "اودھ بلاس" اور اس کے ترجمے

موسومہ "بدیا درپن" پر بنیادی معلومات کا منبع ہیں:

BIDYA DARPAN, OR THE MIRROR OF SCIENCE, FROM UWADH BILAS, ORIGINALLY WRITTEN IN THE PURABI BHASHA, BY SHREE LAL KAVI, ABOUT 170 YEARS AGO, AND NOW FOR THE FIRST TIME TRANSLATED INTO THAT PECULIAR DIALECT TO THE HINDEE USUALLY SPOKEN BY THE SIPAHEES. THIS WORK, BESIDES THE HISTORY OF RAMA CONTAINS AS ABSTRACT OF ALMOST ALL THE ARTS AND SCIENCES KNOWN TO THE HINDOOS, AND IS CONSIDERED GENERALLY ONE OF THE MOST VALUABLE AND CURIOUS WORK IN THE LANGUAGE BY MIRZAEE BEG, A-NTIVE OR UWADH, UNDER THE SUPERINTENDENCE OF CAPT. THOMAS ROEBUCK, EXAMINER AND ASSISTANT SECRETARY IN THE COLLEGE OF FORT WILLIAM." ("ANNALS" P.421)

ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے "انلس" سے لے کر جاوید نہال کے بیانات تک کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "للولال جی کی تصنیف "اودھ بلاس" کو ایک سو ستر سال قبل کا کارنامہ نہیں کہا جا سکتا۔ "انلس آف دی کالج آف فورٹ ولیم" میں پرنٹ کی متعدد غلطیاں موجود ہیں، یہاں ایک سو ستر سال کی بجائے سترہ سال ہونا چاہیے۔ غالبًا اسی وجہ سے محترم جاوید نہال صاحب کو اس تصنیف کے سلسلے میں شدید مغالطہ ہوا ہے، وہ "اودھ بلاس" کسی مصنف کا نام سمجھتے ہیں جس نے ایک سو ستر سال قبل "بدیا درپن" تصنیف کیا تھا" (ص ۴۲۲/۴۲۳) داستانی شعبے کی کتب میں ڈاکٹر صاحبہ موصوفہ نے بہ عنوان "بدیا درپن"، مرزائی بیگ" للولال جی کوی کی پوربی اودھ بلاس" کے اس ترجمے کا تذکرہ ان تعارفی الفاظ میں کیا ہے: "یہ للولال کوی کی پوربی بولی کی تصنیف "اودھ بلاس" کا ہندوستانی ترجمہ ہے، اس میں رام چندر کی داستان کے علاوہ ان علوم و فنون کا بھی ذکر ہے جو صرف ہندوؤں کی میراث ہیں" (ص ۴۲۲)۔ ۱۸۱۹ میں اس "بدیا درپن"

کے زیر طبع ہونے کی طرف انہوں نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے: "انلس آف دی کالج آف فورٹ ولیم کی اشاعت ۱۸۱۹ء کے وقت تک "بدیا درپن" کالج کونسل کے ذریعے چھپنے کے لیے منظور کر لی گئی تھی اور اس وقت یا تو پریس میں تھی یا طباعت کے لیے درست کی جا رہی تھی" (ص۲۳۴ بہ حوالہ انلس ص۲۴۴) یہاں قاعدے سے ۱۸۱۶ء ہونا چاہیئے تھا کیوں کہ "انلس" دراصل فورٹ ولیم کالج کے ۱۸۱۶ تک کے حالات کا تذکرہ ہے۔

ڈاکٹر سمیع اللہ کی جمع کردہ اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ مرزائی بیگ کا "اودھ بلاس" کا ترجمہ "بدیا درپن" ۱۸۱۶ء میں شائع شدہ یا زیر طبع تھا۔ چنان چہ ڈاکٹر سمیع اللہ نے کالج کی جانب سے طباعت کا انتظام نہ ہوسکنے والی کتابوں کی ایک فہرست میں بہ صفحہ ۹۵ نمبر ۴۸ پر "بدیا درپن": مرزائی بیگ: ۱۸۱۶: "ناگری" کے الفاظ میں کسی نامعلوم مطبع و مقام سے اشاعت یافتہ قرار دیا ہے مگر "غیر معروف مصنفین" کی فہرس میں بہ صفحہ ۱۷۸ نمبر ۹ پر یہ اندراج کیا ہے: "مرزائی بیگ": "بدیا درپن" (ترجمہ) (غیر مطبوعہ) ماخذ: "اودھ بلاس" سال تالیف یا اشاعت: ۱۸۱۶ کیفیت: اس کی لپی ناگری اور زبان ہندی ہے" ظاہر ہے کہ للو لال جی کوی کی پوربی "اودھ بلاس" سے مرزائی بیگ کی مترجمہ "بدیا درپن" کا سن طباعت ان دو متضاد بیانات سے مشتبہ ہو جاتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر سمیع اللہ کے مذکورہ سال ۱۸۱۶ کو ایک حقیقت مان لیا جاتے تو کم از کم اس ترجمے کی تسوید و تکمیل کا سن ۱۸۱۶ء متعین ہوسکتا ہے۔ تاہم حسن اتفاق کہ یہ تعین ممکن ہوسکی ہے کہ "بدیا درپن" کا سال ترجمہ اس سے تین برس پہلے تک ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے للو لال جی کوی کے پیش رو سوانحی تذکرے میں ایک اور فاضل خاتون ڈاکٹر شاردا دیوی کے غالباً غیر واضح یا تشنہ بیان کا حوالہ یہ کہہ کر دیا ہے کہ "شاردا دیوی نے للو لال جی کوی کی ۱۸۱۳ء کی ایک تالیف "بدیا درپن" کا ذکر کیا ہے لیکن اس کتاب کی تفصیلات کا علم نہ ہوسکا (بہ حوالہ: "ہندی نثری ادب کا ارتقا: ۱۸۰۰ تا ۱۸۵۶ء" انگریزی ص۳۰) البتہ مرزائی بیگ نے "بدیا درپن" کے نام سے "اودھ بلاس" کا ترجمہ ضرور کیا تھا" "اودھ بلاس پوربی زبان میں للو لال جی کی تصنیف ہے" (ص۱۵۵) یہ واضح ہے کہ خواہ للو لال جی کوی کی کتاب "اودھ بلاس" کے ترجمے "بدیا درپن" کو بالراست خود للو لال جی کوی سے منسوب کرنے میں ڈاکٹر شاردا دیوی صاحبہ کو بھی مغالطہ ہوا ہو "اس بدیا درپن" کا اپنا سن ترجمہ ان کے حوالے سے سامنے آگیا ہے جو ۱۸۱۳ء ہے۔ ڈاکٹر شاردا دیوی ودیالنکار

صاحبہ نے ص۵۴ کی فہرست میں "(۱۰) ودیا درپن (۱۸۱۳)" کا اندراج کیا ہے اور تفصیلی گفتگو میں اس کتاب پر تعارف و تبصرہ نہیں تحریر کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس طرح "اودھ بلاس" کے ترجمہ "بدیا درپن" کے گذشتہ سنین تحریر یا تکمیل ۱۸۱۹ء اور ۱۸۱۶ء پر اصرار کا جواز نہیں رہ جاتا اور سال ۱۸۱۳ء کو بھی اس تصنیف کے سلسلے میں مدنظر رکھنا ہو گا۔

یہ اتفاق ہے کہ تا حال نہ تو للولال جی کوی کی اصل پوربی تصنیف "اودھ بلاس" کی اور نہ ہی اس کے ترجمے "بدیا درپن" کی بہ صورت مخطوطہ یا مطبوعہ بازیافت عمل میں آسکی ہے "انلس" سے للولال جی کوی کی "اودھ بلاس" اور "ودیا درپن" دونوں کا سراغ بہ یک وقت ملا ہے لیکن اس میں بھی سنین تصنیف و ترجمہ اور ابتدائی ایڈیشنوں پر ضروری اطلاعات وغیرہ کے بارے میں غالباً زیادہ معلومات موجود نہیں ہیں۔ اندریں حالات یہی قیاس قرینِ واقعہ معلوم ہوتا ہے کہ جب مرزائی بیگ نامی مترجم کے ہاتھوں "اودھ بلاس" پوربی زبان سے ہندوستانی میں ۱۸۱۹ء اور ۱۸۱۶ء سے قبل ۱۸۱۳ء تک منتقل ہوئی تو خود "اودھ بلاس" اس سے بھی پہلے تحریر میں یقیناً آچکی تھی۔ اس طرح للولال جی کوی کی پوربی کتاب "اودھ بلاس" کا سال تحریر ما قبل ۱۸۱۳ء طے پاسکتا ہے جس کو ڈاکٹر شاردا دیوی نے اس کے ترجمے "بدیا درپن" کا سن ترجمہ اس طرح سے قرار دیا ہے کہ اس مترجمہ کتاب کا نام اصل مصنف للولال جی کوی سے منسلک کر دیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اردو کے محقق پروفیسر جاوید نہال کی طرح ہندی ادبیات کی مورخ ڈاکٹر شاردا دیوی کو بھی اصل اور مترجمہ کتابوں کے ناموں میں التباس ہوا ہے تاہم معلومہ نکات کے مطابق فاضل موصوفہ کے دیتے ہوئے سن ۱۸۱۳ء کو "بدیا درپن" کے ترجمہ مرزائی بیگ پر قیاس کر کے اس کی اصل کا سن تصنیف بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ گویا زیر تذکرہ پوربی کتاب "اودھ بلاس" کے زمانۂ تکمیل کو ۱۸۱۹ء بلکہ ۱۸۱۶ء تک بھی توسیع دینے کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں۔

مرزائی بیگ مترجم "اودھ بلاس" کا اپنا نام بھی عجیب و غریب ہے اور واقعتاً تمام تر مسلمہ روایات کے خلاف، عجب نہیں کہ "انلس" میں اس نام کے شمول میں بھی طباعتی نقص کا ہی عمل دخل ہو۔ عین ممکن ہے کہ مرزا اور بیگ کے ابتدائی و آخری اجزاء کا درمیانی جزو انگریزی متن کے کمپوزیٹر سے چھوٹ گیا ہو اور یوں یہ نام ٹامس روبک کی اس روداد کے اغلاط کدے کا ہی ایک اور جزو ہو جو فورٹ ولیم کالج کی ادبیات کی تحقیقی تواریخ میں

نمایاں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید نہال اور مترجم کے بارے میں یہ تاثر رکھتے ہیں کہ "بدیا درپن" کے اس چھوٹے سے تعارف سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ "بدیا درپن" کالج کے اردو شعبے کے لیے ہندوستانی میں ترجمہ ہوا تھا' مرزا بیگ اس کے مترجم تھے' وہ بھی کالج سے وابستہ ہوں گے۔ لیکن سخت جستجو اور چھان بین کے باوجود مرزا بیگ اودھی کے حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ نہ ہی فارسی لپی میں "بدیا درپن" کا کچھ پتہ چل سکا۔ غالباً یہ زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکی اور خطی نسخہ زمانہ بُرد ہو گیا" (۱۷۳) ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی بہ عنوان "مرزائی بیگ" اطلاعات یہ ہیں کہ "ان کے سوانحی حالات دستیاب نہ ہو سکے' یہ اودھ کے رہنے والے تھے۔ کلکتہ آکر انہوں نے "اودھ بلاس" کا ترجمہ "بدیا درپن" کے نام سے تھامس روبک کی نگرانی میں انجام دیا تھا' یہ "خرد افروز" کی نظر ثانی میں بھی شریک تھے۔ مرزائی بیگ فورٹ ولیم کالج کے بے ضابطہ ملازم تھے" (ص۲۲۲) مرزائی بیگ کا نام اسی طرح سے ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے "انلس" ص۲۶ کے حوالے سے "خرد افروز" کے باب میں اس کے ایک ایڈیشن کے شرکاء میں بھی درج کیا ہے: "اسے ۱۸۱۵ء میں تھامس روبک نے مرتب کر کے ایک عالمانہ دیباچے کے ساتھ ہندوستانی پریس سے شایع کیا۔ "خرد افروز" کی مذکورہ ترتیب میں مولوی سید کاظم علی' منشی غلام اکبر' مرزائی بیگ اور غلام قادر شریک تھے" (ص۳۵۳)۔ اس نام کی اسی صورت "مرزائی بیگ" کا اعادہ "خرد افروز کی ترتیب" کے تحت ص۴۳۵ پر بھی ڈاکٹر صاحبہ موصوفہ نے کیا ہے۔ ڈاکٹر سمیع اللہ نے "کالج کے غیر ملازم مصنفین" نامی باب کے اخیر میں "غیر معروف مصنفین" کی فہرست سازی کی ہے جس کا اندراج آخری نمبر پر اُن ہی کا ہے: "۹۔ مرزائی بیگ' بدیا درپن' ترجمہ غیر مطبوعہ ماخذ' اودھ بلاس" سال تالیف یا اشاعت ۱۸۱۶ء۔ اس کی لپی ناگری اور زبان ہندی ہے" (ص۱۶۸) ماخذ کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ تاہم ڈاکٹر سمیع اللہ نے تھامس روبک مولف "انلس" وغیرہا کے تذکرے میں ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کے حوالے سے روبک کے زیر نگرانی "بدیا درپن" وغیرہ کی تحریر و تصنیف کی نشان دہی کی ہے جب کہ خود "انلس" غالباً ان کے ملاحظے میں ہونی چاہیے جس کا متعلقہ بیان ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے ہاں سے اوپر منقول ہوا ہے۔

ڈاکٹر عبیدہ بیگم صاحبہ کے تصحیح کیے ہوئے عدد سترہ سال میں بھی اشتباہ کا ایک خاص پہلو ہے جس کی بنا پر آس کا للو لال جی کوی کی تصنیف "اودھ بلاس" پر شاید ہی انطباق کیا

جا سکے۔ روبک کی "اٹلس" کے سن طبع ۱۸۱۹ء کی رعایت سے "اودھ بلاس" کا سال تحریر ۱۸۰۲ء قرار تو پا سکتا ہے مگر ۱۸۰۲ء کا للولال جی کوی کی اس کتاب کے سن تصنیف کے بہ طور اطلاق پھر بھی غیر درست رہے گا۔ یہ اس لیے کہ روبک کی یہ روداد خود کالج کے ۱۸۱۶ء تک کے تذکرے پر مشتمل ہے اور اس لحاظ سے یہ ۱۸۱۶ء یا بہت سے بہت شاید ۱۸۱۷ء کی مولفہ ہوگی۔ ان دونوں سنین سے سترہ برس منہا کرنے پر جو زمانہ آئے گا وہ للولال جی کوی کی کالج سے وابستگی سے ذرا پہلے کا ہی ہوگا۔ تمام تر احتیاط کے ساتھ للولال جی کوی کی اس پوربی کتاب "اودھ بلاس" کی تحریر کا سال ما قبل ۱۸۱۳ء قیاس کرنا ہی زیادہ قرین واقعہ ہوگا۔ اصل کتاب یا کم از کم ترجمہ مرزائی بیگ موسومہ "بدیا درپن" کی دریافت تک "اودھ بلاس" کا سن تصنیف وثوق اور قطعیت سے طے پانا غیر ممکن ہی رہے گا، کیوں کہ روبک کی سترہ برس قبل والی روایت کو بہ مشکل بھی "اودھ بلاس" پر منطبق نہیں کیا جا سکتا ہے۔

یہ اتفاق بھی کم عجیب نہیں کہ "لال چندریکا" کے طبع اول ۱۸۱۹ء میں مشمولہ للولال جی کوی کے سنسکرت پریس کے اشتہار میں "اودھ بلاس" کا نام غیر موجود ہے اور اس سے بھی کوئی رہنمائی نہیں مل سکی ہے۔

(۴) "سبھا بلاس" مرتبہ شعری تالیف ۱۸۱۵۔

پروفیسر سیّد محمد نے اس منظوم مجموعے کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرمایا تھا: "سبھا بلاس"، یہ ہندی کی دل کش اور چیدہ نظموں کا مجموعہ ہے جو کالج کے طلبائے ہندی کے لیے بہ طور انتخاب نظم مرتب کیا گیا تھا۔ ہندی دوہے اور گیت عوام میں جس پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہ مجموعہ خوب مشہور رہا۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتے سے ۱۸۱۵ء میں شایع ہوا تھا، ۱۸۲۹ء میں کالج کے ایک انگریز پروفیسر کپتان ایم پرایس نے ایک اور ایڈیشن چھاپا تھا۔ گلبرٹ سن نے ۱۹۰۰ء میں بنارس سے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شایع کیا" (ص ۲۶۶/۲۶۷) اول الذکر انگریزی نام غالباً ولیم پرایس کا ہے اس کے علاوہ چند اور اطلاعات بھی جدید تحقیق کی روشنی میں اصلاح و ترمیم طلب معلوم ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر لکشمی ساگروارشنے کی سند پر ڈاکٹر عابدہ بیگم نے للولال جی کوی کے ترتیب دادہ برج بھاشا کی شاعری کے اس انتخاب کی کچھ اور کیفیت لکھی ہے جب کہ ایک شکستہ و خستہ مطبوعہ جلد بھی ثانی الذکر اسکالر کے ملاحظے میں آئی ہے: "سبھا بلاس" برج بھاشا میں مختلف شعراء کی پسندیدہ نظموں کا انتخاب ہے، اسے للولال جی نے ترتیب دیا تھا۔ وہ خاتمے پر لکھتے ہیں:۔

سنگرہ کری کوی لال نے رچیو کا دیہ رس راس
دھریو نام یا گرنتھ کریا تیں سبھا بلاس

"سبھا بلاس" ۱۸۱۵ء میں طبع ہوئی (بحوالہ: وارشنے ص۱۰۱) صاحب "ارباب نثر اردو" نے اس کا سن طباعت ۱۸۱۰ء درج کیا ہے، یہ درست نہیں۔ ۱۶ جنوری ۱۸۱۵ء کو تھامس روبک نے ولیم پرایس سے "سبھا بلاس" پر رائے مانگی تھی، ولیم پرایس نے اسی دن جواب میں لکھا: "انتخاب کار نے میرے کہنے سے ہی آپ سے درخواست کی ہے۔ برج بھاشا کی بیشتر نظمیں فحش ہونے کی وجہ سے طلباء کو پڑھانے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ صرف منتخب نظموں کا مجموعہ ہے، فحش نظمیں اس میں نہیں رکھی گئیں۔ اس لیے نصابی کتاب کی شکل میں یہ مفید تالیف ہے (وارشنے ص۱۰۶) "سبھا بلاس" کا ۳۷ اوراق پر مشتمل خستہ کرم خوردہ مطبوعہ ناقص نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں موجود ہے، یہ ناگری رسم الخط میں ہے۔

زیر نظر نسخے سے سنہ طباعت کا علم نہیں ہوتا۔ للو جی اور ولیم پرایس نے "سبھا بلاس" کو ترتیب دے کر ۱۸۲۸ء میں کلکتہ سے شائع کیا تھا (بہ حوالہ: گریرسن) (ص۶۰۳، ۴۴)

للولال جی کوی کے انتقال ۱۸۲۴/۱۸۲۵ء کے بعد کے ولیم پرائس ایڈیشن کو مولوی سید محمد نے ۱۸۲۹ء کا قرار دیا ہے، ممکن ہے یہ ایک اور طباعت رہی ہو۔ "سبھا بلاس" کی زبان کے بارۂ خاص میں ڈاکٹر عابدہ بیگم کی روایت ہی مستند تسلیم کی جائے گی کیوں کہ موصوفہ نے خود اس انتخابی جلد کے فاضل مؤلف کا برج بھاشا کا شعر درج کیا ہے جو ناگری خط میں بھی کتابت کروایا گیا ہے۔ پروفیسر سید محمد کا اس تالیف کو ہندی نظموں

کی کتاب قرار دینا اس بنا پر بھی ہو سکتا ہے کہ بھاکھا کو ہندی یا ہندی کا ہی حصہ سمجھنا مختلف ادوار کے ادبا مصنفین میں عام رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم اس مجموعے سے کم از کم للولال جی کوی کے اپنے برج کلام کی نشان دہی کر دیتیں کیوں کہ نمونہ شاعری کو اردو ناگری میں نقل کر کے اس کی شرح دینے سے کتاب کی ضخامت پر ضرور بار پڑتا مگر للولال جی کوی کی شاعری سے ان کی نظموں کی مختصر سی فہرس کی متحمل تو یہ ضخیم تحقیق ہو جاتی۔ بہ حالتِ موجودہ "سبھا بلاس" میں خود مرتب کی تخلیقات کی شمولیت یا عدم موجودگی کا کوئی اندازہ ممکن نہیں ہے۔

گارساں دی تاسی کے بہ قول ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اور بھی ہم نام شعری تصانیف یا تالیفات رہی ہیں' اتفاقاً دی تاسی کے ہاں اس نام کے دو معنی علاحدہ مواقع پر مذکور ہوتے ہیں دسمبر ۱۸۶۲ء کے بارھویں خطبے میں نئی موصولہ کتب میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے": ایک کتاب "سبھا بلاس": 'لطف معاشرت" ہے۔ یہ نام دراصل کئی ہندی کتابوں کا ہے مگر یہ کتاب جو مجھے بھیجی گئی ہے ہندی اشعار کے انتخابات پر مشتمل ہے" (ح ا ص ۳۲۱)۔ ایک پیش رو خطبے میں بہ صفحہ ۱۲۰ دی تاسی نے ایک تازہ ہم نام کتاب کے حوالے سے عنوان کا ایک اور ترجمہ دیا ہے: "سبھا ولاس" یعنی ذوق مجلس۔ یہ ہندی نظموں کا انتخاب پنڈت دھرم نارائن نے کیا ہے جس کا تخلص ضمیر ہے"۔ ایسی ہی کتابوں میں سے ایک کے یوروپی نظم میں ترجمے کی طرف دی تاسی نے حصہ دوم کے ایک خطبے میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: اس عالم (نام غیر مذکور) نے ہندی نظم "سبھا ولاس" کا منظوم لاطینی میں ترجمہ کیا ہے اور اس بارے میں مسٹر EICHIH OFF کی تقلید کی ہے جس نے رامائنا کے متعدد اجزا کا منظوم لاطینی ترجمہ کیا تھا" (ص ۲۳۸ حاشیہ)

"لطف مجلس" کے بجائے "سبھا ولاس" نام کے متذکرہ دو الگ الگ معنی "لطف معاشرت" اور "ذوق مجلس" اگر گارساں دی تاسی کے اپنے الفاظ کا ترجمہ ہیں تو ممکن ہے اس نے یہ نام دونوں منظوموں/مجموعوں کے موضوعات کی مناسبت سے رکھے ہوں۔ تاہم یہ امکان بھی ہے کہ یہ علاحدہ نام ان خطبات کے مترجمین یا نظر ثانی کے ذمہ دار افاضل کے اپنے

تصرفات میں سے ہوں۔ ان حضرات میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ڈاکٹر ریاض الحسن کے علاوہ مولوی عبدالحق نیز شیخ چاند اور ڈاکٹر محمد حمیداللہ شامل رہے ہیں۔

(۵) " مادھوبلاس" / مہادیو وِلاس" ("مادھو ولاس") برج منظوم تصنیف ۱۸۱۷۔

للولال جی کوی کی اس تخلیق کے بارے میں ایک تو یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب دراصل بہ یک وقت نظم اور نثر میں تحریر ہوئی ہے' دوسرے یہ کہ یہ ترجمہ ہے تصنیف نہیں۔ علاوہ ازیں اس کے زبان کے بارے میں بھی اختلاف سامنے آیا ہے۔ محصلہ مختصر سی معلومات کے باہمی تضاد پر مستزاد "مہادیو ولاس" یا "مادھو ولاس" کے مطبوعہ اور قلمی متون کی تاحال عدم دستیابی جو صحیح اطلاعات کے فقدان کی اصل اور بہت بڑی وجہ ہے۔ اولاً "ارباب نثر اردو کی تعارفی سطور ملاحظہ ہوں": مہادیو بلاس: یہ ایک منظوم افسانہ عشق و محبت ہے' اس میں مہادیو اور سلوچن کے عشق و عاشقی کے حالات نظم کیے گئے ہیں۔ یہ فسانہ سنسکرت میں تھا' للولال نے برج بھاشا میں نظم کر دیا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا پہلا ایڈیشن کب نکلا۔ آگرہ سے ایک ایڈیشن ۱۸۴۶ء میں شایع ہوا تھا' ازاں بعد متعدد ہندی مطبعوں میں یہ نظم چھپی اور اس کا بھی بہت چرچا رہا" (ص۲۶۰)

بہ قول ڈاکٹر عبیدہ بیگم بہ عنوان "مادھو بلاس از للوجی کوی" شعبہ متفرقات بہ صفحہ ۶۳۲' شمارہ ۱۰۰۳: "للوجی نے "مہادیو بلاس" کو ۱۸۱۷ء میں سنسکرت سے ہندی نظم میں منتقل کیا۔ اس میں مہادیو اور سلوچنا کی عاشقانہ داستان بیان کی گئی ہے۔ بہ قول شارداویوی ودیا النکار (ص۵۳) یہ نظم اور نثر میں بہ یک وقت بیان کی گئی ہے۔ یہ آخرالذکر تاثر ڈاکٹر عبیدہ بیگم صاحبہ کا اپنا نتیجۂ جستجو معلوم ہوتا ہے کیوں کہ ڈاکٹر شارداویوی نے زبان اور طباعت کی کوئی نشان دہی نہیں کی ہے۔ اس کا کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔" اولین اشاعت سے تو خود پروفیسر سید محمد نے اظہار لاعلمی کیا ہے لیکن ۱۸۴۶ء کے طبع آگرہ اور متعاقب ایڈیشنوں کی طرف انہوں نے اشارہ فرمایا جو افسوس کہ دستیاب نہیں ہو سکے۔

ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے سال تحریر ۱۸۱۷ء گریرسن "لینگوسٹک سروے" ج ۹ حصہ اول ص۳۶ سے اخذ کیا ہے جب کہ "ہندی نظم" میں منتقلی کی سند مولوی سید محمد سے لی جو کتاب

کو ہندی نہیں برج قرار دیتے ہیں۔ طبع ۱۸۴۶ء جامعہ عثمانیہ یا کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہوگا۔ ۱۸۱۹ء سے قبل تحریر اور شایع شدہ ہونے کا ثبوت "لال چندریکا" کے طبع اوّل ۱۸۱۹ء کے اخیر میں مشمولہ سنسکرت پریس کے اشتہار سے مل جاتا ہے جس کو گریرسن نے "لال چندریکا" کے اپنے ایڈیشن میں شامل رکھا ہے اور جس میں اس تصنیف کا عنوان "مادھو ولاس" درج ہے۔ "لال چندریکا" پر باب کے اخیر سے یہ فہرس بعینہٖ منقول ہے۔

پروفیسر اے سی ٹکیکر صاحب یونیورسٹی لائبریرین جامعہ بمبئی کے عکسی عطیات سے مترشح ہے کہ "پریم ساگر" کے مرتب اور للولال جی کوی کے سوانح نگار ورجرتن داس اور ڈاکٹر لکشمی ساگروارشنے اس بہ یک وقت منظوم و منثور تالیف کو اپنی فہرستوں میں درج کر چکے ہیں لیکن یہ عیاں نہیں ہے کہ آیا دونوں افاضل کے ملاحظے میں للولال جی کوی کی یہ نادر و نایاب یادگار آئی ہے یا نہیں۔ پروفیسر وارشنے "اپنی آدھونک ہندی ساہتیہ" کے صفحہ ۳۰۹ پر حاشیے میں "مادھو ولاس" کا انتہائی مجمل تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں: "للولال کرت "مادھو ولاس"، ۱۸۱۷ء برج بھاشا گدیہ پدیہ مشرت رچنا ہے۔ اس میں "سریا یوگ سار نگیہ پورن" کے آدھار پر مادھوا اور سلوچنا کی پریم کتھا کا ورنن ہے۔" یعنی یہی کہ للولال جی کوی کی یہ تخلیق برج نظم و نثر کا امتزاج رکھتی ہے اور دونوں اصناف کی مشترکہ یا ملواں تصنیف ہے جس میں ایک پیش رو داستان کے طرز کا اتباع کیا ہے۔

ورجرتن داس نے للولال جی کوی کے جیون چرتر میں مشمولہ کوایف میں "مادھو ولاس" کے ماخذ کا کچھ احوال دیا ہے جس سے اس کے پس منظر کا علم ہوتا ہے: "(۵) مادھو ولاس۔ رگھورام نامک گجراتی کوی کے "سبھا سار" اور کرپارام کوی دوارا پدھیہ پر ان سے سنگر ہیت "یوگ سار" نامک دونوں گرنتھوں کو ملا کر للوجی نے "مادھو ولاس" نام سے اس پستک کو پہلے چھپوایا۔ اس پستک میں گدیہ پدیہ دونوں ہیں اور یہ ورج بھاشا میں ہے۔ رگھورام ناگر کی ایک آنیہ رچنا "مادھو ولاس شتک" کھوج میں ملی ہے۔" (ص ۱۲)۔ جب کہ ڈاکٹر لکشمی ساگروارشنے ۱۹ویں صدی کے برج ادب میں "مادھو ولاس" اور "راج نیتی" کی غیر معمولی اہمیت کے قائل ہیں: "سوتنتر روپ سے لکھے گئے گدیہ گرنتھوں

میں للولال کرت "راج نیتی" اور "مادھو ولاس" دو شیش روپ سے اُلیکھنیہ ہیں۔ واستو میں یدی "راج نیتی" اور "مادھو ولاس" برج بھاشا پر میرا کی اُتی اُپ لبدھ مہتو پورن کرتیاں کہی جاتیں تو کوئی ہانی نہ ہوگی" (آدھونک ہندی ساہتیہ ص۲۴۲) پروفیسر واشنے یہاں بھی یہی قرار دیتے ہیں کہ "مادھو ولاس" بھی سنسکرت رچنا کا گدیہ پدیہ مشرت انوواد ہے" (حاشیہ صفحہ ایضاً) پروفیسر صاحب موصوف کی جانب سے للولال جی کوی کی اس قدر پذیرائی بسا غنیمت ہے۔

(۶) "چھتر پرکاش" / "چھتر سال" برج منظوم تصنیف قبل ۱۸۲۱۔

ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے "تاریخ اور تذکرے" کے شعبے میں بہ صفحات ۵۶۳ تا ۵۶۵ للولال جی کوی کی اس تاریخی مثنوی کا احوال مع اقتباس لکھا ہے۔ یہ شیام سندر داس کے مرتبہ ایڈیشن سے مستفاد ہے اور للولال جی کوی کی ادبی سوانح میں یقیناً ایک اور بے حد قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے دیگر بیش قرار اور پر مایہ اضافوں کی طرح اس بارے میں بھی فاضل محقق تحسین کی حقدار ہیں۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ ہندی داں اسکالروں یعنی "پریم ساگر" کے مرتب اور للولال جی کوی کے کوایف نویس ورجن داس پروفیسر وارشنے اور ڈاکٹر شاردا دیوی کے علم میں یہ برج منظومہ نہیں آسکا اور حالیہ عرصے میں ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اس کو متعارف کرایا۔ اتفاقاً ایک اور شاعر کی ہم نام وہم موضوع منظوم سوانح کا علم ہوتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

للولال جی کوی کی اس منظوم تخلیق پر ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی اطلاعات ہیں: "چھتر پرکاش" چھتر سال کی منظوم تاریخ ہے۔ اس میں بندیل کھنڈ کے علاوہ دیگر تاریخی واقعات اور افراد کا بھی ذکر ہے۔ یہ ایک سو انچاس[۱۴۹] صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۶ ابواب ہیں۔ "چھتر پرکاش" ناگری رسم الخط میں ہے۔ "چھتر پرکاش" کو ولیم پرایس نے ۱۸۲۹ء میں فورٹ ولیم کالج سے شایع کیا تھا۔ زیر نظر نسخہ ۱۹۰۳ء کا ناگری پرچارنی سبھا بنارس سے شایع شدہ ہے۔ اس پر شیام سندر داس نے مقدمہ لکھا ہے۔ "چھتر پرکاش" کی زبان اودھی اور برج کا مرکب ہے۔ یہ زبان بے حد رواں اور شگفتہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیں "چھتر سال کا لڑکپن ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

پرگٹ پاسنی میں جبھی چھپائی　　　　بھو بھر سہت کرپان اُٹھائی الخ

اس موقع پر ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے چند اشعار پیش کیے ہیں جن کی اصل صورت

ناگری میں بھی تحریر کروائی ہے۔ موصوفہ کی رائے یہ ہے کہ "چھترپرکاش کے سارے بیانات بہت عمدہ ہیں ان سے واقعات کی پوری تصویر نگاہوں میں آجاتی ہے"۔ ازاں بعد ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے متفرقات کی ذیل میں "چھترسال کی ترتیب" کے عنوان سے گریرسن کے حوالے سے ایک اور سال طباعت بھی ظاہر کیا ہے: "ولیم پرایس نے للولال جی کی "چھترسال" کی ترتیب کی تھی جو ۱۸۲۱ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی" (ص ۶۳۴)۔ یہ بظاہر واضح نہیں ہے کہ ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۹ء میں سے آیا کوئی ایک ہی تاریخ درست ہوگی یا پھر ولیم پرایس کے ترتیب دادہ دو علاحدہ ایڈیشنوں کے یہ الگ الگ سنین اشاعت ہیں کیوں کہ فاضل موصوفہ نے کسی ایک مقام پر دونوں باتوں کا یک جا ذکر نہیں کیا ہے تاہم خوش قسمتی سے ثانی الذکر طباعت کا ثبوت ہاتھ آگیا ہے جس کا احوال نذر ہے۔

حسن اتفاق کہ لندن سے جناب سلیم قریشی صاحب کے عکسی عطیات میں للولال جی کوی کی اس کتاب کے اوّلین تین صفحے شریک ہیں۔ ان میں سے پہلا اس کا انگریزی سرورق ہے، دوسرا اندرونی سرورق ہے جو ہندی میں ہے اور تیسرا صفحہ فہرس منظومات کا ہے۔ انگریزی کے سرورق کا ترجمہ یہ ہے: "چھترپرکاش سوانح چھترسال راجا بندیل کھنڈ از لال کوی مرتبہ کپتان ڈبلیو پرایس پروفیسر ہندی و ہندوستانی فورٹ ولیم کالج مطبوعہ زیر انتظام مجلس عمومی تعلیمات شائع شدہ مطبع تعلیمات ۱۸۲۹ء"۔ ہندی سرورق کی عبارتوں کا اردو روپ یوں ہے: "چھترپرکاش" گرنتھ۔ بندیل کھنڈ کے راجا چھترسال کا ونش اور ریدھ اور وجے برنن۔ کیا ہوا شری لال کو لیشور کا ہندی بھاشا میں۔ فورٹ ولیم کالج کے ہندی اور ہندوستانی ادھیاپک کپتان ولیم پرایس صاحب نے چھپوایا سنسکرت پاٹھ شالا کے چھاپے خانے میں۔ کلکتہ ۱۸۲۹ء"۔

للولال جی کوی کی "چھترپرکاش" یا "چھترسال" نامی اس منظوم سوانح کے مشمولات کی فہرست میں ۱۰ سرخیاں ہیں۔ اس فہرست کا اپنا عنوان ہے "اتھ چھترپرکاش کی سُوچیکا" منظومات پر نمبر شمار درج نہیں ہے۔ اوپر "پراکرن" یعنی عنوان کا لفظ لکھ کر آگے ہر ایک کے صفحہ نمبر کے لیے "پتر اَنک" لکھا ہے۔ اس منظوم تصنیف کی سرخیاں یہ ہیں: (۱) بندیل جنم برنن، (۲) بُندیل بنش برنن (۳) چھترسال نرپتن پورو جنم کتھا برنن (۴) چھترسال بال چرتر بال گووند نرتیہ برنن (۵) جَورنگھ بہار سِنگھ پرپنچ برنن (۶) اورنگ زیب پرپنچ جنبت رائے بکرم مگند پاڑا بگھ دارا شاہ پراجتے چھترسال پاڑا بگھ برتن، (۷) سبھ کرن پراجتے بنکا

بگھو برنن (۸) چنپتی برناش (۹) جے سنگھ سمیلن (۱۰) دیوگڑھ جینی برنن۔

جیسا کہ منقول ہوا ہے کتاب کے ہندی سرورق پر اس منظوم تاریخ کو "ہندی بھاشا میں" مصنفہ ظاہر کیا گیا ہے تاہم ڈاکٹر عبیدہ بیگم صاحبہ کے تاثر اور نمونتہً پیش کردہ اشعار سے عیاں ہے کہ یہ شاعری ہندی زبان کی نہیں ہے بلکہ اس کی زبان اودھی اور برج کا مرکب ہے۔ اس اعتبار سے للولال جی کوی کی اس تصنیف کو راقم نے ان کی بھاکھا کی مطبوعات میں شمار کیا ہے۔ پوری کتاب سامنے نہیں ہے اس لیے خیال ہے کہ منقولہ فہرس ابواب کے ذیلی اجزاء ملا کر اس مثنوی کے بہ قول ڈاکٹر عبیدہ بیگم ۳۶ حصے ہوں گے جن کی تفصیلات سے لاعلمی ہے ورنہ اقتباس کر دی جاتیں۔

گارساں دی تاسی نے للولال جی کوی کی اس شعری تصنیف کو اہم منظوم تواریخ میں شمار کیا ہے۔ اس شعری تاریخ "چھترسال" کے تذکرے سے قبل اس نے تمہیداً لکھا ہے: "سنسکرت میں تاریخ کا وجود نہیں بجز اس کے کہ وہ کہیں کہیں فسانے کے ضمن میں آجاتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی جدید ادبیات میں یہ فن پیدا ہو چلا ہے مگر یہ اس کا ایک حقیر گوشہ ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ بعض منظوم تاریخیں پائی جاتی ہیں جن میں ایسے بیش قیمت واقعات بھی مل جاتے ہیں جو دوسری جگہ نہیں مل سکتے۔ اب رہی تاریخی نظمیں۔ مولف "چند" ("چند بردائی") کا ذکر تو میں اس سے قبل کر چکا ہوں جو راجپوتانے کا ہومر بھی ہے تھوسیڈائیڈ (Thucydides) بھی۔ دوسری کتاب "چترپرکاش" ہے جو چترا سال راجہ بندیل کھنڈ کی تاریخ ہے اس کا مصنف لال کوی ہے" (ص۱۷۳/۱۷۲ ج۱) اس سے آگے مستشرق ٹاڈ کی عظیم "تاریخ راجستھان" میں مذکورہ کتی منظوم سوانحی وسیاسی تاریخوں اور متعلقہ شعرا کی فہرست سازی دی تاسی نے اختصار سے کی ہے۔

"نگار" کے "ہندی شاعری نمبر" کے ایک مقالہ نگار رام کمار ورما نے "ہندی شاعری میں قومی جذبات" کے زیر عنوان جائزے میں "دوسرا دور" کی سرخی کے تحت ۱۶۵۰ سے ۱۸۷۵ء تک کا احاطہ کرتے ہوتے چھترسال کی ایک اور منظوم سوانح مصنفہ گورے لال کا ذکر کیا ہے" البتہ یہ مجمل حوالہ سال تصنیف نیز سنین اشاعت اور دیگر ضروری تفصیلات سے عاری ہے: اس زمانے میں اگرچہ عشقیہ شاعری بام عروج پر تھی مگر رزم گو شعراء کی بھی کمی نہ تھی۔ بھوشن (مصنف "شیوراج بھوشن" متعلقہ شیواجی) کے علاوہ "چھترپرکاش" کے مصنف گورے لال، "جنگ نامہ" کے مصنف مرلی دھر، "ہمیر راسو" کے مصنف جودھ راج "سوجان چرت" کے مصنف سودن خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں ــــ بھوشن کی طرح گورے

لال بھی اپنے "چھترپرکاش"، میں چھترسال کی تعریف کرتے ہوتے اس مذہبیت کی تنگ نظری میں مبتلا نظر آتے ہیں" (ص ۶۴) للولال جی کوی کی منظوم تاریخ سے تقابل و تعرض درکنار کوئی حوالہ تک رام کمار ورما نے نہیں دیا ہے۔

"لطایف ہندی" بیک نظر

"لطایفِ ہندی" اُردو نثری تصنیف ۱۸۱

"ارباب نثر اردو" کے الفاظ میں: "یہ ہندوستانی لطایف اور ظریفانہ کہانیوں کا مجموعہ ہے، ابتداً فارسی اور ہندی دونوں رسم الخط میں شایع ہوا تھا۔ اس میں متعدد برمحل امثال، ضلع جگت، ریختہ اور برج بھاشا کے صنایع اور لفظی تکلفات ہیں۔ اس میں اردو انگریزی الفاظ کی ایک فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ اس کا آدھا حصہ جو ہندی سے متعلق ہے للولال کا کارنامہ ہے، یہ مجموعہ ۱۸۱۰ء میں شایع ہوا تھا۔ ۱۸۲۱ء میں کلکتہ سے ایک اور ایڈیشن ولیم کارمیکل اسمتھ نے شایع کیا تھا اس میں ناگری رسم الخط کا حصہ خارج کر دیا گیا (ص ۳۱)" اس اجمال کی مفید مطلب تفصیلات پروفیسر جاوید نہال اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم دونوں نے چند اقتباسات سمیت فراہم کی ہیں جن سے منقولہ بالا معلومات میں سے کچھ کی اصلاح و تصحیح ہو جاتی ہے اور نئی اطلاعات کا اضافہ بھی ممکن ہوا ہے۔ البتہ للولال جی کوی کے صرف ناگری حصے تک محدود رہنے کی طرف دونوں نے کوئی اشارہ بھی نہیں کیا ہے اور دونوں ہی مورخین کے ملاحظے میں چونکہ للولال جی کوی کی اس ذولسانی کتاب کے دو مختلف اردو ایڈیشن رہے ہیں اس لیے اس امر میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہے کہ "لطایف ہندی" کا اردو متن خود للولال جی کوی کا ہی تصنیفی کارنامہ ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر جاوید نہال اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے ہی اتباع میں ڈاکٹر سمیع اللہ نے بھی للولال جی کوی کی مختصر سی تذکرہ نگاری میں اس اردو کتاب کو شریک رکھا ہے۔

اتفاقاً مذکورہ تمام جدید محققین سے قبل اور پروفیسر سید محمد کی تصنیف کے قبل و بعد کے قریبی زمانے میں ان کے ایک سینیر معاصر بنگال کے حکیم حبیب الرحمان نے بھی اپنے ذخیرۂ کتب کے تذکرے موسومہ "ثلاثۂ غسالہ" میں "لطایف ہندی" کو للو لال جی کوی کی اردو کتاب قرار دیا ہے۔ اس کا علم ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی و اردو کی پروفیسر اُمِّ سلمٰی کے "ثلاثۂ غسالہ" حصہ اردو کے تعارفی مقالے سے ہونے پر راقم نے پروفیسر صاحبہ موصوفہ سے متعلقہ تفصیل مرحمت کرنے کی گذارش کی۔ فاضل ممدوحہ

نے تذکرہ نگار حکیم حبیب الرحمٰن کے خودنوشت مخطوطے کے ناقص وخستہ حالت میں ہونے کی بنا پر مصنف کے ریزہ ریزہ مسودے سے خود دیدہ ریزی کی زحمت فرمائی اور مطلوبہ کتب پر بیانات کی قلمی نقل بدستِ خاص عطا کی۔ محترمہ پروفیسر اُمّ سلمٰی کے ۱۲ ستمبر ۱۹۹۰ء کے مکرمت نامے کے ہمراہ موصولہ تذکرۂ "ثلاثۂ غسالہ" میں حکیم حبیب الرحمٰن کی "لطایف ہندی" کے دو ایڈیشنوں پر تحریر کی ہوئی مختصر سی کیفیت بہ صفحہ ۱۳۰ یوں ہے: "لطایف ہندی" اردو زبان میں مختصر ظریفانہ نقلیں جسے سری لال کب گجراتی نے حسب الحکم ڈاکٹر جان گل کرایسٹ سکریٹری فورٹ ولیم کالج کلکتہ جمع کیں اور پہلی مرتبہ ۱۸۱۰ء میں کلکتہ میں اردو حروف الگ اور ناگری حروف الگ میں طبع ہوئی اور دوسری مرتبہ میر تقی میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" کے ساتھ اردو حروف اور رومن حروف میں ۱۸۴۱ء میں پیرس میں چھپی۔ اس کے ساتھ اردو زبان پر انگریزی میں ایک بہترین مقدمہ لکھا ہے۔" واضح رہے کہ پروفیسر اُمّ سلمٰی صاحبہ کی تحقیق کے مطابق "ثلاثۂ غسالہ" میں حکیم حبیب الرحمٰن کی تذکرہ نگاری کا عمل ۱۹۰۴ء سے لے کر بعد کے چالیس برس تک جاری رہا۔ اس طرح "لطایف ہندی" کا منقولہ تاثر "ارباب نثر اردو" کے سال تصنیف ۱۹۲۷ء کے قبل یا بعد کا ہو سکتا ہے۔

جدید مورخین ادب میں سے ڈاکٹر جاوید نہال نے للولال جی کوی کی اس اردو تصنیف "لطایف ہندی" کے دیباچے سے چند سطور کے ساتھ بیان کیا ہے کہ للولال جی کب گجرات کے رہنے والے تھے لیکن ان کا خاندان بہت دنوں سے آگرہ میں آباد ہو گیا تھا، اس لیے وہ گجراتی کم اور اکبرآبادی زیادہ ہیں۔ انھوں نے برج بھاکھا اور ہندوستانی زبانوں کی مشہور تالیف "لطایف ہندی" میں اپنا حال نہیں لکھا ہے۔ "لطایف ہندی" مطبوعہ ۱۸۷۷ء کے آغاز میں ان کا بس مختصر سا ذکر ہے: (اقتباس دیباچہ مصنف) "اشرف الاشراف لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر کے راج میں خداوند نعمت کپتان جان ولیم ٹیلر صاحب اور لیٹن (غالباً لیفٹننٹ کی خرابی ہے) ابراہیم لایف صاحب کے حکم سے شری للولال کوی براہمن گجراتی ساہتیہ اودی آگرے والے نے ایک سو نقل زبانِ ریختہ میں بنائی۔ جمع کر کے چھپوائی، کالج کے نوسکھ صاحبوں کے پڑھنے کو" (ص ۱۶۹) حاشیہ: دیکھیے دیباچۂ لطایف ہندی" مطبوعہ ۱۸۴۷ء دیوناگری رسم الخط میں ص ۱) اتفاقاً پروفیسر جاوید نہال کے محولہ

بالا الفاظ میں اس ایڈیشن کے سلسلے میں اختلافِ سنین واضح ہے جب کہ یہ صفحہ آیندہ اسی کا سال طباعت مکرر ۱۸۴۷ء تحریر ہوا ہے اور اغلب ہے کہ یہی سن اشاعت درست ہوگا نہ کہ اوّلا متذکرہ متن ۱۸۷۷ء۔

"لطایف ہندی : للولال جی کوی" کو "داستان" کہانی، حکایات اور نقلیں" کی وضاحتی فہرس میں بہ صفحات ۴۱۴ تا ۴۱۶ شریک کرتے ہوئے ڈاکٹر عبیدہ بیگم اس کی مفصّل کیفیت طبع اوّل سے منکشف کرتی ہیں: "لطایف ہندی" میں ایک سو مختصر حکایتیں درج ہیں۔ انہیں للوجی نے مرتب کیا تھا۔ یہ فارسی اور ناگری دونوں رسم الخط میں ایک ساتھ انڈیا گزٹ پریس سے ۱۸۱۰ء میں شایع ہوئی تھی۔ فارسی رسم الخط والے حصّے کی زبان ریختہ ہے اور ناگری رسم الخط کی زبان برج بھاشا ہے۔ "لطایف ہندی" کو نقلیات بھی کہا گیا ہے، اس کا مطبوعہ نسخہ ۱۸۱۰ء ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ کرم خوردہ ہے اس لیے برج بھاشا والے حصّے میں درج ایک بیان واضح نہیں ہو سکا ہے، اس بیان میں غالبًا یہ وضاحت درج ہے کہ اسے للوجی نے سمبت ۱۸۶۷ء مطابق ۱۸۱۰ء میں ولیم ٹیلر اور لاکٹ کے حکم سے ترتیب دیا تھا" (ص۴۱۵ بہ حوالہ: خاتمہ "لطایف ہندی")

کتاب کی کچھ اور تفصیل پروفیسر جاوید نہال کے الفاظ میں: "للولال جی کی لطایف ہندی" کے کتنی ایڈیشن نکلے۔ پہلی بار للولال جی کب کی یہ کتاب۔ ۱۸۱۰ء میں کلکتے کے انڈیا گزٹ پریس سے شایع ہوئی تھی۔ "لطایف ہندی" مطبوعہ ۱۸۴۷ء دیو ناگری اور فارسی لپیوں میں ایک ساتھ شایع ہوئی ہے۔ اس میں ایک سو چھوٹی چھوٹی حکایات ہیں جو نقل کے عنوان سے دی گئی ہیں۔ یہ ایک سو کہانیاں ۱۵۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ انگریزی اور ہندی زبانوں میں برج بھاشا کے ادق اور مشکل الفاظ کے معنی بھی دیے گئے ہیں، یہ فرہنگ بڑی مفید ہے" (ص۲۱)۔ ڈاکٹر سمیع اللہ نے بڑے مجمل انداز میں یہ تصنیف شریک تذکرہ کی ہے: "لطایف ہندی" یہ چھوٹی چھوٹی ایک سو حکایتوں کا مجموعہ ہے جو نقل کے عنوان سے تحریر کی گئی ہیں۔ ۱۸۱۰ء میں یہ کتاب اردو اور ہندی دونوں خطوں میں ایک ساتھ شایع ہوئی تھی۔ اردو رسم الخط والی کتاب کی زبان ریختہ اور ہندی لپی والی کی زبان برج بھاشا ہے۔ ان حکایتوں کے موضوعات مزاحیہ اور سبق آموز ہیں۔ اس ایڈیشن کے آخر

یں مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ بھی شامل ہے جس میں الفاظ کے معنی انگریزی اور ہندی میں لکھے گئے ہیں۔" (ص۱۵)

جیسا کہ ڈاکٹر جاوید نہال اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی تحقیقات سے ماخوذ "لطایف ہندی" کی چار "نقلوں" یا کہانیوں سے مترشح ہوگا ان حکایات میں للولال جی کوی نے سبق آموزی اور مزاح نگاری کا امتزاج ہی پیدا نہیں کیا ہے بلکہ ان کو تصنیف کرتے ہوئے اس سے زیادہ عناصر کو مجتمع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چنانچہ بہ قول ڈاکٹر عبیدہ بیگم "لطایف ہندی کی حکایتیں مختلف موضوعات کو محیط ہیں۔ یہ مزاحیہ بھی ہیں اور سبق آموز بھی، ان میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی تصویریں بھی جا بجا مل جاتی ہیں۔" (ص۱۴۵) "لطایف ہندی" میں بہ طور اختتامیہ شریک فرہنگ کا لغوی جواز بھی فاضل موصوفہ فراہم کرتی ہیں: "لطایف ہندی" کی حکایتوں میں ہندی محاورے اور ضرب الامثال بھی مستعمل ہیں۔ اس مجموعے میں ایک فرہنگ کے ذریعے مشکل الفاظ کے معنی انگریزی اور ہندی میں درج کیے گئے ہیں۔" (ص۱۴۶) پروفیسر گیان چند جین نے بلوم ہارٹ کے حوالے سے "مگر چند غیر اہم قصوں کا تعارف" میں للولال جی کوی کی یہ اردو کتاب شریک تذکرہ رکھی ہے اور ان کی رائے اقتباس کی جا رہی ہے جس پر مولوی سید محمد کے اوّلین خیالات کی اثر اندازی عیاں ہے: "لطایف ہندی" بلوم ہارٹ نے برٹش میوزیم ہندوستانی مطبوعات کی فہرست میں "لطایف ہندی" (للولال کوی) کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہندوستانی لطیفوں اور مزاحیہ حکایتوں پر مشتمل ہے جس کا آدھا حصہ جو ہندی سے متعلق ہے للولال کا کارنامہ ہے۔ ۱۸۱۰ء میں یہ کتاب اردو اور ہندی دونوں خطوں میں شایع ہوئی۔ ۱۸۴۱ء میں کلکتے سے اس کا ایسا ایڈیشن شایع ہوا جس میں سے ناگری رسم الخط کا حصہ خارج کر دیا گیا ہے۔ مشترک رسم الخط کے معاملے میں اس کتاب اور کالج کی بعض دوسری تالیفات میں فرق ہے۔ "بیتال پچیسی" اور "سنگھاسن بتیسی" کے مشترک مواد کو اردو اور ہندی رسم الخط میں علاحدہ علاحدہ چھاپا گیا لیکن "لطایف ہندی" کا آدھا حصہ اردو زبان اور اردو رسم الخط میں تھا اور اسی جلد میں آدھا حصہ ہندی زبان اور ہندی رسم الخط میں تھا۔ یہ کتاب "نقلیاتِ لقمانی" سے مختلف ہونی چاہیے کیوں کہ نقلیات ۱۸۰۳ء میں شایع ہو چکی تھی "لطایف ہندی" ۱۸۱۰ء میں منظرِ عام پر آئی" (ص ۲۳۴/۲۳۵) ڈاکٹر گیان چند جین کی تحقیق کا تازہ ترین ہندوستانی ایڈیشن افسوس کہ ہم دست نہیں ہے، اس لیے

بہ امر مجبوری کتاب کے گزشتہ پاکستانی طبع دوم کے بیان) پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔ قبل ازیں پیش کردہ روایات سے یہ امر خوب واضح بلکہ مسلم الثبوت ہو چکا ہے کہ "لطایف ہندی" کے اردو متن کے مصنف للولال جی کوی ہی ہیں کوئی اور نہیں۔

"لطائف ہندی" کی کہانیاں اور تجزیہ نگاری

پروفیسر جاوید نہال نے للولال جی کوی کا تحریر کیا ہوا اولین قصہ اقتباس کیا ہے

"لطایف ہندی" کی پہلی حکایت اس طرح شروع ہوتی ہے: ایک ساہوکار پوتروں کا راجہ جنم جنم کا خوشحال زمانے کے پیچ پاچ میں اپنی دولت سب کھو بیٹھا اور لگا دکھ پلنے، فاقے کڑاکے کے کھینچے۔ نیز اس کے جی میں یہ خیال گزرا کہ جو میں مہاپرس کے پاس جاؤں تو دکھ مٹے کیوں کہ سنا ہے کہ سادھ (سادھو) کے درشن سے بیادھ (تکلیف) جاتی ہے۔ اتنا بچار جلد جلد کر ایک جوگی کے پاس گیا، یہ اسے کچھ کہنے نہ پایا کہ اس نے اپنے جوگ سے اس کا مطلب دریافت کر کے کہا:

سکھ دکھ ہرت دن سنگ ہے میٹ سکے نا کوے
جیسے چھایا دیہہ کی نیاری نیک نہ ہوے
(ہرت = ہر دن، دیہہ = بدن، نیاری = جدا)
یہ معقول جواب پا کر بے چارہ صبر کر کے اپنے گھر آیا" (ص ۱۷۵)

"لطایف ہندی" سے کہانی نمبر ۵ بھی ڈاکٹر جاوید نہال نے پیش کی ہے: "پانچویں نقل ایک ملا سے عبارت ہے: پٹھانوں کی بستی میں ایک ملا تھا، جو کچھ فاتحہ درود کا ان کا کام ہوتا اسی کو بلوا لیتے اور اپنا کام کروا لیتے۔ اس میں شب برات جو آئی تو ہر ایک گھر سے بلاہٹ ہوئی۔ تب اس کے کسی آشنا نے پوچھا کہ کہو دوست آج تم اکیلے کیا کرو گے اور کس طرح گھر گھر فاتحہ پڑھو گے۔ بولا بھائی مجھے فاتحہ پڑھنے سے کیا کام، مردہ دوزخ میں جاتے یا بہشت، مجھے اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے"۔ (ص ۱۷۱)

للولال جی کوی کی تخلیق کی ہوئی حکایات میں سے دو ڈاکٹر عابدہ بیگم سے منقول ہیں ایک کہانی کے الفاظ ہیں: "ایک اندھا بیراگی کاشی کے بیچ منکرنکا گھاٹ پر بیٹھا گہن میں دہی پیڑے کھا رہا تھا کہ دیکھ کر کسی پنڈت نے پوچھا سورداس جی یہ کیا کرتے ہو۔ بولا مہاراج دہی پیڑے کھاتا ہوں۔ کہا گہن میں۔ جواب دیا بابا میرے گرو کی دیا سے سدا ہی گہن ہے۔ یہ سن کر پنڈت

ہنس کر چپ ہو رہا۔" مطلب یہ کہ جو ہے ہی نابینا اس کے لیے سورج کیا اور سورج گرہن کیا۔
یہاں دہی بیڑے سے مراد غالباً دہی بڑے ہیں نہ کہ دہی سی ترش چیز کے ساتھ دودھ کے میٹھے میٹھے پیڑوں کا کھایا جانا' اس لیے کہ لسانی تغیر کی بنا۔ پر مختلف زبانوں کے علاقوں میں دہی بڑے والے بڑے کا بہروپ یا متبادل یا پھر تلفظ الگ ہے مثلاً پنجابی میں دہی بڑے کو "دہی بھلے" کہا جاتا ہے۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس علاقے میں جو کاشی بنارس پریاگ اور متھرا تک پھیلا ہوا ہے اور دودھ کی انواع واقسام کی مٹھائیوں کا گڑھ ہے۔ دودھ سے بنی ہوئی ان دونوں کھٹی میٹھی چیزوں یعنی دہی اور پیڑوں کا کوئی جوڑ ہو۔ اس کی وضاحت مقامی لوگ ہی بہتر کر سکتے ہیں کہ آیا کہانی میں مذکورہ "دہی پیڑے" میں پیڑے کا لفظ دہی بڑے کے بہروپ کی حیثیت رکھتا ہے یا پیڑے سے مراد دودھ کا پیڑا ہی ہے جس کا ان جگہوں میں دہی کے ساتھ کھانے کا جوڑ ہو۔ راقم کے ایک بزرگ محمد انیس صدیقی صاحب جو الہ آباد کے متوطن ہیں راوی ہیں کہ ان اطراف میں پیڑے اور دہی ساتھ کھانے کا عام سا رواج ہے۔

ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی منقولہ دوسری کہانی کا متن یہ ہے: "ایک روز کسی حبشی نے راہ میں درپن پڑا پایا۔ ہاتھ میں لے جوں اس نے اس میں دیکھا تو اسے اپنے چہرے کا عکس نظر آیا۔ تب لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھ آرسی پر تھوک یہ کہہ کر پھینک دیا کہ جب ایسا بُرا منھ ہے تبھی کوئی رستے میں ڈال گیا ہے۔" (بہ صفحات ۴۱۵/۴۱۶)

للولال جی کوی کی ان مختصر مفید تخلیقات پر رائے دیتے ہوئے پروفیسر جاوید نہال اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے ان کی مناسب تحسین کی ہے۔ ڈاکٹر جاوید نہال کا تاثر ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی نقلیں اپنے دامن میں نصیحت کے موتی سمیٹے ہوئی ہیں۔ اس کتاب کی ہر نقل میں "ساہوکار" پنڈت، رشی، راجا، مولوی، وزیر اور بادشاہ کے کردار مختلف رنگ اور روپ میں نظر آتے ہیں" (ص ۱۷)۔ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ ان اور ان جیسی دوسری باقاعدہ کاوشوں کو جو للولال جی کوی کے معاصروں نے فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی میں پیش کیں اس روایت کا نقش اولین قرار دیا جا سکتا ہے جو اس قدر اور اس حد تک مختصر کہانیوں کی صورت میں ہمارے جدید ادب میں آج بھی برقرار ہے اور مستقبل میں جس کے تسلسل کے امکانات برابر موجود ہیں۔ البتہ طویل اور مختصر افسانوں کی عام قبولیت کی بنا۔ پر اتنے چھوٹے چھوٹے افسانے لکھنے کا رجحان

زیادہ پھل پھول نہیں رہا ہے۔ للولال جی کوی کی یہ تخلیق آج کی اصطلاح میں مختصر ترین افسانہ ہی کہلائی جاسکتی ہیں اور اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ اپنی منقولہ دونوں حکایتوں پر ڈاکٹر جاوید نہال نے لسانی پس منظر کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی گفتگو کی ہے۔

دوسری حکایت کے حوالے سے پروفیسر جاوید نہال نے خیال ظاہر کیا ہے کہ "للولال جی کب کی یہ نقل پڑھتے وقت ذہن پر نامانوس اور ادق سنسکرت لفظ کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں ایک عام فہم سہل اور رواں دواں ہندوستانی لکھنے کی تحریک کو قبول عام حاصل ہو چکا تھا" (ص ۱۷۱)۔ اس رائے کی وقعت کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ پہلے کہانی بھی ملتے جلتے تاثر کی تحریک اور ڈاکٹر جاوید نہال کے خیالات کی پوری طرح تصدیق کرتی ہے۔ کتاب کی حکایتوں کی زبان کو ڈاکٹر سمیع اللہ نے اردو اور برج سے متاثر بتایا ہے جب کہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم "لطایف ہندی" کی زبان کو اردو ہندی کا آسان امتزاج قرار دیتی ہیں جو دونوں ذرائع سے اقتباس کی ہوئی کہانیوں کی روشنی میں قرین واقعہ ہے۔

ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے للولال جی کوی کی ان کہانیوں کے نمونے پیش کرنے سے قبل ان کی زبان و بیان پر جو رائے دی ہے وہ ان کے لسانی ذوق کی مظہر ہے: "ان حکایات میں للوجی کا اسلوبِ بیان ان کی دیگر تصانیف سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ان کے اسلوب میں اردو اور ہندی کے آسان الفاظ کا امتزاج نظر آتا ہے۔ یہ انداز بیان موزوں، واضح اور بے حد رواں ہے، اس اسلوب پر برج بھاشا کے اثرات چھو بھی نہیں گئے ہیں۔ للوجی جہاں ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ اتنے مناسب، شیریں اور آسان ہیں کہ طبع لطیف پر گراں نہیں گزرتے۔ للوجی نے ہر حکایت میں موضوع کے لحاظ سے لب و لہجہ اور طرز بیان بھی بدل دیا ہے" (ص ۲۱۵)۔ منقولہ بالا کہانیوں کی زبان و لفظیات سے بخوبی عیاں ہے کہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم اور پروفیسر جاوید نہال کی موقر آرا سے اختلاف ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے آخر الذکر تاثر کی مناسب تفصیل ڈاکٹر جاوید نہال کے پیش رو ملاحظات میں قابلِ استفاضہ ہے: "للولال جی کی ایک بڑی خوبی اور صفت یہ ہے کہ کہانیوں کے کردار اور ماحول کے مطابق زبان لکھتے تھے اور جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔" (ص ۱۷۱)۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال ہماری معاصر افسانہ نگاری اور اس کی تجزیہ کاری دونوں کی ہی مشترکہ اساس کا

رتبہ رکھتا ہے اور بنا بریں للولال جی کوی کی اس مختصر ترین افسانہ گری کو ہم عصر تخلیقی عمل سے بعد مماثل اور مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ منقولہ راتے کے تسلسل میں پروفیسر جاوید نہال اپنی پیش کردہ دونوں کہانیوں کے لسانی اسلوب پر تقابلی نگاہ کرتے ہوئے اس کے تنوع کو للو لال جی کوی کے قلمی کمالات میں سے تسلیم کرتے ہیں: "پہلی نقل ساہوکار کی ہے، اس کے کردار ماحول اور طرز معاشرت کا خیال رکھ کر زبان لکھی گئی۔ ملاّ کی حکایت میں زبان بدلی گئی۔ یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ ۱۹ ویں صدی کی معمولی حکایتوں میں بھی ان تمام باتوں کا خیال رکھا جاتا تھا" (ص۱۷۱/۱۷۲)

ڈاکٹر شاردا دیوی ودیالنکار نے بھی "لطایف ہندی" کے ناگری متن سے نقل ۱۰۲ پیش کی ہے اور جاریہ بحث میں تبصرہ بھی کیا ہے۔ یہ حکایت بعینہٖ اردو رسم خط میں مطالعہ فرمائیے: "کوئی بنیا بوہی باٹ بھول کے ایک بن میں جا نکلا۔ اسے وہاں اور کوئی تو نہ نظر آیا ہر ایک جوگی دکھائی دیا۔ اس نے اسے دنڈوت کر کے پوچھا ناتھ جی آئے کہاں سے اور جاؤ گے کہاں۔ جواب دیا بابا ہنگلاج جوالا مکھی ہری دوار کر دکشیتر کر کے تو آتا ہوں اور کاشی ہو گنگا گوداوری کا میلہ کر سیتا بندھ رامیشور کو جاؤں گا۔ بنیے نے کہا مہاراج ایک بات پوچھوں جو خفا نہ ہو۔ بولا بابا ایک نہیں دو۔ کہا مہاراج ہم گرہستی ہیں جو دیس دیس پھریں تو کچھ دوش نہیں: آپ فقیر ہو بھٹک بھٹک کیوں بھرم گنواتے ہو، ایک ٹھور بیٹھ کر کس لیے اپنے بھگوان کا دھیان نہیں کرتے! (ص۱۷۰) ۔ اس نقل کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ ہی دیا ہے۔

یہاں سلسلۂ بحث یہ ہے کہ "پریم ساگر" کے خاص حوالے سے کھڑی بولی پر شاردا دیوی صاحبہ کا مفصل تجزیہ جاری ہے جس کی مناسبت سے انہوں نے "لطایف ہندی" میں للولال جی کوی کی نگارشں سے بھی استدلال کیا ہے۔ ڈاکٹر ودیالنکار موصوفہ کا منقولہ اقتباس پر تبصرہ اسی گفتگو کا تسلسل ہے، چنان چہ ان کا بیان ہے کہ "اس نقل کی زبان کھڑی بولی ہندی، "پریم ساگر" سے بڑی ملتی جلتی ہے جیسا کہ ان مثالوں سے ظاہر ہے۔ بھرم، جوگی، گرہستی، ٹھور، دھیان، ڈنڈوت، کہن۔ لیکن زیادہ تر کہانیاں یا نظمیں ہندوستانی ہی ہیں۔ ساتھ ساتھ قصّے اور اشعار فارسی اور برج میں بھی ہیں اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ "ریختہ" سے للولال کی مراد ہندی اور ہندوستانی کے آمیزے سے ہے۔" ڈاکٹر شاردا دیوی کی روایت ہے کہ "لطایف ہندی" کے سرورق پر تحریر ہے کہ یہ نقلیات "ریختہ" میں تصنیف کی گئیں جس کی انہوں نے منقولہ توجیہہ پیش کی۔

ان صفحوں میں اقتباس کی ہوئی ساری نقلوں پر فرداً فرداً اظہار خیال موجب طوالت ہوگا اس لیے "لطایف ہندی" کی صرف ایک حکایت کے بارے میں مختصراً سا معروضہ ہے۔ للو لال جی کوی نے مثلاً اندھے کی کہانی کی معدودے چند سطروں میں جس طرح ایک بڑے موضوع کو سمو دیا ہے وہ بے حد قابلِ داد ہے اور اس پر طبیعت عش عش کرتی ہے۔ انہوں نے اندھے کی زبانی معرفت الٰہی کا تصور جس نکتہ طرازی کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہوگی۔ کیا پیاری بات کہی ہے کہ "میرے گرو کی دیا سے سدا ہی گھن ہے"۔ خدا پرستی کے دقیق مباحث کے صفحوں کے صفحے ایک طرف اور یہ سادہ اور پُرکار جملہ ایک طرف جس میں للو لال جی کوی کی تخلیقی فسانہ گری نے ایک جہانِ معانی سمیٹ لیا ہے، اس کی برجستگی اور دل نشینی کے کیا کہنے۔ شاید "از دل خیزد بر دل ریزد" ایسی ہی پُر تاثیر باتوں کے لیے کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کہانی میں گرو سے مراد کوئی مہارشی یا گرو دیو نہیں ہے جس کا وہ اندھا چیلا ہو، اور نہ ہی یہ لفظ کسی پیر طریقت یا مرشد و ہادی کی طرف اشارہ کناں ہے۔ نہ ہی اندھے کا کردار کسی صوفیٔ صافی صفات کا نمایندہ ہے، مگر جب اس کی بات ختم ہوتی ہے تو ایک دم یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک عارف باللہ کا مقام پایا ہوا ہے۔ اپنے کل ملاکر دس الفاظ کے فقرے میں وہ بڑے بڑے پہنچے ہوتے بزرگوں کی برابری کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ تخلیق کار کا اپنا اعجاز مسیحائی ہے کہ ایک اَن پڑھ اَن جان اندھے کے کردار کو اس نے خدا رسیدہ کر دکھایا ہے۔ للّو لال جی کوی کی اس مختصر ترین کہانی کو نفس موضوع کے احاطے کے اعتبار سے "دریا بہ حباب اندر" جیسی عارفانہ تخلیق کہا جا سکتا ہے۔

"لال چندریکا" مختصر تعارف

"لال چندریکا" ہندی نثری تصنیف ۱۸۱۸ء

پروفیسر سید محمد نے اوّلاً اس کا ذکر ہندی ادب کی انگریزی تاریخ مصنفہ ایف اے کی کے حوالے سے کیا ہے: "للولال نے بہاری لال کی "ست سئی" کی جو "لال چندریکا" کے نام سے مشہور ہے ہندی ہی میں شرح بھی لکھی ہے۔ یہ تالیف بہت ہی کم مشہور ہوئی" (ص ۲)۔ مولوی سید محمد کی ہی سند پر ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے متفرقات کی توضیحی فہرس میں "لال چندریکا: للوجی کوی" کی سرخی کے تحت بہ صفحہ ۱۶۳ اس کتاب کا تذکرہ سال نگارش کے اضافے کے ساتھ کیا ہے: "للوجی نے ہندی کے شاعر بہاری کی "ست سئی" کی شرح "لال چندریکا" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کی زبان ہندی ہے۔ یہ ۱۸۱۸ء کا کارنامہ ہے۔ اس کے بارے میں مزید تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔" یہ ایک اتفاق ہے کہ "بہاری ست سئی" کے خالق بہاری لال اور ان کے ان سات سو دوہوں پر اردو میں جو کام تذکرتاً اور اشارتی قسم کا ہوا ہے اس کے علاوہ مقالات کے مصنفین کے یہاں بھی حوالہ واکتساب کے آثار مفقود ہیں۔

علامہ نیاز فتحپوری کی مختصر کتاب "جذبات بھاشا" مطبوعہ ۱۹۱۳ء کو غالباً اردو میں اس حیثیت سے اوّلیت حاصل ہے کہ اس میں جائسی کی "پدماوت" کے عشقیہ اشعار کے ساتھ خان خاناں اور بہاری لال کے دوہوں سے چھوٹا سا انتخاب مع تشریح موجود ہے۔ نیاز صاحب نے ہی بعدازاں "نگار" کے "ہندی شاعری نمبر" (۱۹۳۶ تا ۱۹۸۴ء) میں مشمولہ ایک اور مختصر تصنیف "ہندی شاعری کی تاریخ" میں بہ عنوان "عہد مغلیہ کے باقی شعرا" بہاری لال کے ذکر کے علاوہ اسی نمبر میں مندرجہ مقالے "ہندی شاعری اور جذباتِ محبت" میں متذکرہ آٹھ شعراء کے ہم راہ بہاری کے نو دوہے ہندی وار دو رسم خط میں مع مطالب پیش کیے ہیں۔ بہاری اور "بہاری ست سئی" سے متعلقہ تینوں ہی نگارشاتِ نیاز میں للولال جی کوی کی اس شرح "لال چندریکا" کا کوئی حوالہ نہیں ہے گو "بہاری ست سئی" کی "کم از کم تیس شرحیں" اور "ہندی اور سنسکرت اور انگریزی میں تقریباً سینکڑوں شرحیں" لکھے جانے کا ذکر انہوں نے بہ صفحات ۲۰ و ۱۲۷ دونوں

مقالات میں کیاب ہے۔ "نگار" کے اسی "ہندی شاعری نمبر" کے دواور مقالات یعنی احتشام رضوی کے "مغلیہ حکومت اور ہندی شاعری" نیز بہ خصوصیت ڈاکٹر اعظم کریوی کے "ہندی کا مشہور حسن نواز شاعر: بہاری" تک میں جو ان کی تجزیاتی تصنیف "ہندی شاعری" کا غالباً ایک باب ہے للولال جی کوی کی شرح "لال چندریکا" کا ذکر ناپید ہے۔

منشی پریم چند سے بھی بہاری لال اور "بہاری ست سئی" پر دو مطالعات یادگار ہیں۔ پروفیسر عتیق احمد کے مرتبہ مجموعے "مضامین پریم چند" (کراچی ۱۹۸۱ء) کا مقالہ "بہاری لال" مصنفہ ۱۹۱۷ء محققانہ مزاج کا حامل ہے اور "ست سئی" کے شارحین کے ساتھ پانچ مسلمان مبصروں کا جایزہ پیش کرتا ہے۔ ہندوستانی اسکالر مانک ٹالا کی تالیف "پریم چند اور تصانیف پریم چند کچھ نئے تحقیقی گوشے" (دہلی ۱۹۸۵ء) میں مندرج مضمون "بہاری ست سئی" نامی جدید ہندی شرح مصنفہ ۱۹۲۰ء پر تبصرہ ہے۔ متذکرہ نگارشات میں پریم چند نے بھی للولال جی کوی کی "لال چندریکا" کی شرح کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔

ہندی شاعری اور ادبیات پر حیدر آباد کے اسکالر سیاستداں پنڈت ونشی دھر ودیالنکار نے طویل سلسلۂ تجزیات میں "بہاری لال کا بیانِ حسن" نامی ایک عمدہ تعارف تحریر کیا جو "اردو" میں اکتوبر ۱۹۲۸ء میں شایع ہوا۔ یہ مقالہ فی الوقت زیر استفادہ نہیں ہے چنانچہ کچھ نہیں عرض کیا جا سکتا۔ ست سئی یا سات سو دوہوں کی شعری روایت کے سلسلے کے معاصر اور فاضل پاکستانی خالق اور "عشق ست سئی" کے مصنف ڈاکٹر الیاس عشقی نے بھی "عشقی ست سئی" کے مقدمے (مطبوعہ "سیپ" نمبر ۵۰ کراچی) میں للولال جی کوی کا حوالہ نہیں دیا۔ اس کا بہر حال افسوس ہے کہ للولال جی کوی کی اس شرح "لال چندریکا" کا کوئی ذکر اردو کے متعلقہ جایزوں میں نہ تو نظر نواز ہو سکا اور نہ ہی اس کے "ہندی ساہتیہ کوش" ج ۲ سے ماخوذ "چرتر کوش" میں منقولہ کوایف میں "لال چندریکا" درج ہے جو غلط ہے جب کہ ایک اور ہم موضوع کتاب "بہاری بہار" کا بھی اس فہرس میں اضافہ ہے جس کی کوئی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔ زیادہ کی جستجو فی الوقت حیطۂ امکان میں ہے۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ بہاری لال پر ہندی کے نئے پرانے تحقیقی و تنقیدی کاموں میں للولال جی کوی کے اس کارنامے کا کوئی حوالہ نکل آتے۔ اس سلسلے کی تازہ ترین کڑی "بہاری ست سئی" کے ہندی ترجمے مطبوعہ دہلی ۱۹۹۰ء میں کرشنا بہادر کے مقدمے کی ہے، ہو سکتا ہے اس ایڈیشن میں للولال جی کوی کی شرح "لال چندریکا" سے فایدہ اٹھایا گیا ہو۔

اقتباسات پیش لفظ و تعارف از گریرسن۔

حسن اتفاق کہ مبیضہ نویسی کی تکمیل سے عین قبل "بہاری ست سئی" کے گریرسن ایڈیشن سے چند بڑے اہم اوراق کے عکس برٹش لائبریری کے کیوریٹر اور راقم کے کرم گستر سلیم الدین قریشی صاحب نے عطا کرنے کا اہتمام فرما دیا ہے۔ گریرسن نے اپنے پیش لفظ مورخہ ہوڑہ ۲۹/۳/۱۸۹۵ء کے علاوہ طویل عالمانہ تعارف کی بھی چند سرخیوں کے تحت للولال جی کوی اور ان کی شرح "لال چندریکا" پر گفتگو کی ہے۔ سرورق کے الفاظ ابتدائی سرفہرست میں نقل کیے جا چکے ہیں یہاں اولاً پیش لفظ سے للولال جی کوی سے متعلق دو ابتدائی پیراگرافوں کی ترجمانی ملاحظہ ہو: کوئی تین سال قبل معلوم ہوا تھا کہ ہندی کے سرکاری امتحان آنرز کی نصابی کتاب "لال چندریکا" کے نسخے بازار میں دستیاب نہیں اور مجھ سے کہا گیا تھا کہ اس کے ۱۸۱۹ء کے پہلے اور واحد ایڈیشن کے طبع نو کا اہتمام کروں۔ اس وقت خیال یہی تھا کہ اصل اشاعت کا صرف اعادہ کافی رہے گا اور ضروری اغلاط کی درستی ہو جائے گی، مگر جیسے جیسے کام آگے بڑھا مجھے ناممکن معلوم ہونے لگا کہ کتاب ایسی حالت میں میرے ہاتھوں سے نکلے۔ طباعت کی اغلاط ہر صفحے پر عیاں ہونے لگیں جو اہم قابل اصلاح غلطیوں کے علاوہ تھیں اور یوں کام بڑھتا گیا حتیٰ کہ اب یہ ایک کافی توجہ سے نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن بن گیا ہے۔

ان افتتاحی کلمات کے بعد گریرسن کا کہنا ہے کہ "میں نے بہاری کے متن کو قدرے آزادی کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے لیکن للولال جی کوی کی شرح کے مدنظر ان کے دیے ہوئے متن سے حتی الامکان مطابقت کو ملحوظ رکھا ہے۔ جہاں تک شرح کا تعلق ہے مجھے اس کا احساس رہا ہے کہ طبع اول مصنف کے اپنے چھاپے خانے اور ان کی ذاتی نگرانی میں شایع شدہ ہے، چنانچہ میں ان کی زبان میں ان مقامات پر بھی کسی تبدیلی کا اختیار نہیں رکھتا جہاں وہ واضح طور پر غلط ہے۔ میں نے خود کو ان کی طباعتی غلطیاں صحیح کرنے تک محدود رکھا۔"

گریرسن کے ۱۹ صفحوں کے تعارفی مقدمے کے ص ۱۲ کی سرخیاں خاص للولال جی کوی کی اسی شرح پر ہیں: "پروز آف لال چندریکا" اور "لال چندریکا آیز اے کمینٹری"۔ ان دو مباحث کی ترتیب وار ترجمانی ذیل میں کی جا رہی ہے تاکہ گریرسن کے ادبی تبصرے کا افادہ عام ہو سکے،

"لال چندریکا" کی نثر پر اس کے خیالات پہلے مطالعہ فرمایئے: "لال چندریکا" میں مصنف نے "ست سئی" کی ہر نظم کی فقط نثری ترجمانی کا خیال رکھا ہے اور شرح میں اصل الفاظ کی ترتیب

کو بعینہٖ ملحوظ رکھا ہے۔ اس طرح اس نے ہندی نثر کے متبرک ضوابط کی متواتر خلاف ورزی کے گناہ کا ارتکاب کیا ہے، چنانچہ یوروپی طلبا کو اس کتاب کو ہندی نثر کا کوئی نمونہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ ایسا فرض کرنا اس زبان میں ان کی اپنی کاوشوں کو بے ڈھب اور ناقابل فہم بنا دے گا۔ دراصل "لال چندریکا" کی نثر کلاسیکی ادبیات کے قدیم ڈیلفن ایڈیشنوں سے خاصی مشابہ ہے جو طلبا کے استفادے کے لیے تو کارآمد ہوتے ہیں مگر مستقبل کی اعلا جماعتوں کے لیے اسلوب کا کوئی نمونہ نہیں ہوتے۔"

"لال چندریکا بہ طور شرح" کے متصل عنوان کے تحت گریرسن نے قدرے مکمل کر لکھا ہے "لال چندریکا" کی خوبیوں کا جہاں تک سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اپنی حیثیت سے زیادہ مانی ہوئی کتاب ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ "ست سئی" کے معانی کی شارح کے بہ طور یہ اتنی اچھی ہے جتنی "ہری پرکاش"۔ اس کی بڑی خصوصیت نظم کی موزونیت پر اس کی شرح ہے جو بہرحال تمام مواقع پر درست نہیں ہوتی ہے۔ بعض تصریحوں پر اس کا تعرض اور جواب اکثر کڈھب یا بے ڈھنگا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب مصنف ہندوستانی سماج کے اس پہلو پر جس کا رواج ہے جیسے بہ جیسے ہوتا ہے جو ایک لڑکی کے اس کے دیور کے ساتھ میل جول سے متعلق ہے۔ تاہم "لال چندریکا" "ست سئی" کی مکمل ترین شرح ہے۔ چند اعتبارات سے دوسری شرحیں اس پر بھاری ہیں لیکن ایسی اور کوئی نہیں ہے جو اتنے سارے زاویوں سے ان نظموں سے تعرض کرتی ہو۔ جن مقامات پر میں نے کوئی کمی محسوس کی ہے وہاں دوسری شرحوں کے بیانات اضافہ کیے ہیں۔ ہندی ضمیمہ بھی میں نے دیا ہے جس میں ان حصوں سے بحث کی ہے جن کو میری راتے میں سابقہ شارحین نے بہ خوبی روشن نہیں کیا ہے۔" فوری بعد کی سرخی "میٹرس آف ست سئی" "دی دوہا" پر اوزان و بحور کی گفتگو سے قبل مرتب نے دو اور نکات کی طرف اشارہ کیا ہے: "دو امور قابلِ لحاظ ہیں ان میں سے ایک یعنی بحر پر للو لال جی نے شاید ہی کچھ لکھا ہے، جب کہ ہندوستانی نغز گوئی پر انہوں نے خاصی بحث کی ہے۔"

مقدمہ للو لال جی کوی "گرنتھ ورنن"

"لال چندریکا" کے اس گریرسن ایڈیشن میں کتاب کا آغاز للو لال جی کوی کی جن منظوم و منثور نگارشات سے ہوتا ہے ان کے من جملہ ان کے مقدمہ "لال چندریکا" کا متن ناگری

بعینہ منقول ذیل ہے۔ اس ہندی کو اردو کے لباس کے علاوہ ترجمانی کی کوئی حاجت نہیں معلوم ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

"بہاری ست سئ" کی جتنی پوتھی دیکھیے گا تتنی پوتھیوں میں دوہوں کا کرم جدا ہی پائیگا۔ ایک پوتھی کے کرم سے دوسری پوتھی کے دوہوں کا کرم نہ ملے گا۔ اس کا کارن یہ ہے کہ ایک سمے آمر کے دھنی مہاراج سوامی جے شاہ کسی راجا کی بیٹی بیاہ لاتے، وہ اتی سندری اور چتر تھی۔ اس کے روپ اوگن سے آسکت ہو راج کاج بھلاتے مندر (محل) کے بھیتر ہی رہنے لگے، اور کہا کہ جو کوئی راج کاج کے سماچار باہر سے لاتے مجھ سے کہے گا تسے توپ کے منھ اڑوا دوں گا۔ یہ بات سن ڈر کے مارے کوئی راجا سے راج کاج کی بات نہ کہے او راجا آٹھوں پہر آنند میں رہے۔ اس میں ایک یگ بیت گیا، او راج دھانی میں راجا کی اپدرو ہونے لگا۔ تب سب دیوان مستدھیوں نے اکٹھے ہو وچار کری ٹھہرایا کہ کوئی کوئیشور آوے تو راجا کو چیتا دے۔ یہ بات سن پردھان نے بہاری لال کوی کو بلاتے سمجھاتے کے کہا مہاراج کچھ ایسا اپلاتے کی جیسے جو راجا اپنے کام کاج کی سرت کرے۔ کوی نے بات کے سنتے ہی یہ دوہا (   ) لکھ کر دیا:

نہی پراگ نہی مدھر مدھو نہی بکاس اہیں کال
الی کلی ہی توں بتدھیوں آگے کون حوال

او کہا اس دوہے کو جیسے بنے تیسے راجا کے پاس بھیج دو۔ پردھان نے لکھا ہوا دوہا لے پھولوں کی چادر جو سیج پر بچھنے کو بنی تھی اس میں بندھواتے دیا۔ جب راجا نے پلنگ پر آرام کیا اور پھول کھلا وہ کاگد شریر میں چبھا تو اٹھ کر دیکھا، او کاگد نکال دوہا پڑھا۔ پڑھتے ہی اٹھ کر باہر آیا، دربار کیا او سب سے پوچھا کہ سچ کہو یہ دوہا کس کوی نے بنایا، میں اس سے بہت پرسن ہوں اسے بلوا دو۔ اتنی بات کے سنتے ہی پردھان نے کوی کو بلا بھیجا، وہ راج سبھا میں آیا۔ کوی کو برہمن دیکھ کر راجا نے ڈنڈوت کی۔ اس نے اسیس دی۔ راجا نے اتی مان سمان کری، بیٹھاتے کے کہا کہ مہاراج تمہارے دوہے سے میرا چت اتی پرسن ہوا۔ ادھک کیا کہوں، جتنے دوہے بنالاؤ گے تتنی مہر پاؤ گے۔ راجا کی آگیا پاے کوی نے پانچ پانچ سات سات کر سات سے دوہے بنا دیئے او سات سے مہر لیں۔ اسی سے اس کا نام "ست سئ" ہوا۔ او گدی نے نایکا بھید کے کرم سے گرنتھ نہیں بنایا، جس کے ہاتھ جس بھانت دوہے آئے

اس نے اس بھانت لکھے۔ اس کارن اِس گرنتھ کے دوہوں کا کرم برابر نہیں ملتا۔ ٹیکا کاروں نے اپنی اپنی بدھی پرمان دوہوں کی مِسل لگائی، پر ہم نے کسی ٹیکا کی مسل بندی پر لال چندریکا کی مسل نہیں رکھی۔ اعظم شاہی ست سئی کی مسل بندی کے کرم پر دوہوں کا کرم رکھا ہے کیوں کہ اعظم شاہ نے بہت کویوں کو بلواتے بہاری ست سئی میں نرپ اِستتی کے دوہے چھوڑ جو دوہے سات سو سے ادِھک اور کبیوں کے بناتے جو ملے ہیں، تن میں سے جس کا ٹھکانا ٹیکا کاروں کے گرنتھ میں پایا تسے پیچھے رہنے دیا۔ اور جس کا پرمان کہیں نہ پایا تسے نکال باہر کیا۔ آو ادھک دوہے اور کویوں کے رہنے دیے۔ اس لیے وَے ایسے مل گئے ہیں کہ ہر کسی کو معلوم نہیں سواتے پراچین ست سئی دیکھنے والوں کے۔ اور جو ادِھک دوہے اس گرنتھ میں نہ رکھتے تو لوک کہتے کہ ست سئی میں سے دوہے نکال ڈالے، اَو یہ کوی نہ سمجھتا کہ وَے ست سئی کے دوہے نہ تھے۔ اس لیے دو ٹیکا کاروں کا پرمان لے ادِھک دوہے رہنے دیے۔"

للولال جی کوی کی ان تعارفی سطور کے بعد کتاب کے طابع کی تحریر ہے جو ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے: "گرنتھ چھپا سنسکرت پریس میں۔ چھاپا شری گرو داس پال نے الخ" جس کے بعد کئی کتابوں کی فہرست درج ہے۔ اس فہرست میں للولال جی کوی کی بھی مطبوعات ہیں اور کچھ اردو کتب کے بھی شاید دیوناگری ایڈیشن اس میں شریک ہیں۔ اخیر میں یہ اطلاع بھی ہے کہ "تسے کلکتے میں دو ٹھور ملے گی، ایک پٹل ڈانگے میں شری للوجی کے چھاپے خانے میں الخ" جس سے للو لال جی کوی کے مطبع کا محل وقوع معلوم ہو جاتا ہے۔ مندرجہ فہرست کے حوالے سے حاشیے میں گریرسن نے لکھا ہے: "مرتب نے للولال جی کی مطبوعات کا اشتہار بحال رکھا ہے کہ کتابیات کی غرض سے یہ اہم ہے۔" تاہم اسی فہرست سے یہ مظہر ہے کہ یہ صرف للولال جی کوی کی نہیں بلکہ اغلب ہے کہ اس مطبع کی کتابوں پر مشتمل ہے کیوں کہ اس میں کئی ایسی اردو ہندی کتب بھی ہیں جن کا للو لال جی کوی سے کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ تفصیلات کے لیے یہ آخری پیراگراف حاشیے میں ملاحظہ ہو[1]۔

---

1 : "گرنتھ چھپا سنسکرت پریس میں۔ چھاپا شری گرو داس پال نے جس کسی کو چھاپے کی پوتھی لینے کی ابھیلاشا ہو، لال چندریکا، مادھو ولاس، برج ولاس، سبھا ولاس، سنہاسن بتیسی، برندست سئی، تلسی کرت رامائن، ونے پتریکا، گیتاولی، رام ست سئی، پریم ساگر، راج نیتی، نظیر کے شعر، بھاشا قاعدہ، لطایف ہندی، صرف اردو، تسے کلکتے میں دو ٹھور ملے گی۔ ایک پٹل ڈانگے میں شری للوجی کے چھاپے خانے میں، او بڑے بازار میں شری بابو سیتی چندر گوپال داس کی کوٹھی میں شری ہری دیو سیٹھ کے یہاں۔"

"لال چندریکا" کے عنوانیے کی جھلک۔

للولال جی کوی نے جیسا کہ منقولہ گزشتہ خود نوشت میں تحریر کیا "لال چندریکا" کی تہذیب نو کی خاطر "بہاری ست سئی" کے تمام تر پیش رو ایڈیشنوں کو تحقیقی نظر سے ملاحظہ کر کے نظموں اور ان کے دوہوں کے اصل متون کی نئی ترتیب و تدوین کا اہتمام کیا۔ ان کے استفادے میں ست سئی کے جو گزشتہ ایڈیشن تھے ان میں سے اعظم شاہی ست سئی کو انھوں نے قرین اعتبار جانا جب کہ ان کے پیش نگہ انوراچندریکا، امرچندریکا، ہری پرکاش ٹیکا، سنسکرت ٹیکا، کرشن کوی کی ٹیکا کورت والی، کرشن لال کی ٹیکا، پٹھان کی ٹیکا کنڈلیوں والی نامی سات شرحیں موجود تھیں۔ فاضل مرتب گریرسن نے چند اور شارحین ست سئی کو ملا کر کل ۱۳ شرحوں کی توضیحی فہرست سازی کی، جب کہ یہ خصوصیت اعظم شاہی ست سئی پدد ابتدائی و آخری عنوانات سے مباحث اور مندرجات پیش کیے ہیں۔ نمونتہً "گریرسن" نے "انوراچندریکا" کے عنوانات بھی نقل کیے ہیں جن کا للولال جی کوی کی "لال چندریکا" کی سرخیوں سے اجمالی تقابل یہاں ممکن ہے۔ "انوراچندریکا" کو ۱۷۴۱ء میں نواب انور خاں کے درباری شعرا نے تالیف کر کے اسی کے نام سے معنون کر دیا تھا۔ بہ ظاہر یہ بہاری ست سئی کی شرح ہے لیکن ص۱۹ سے "انوراچندریکا" کی ترتیب نقل کرنے سے پیشتر گریرسن نے بیان کیا ہے کہ یہ دراصل ہندوستانی نغز گوئی کا تصریحات نامہ ہے جس میں کلام بہاری کو بہ طور مثال کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔

چونکہ خود للولال جی کوی کی "لال چندریکا" سے مکمل فہرست عنوانات کا اعادہ فی الحال ناممکن ہے "انوراچندریکا" کی ترتیب سے صرف چار اولین حصوں کی سرخیاں مطالعہ فرمائیے۔ اس مختصر جائزے سے اندازہ ہوگا کہ للولال جی کوی کی کتاب "لال چندریکا" کا عنوانیہ کس درجہ شرح و بسط کا حامل ہے۔ "انوراچندریکا" کا افتتاحی جز دیا "پرکاش" موسومہ "منگل چرن" اور دوسرا بعنوان "سادھارن نامیکا ورنن" بھی کوئی ذیلی سرخیاں نہیں رکھتا ہے۔ تیسرا جز و بنام "چکھ نکھ ورنن" ۲۵ عنوانوں پر مشتمل

---

۱ : "گرنتھ چھپا سنسکرت پریس میں۔ چھاپا شری گروداس پال نے جس کسی کو چھاپے کی پوتھی لینے کی ابھیلاشا ہو "لال چندریکا"، مادھو ولاس، برج ولاس، سبھا ولاس، سنہاسن بتیسی، برند ست سئی، تلسی کرت راماین، ونے پتریکا، گیتاولی، رام ست سئی، پریم ساگر، راج نیتی، نظیر کے شعر، بھاشا قاعدہ، لطایف ہندی، صرف اردو، تسے کلکتے میں دو ٹھور ملے گی۔ ایک پٹل ڈانگے میں شری للوجی کے چھاپے خانے میں اور بڑے بازار میں شری بابو لچندر گوپال داس کی کوٹھی میں شری ہری دیو سیٹھ کے یہاں۔"

ہے جو یہ ہیں اور "ورنن" بطور لاحقہ سب سرخیوں کے ساتھ لازماً شریک ہے۔ "للا تا ورنن' نترا' ناسکا' چراولنا' کپولا' ادھارا' داشنا' چھبکا' مکھ ورنن' گرلیو' ہردے کشا' کڑائے' ادارا' کاتی' جنگھا' مراوا' چرن' سکمار تا' گاترا ورنن۔ "انوراچندریکا" کا چوتھا حصہ "تری ودھانا ئیکا ورنن" ان تین عنوانوں پر منقسم ہے۔: مگدھا ورنن' رادھیکا ورنن اور پراؤدھا ورنن۔

"لال چندریکا" کا حصہ اول "نا ئیکا نیا ئیکا ورنن" ۷ عدد افتتاحی سرخیوں کے بعد ابتدائی تین ضمنی عنوانوں کے تحت ہر ایک کہانی میں متعدد سرخیاں رکھتا ہے۔ پہلے جزو کے اولین سات عنوانات یوں ہیں: منگل چرن' بانیکا ورنن' مکتا ورنن' کنڈلا ورنن' پشاپتا ورنن' مرلی ورنن' گونج مالا ورنن۔ اس حصہ اول کے پہلے تین اجزاء بھیدوں سے منسوب ہیں یعنی چتر ودھانا ئیکا بھید' تری ودھانا ئیکا بھید اور داسانا ئیکا بھید۔ صنف جمیل کے خصوصی حوالے سے روح انسانی اور علم الابدان کے اسرار اور لطیف و نفیس نکات کی یہ بیک وقت روح پرور اور رومان پرور تشریح و تفصیل جسمانی اعضاء کے حظ اندوز و لطف انگیز اور باریک بین مشاہدات سے معمور ہے۔ حسن پرستی کے رمز اولین "چتر ودھانا ئیکا بھید" کے یہ چار برنن یا بیان ہیں: انوکولا نا ئیکا ورنن' دکشنا نا ئیکا ورنن' چھتا نا ئیکا ورنن' اور دھرشٹا نا ئیکا ورنن۔ رمز دوم "تری ودھانا ئیکا بھید" کے اسرار چار بیانوں پر مرتب کئے گئے ہیں: سواکیہ نا ئیکا ورنن' پراکیہ نا ئیکا ورنن' گرو تا ورنن' اور انیا سمبھوگا دکھیتا ورنن۔ تیسرا بھید "داسانا ئیکا بھید" متعدد اور متفرق بیانات کو جامع ہے۔ یہاں بہ طور نمونہ دوسرے بھید کے پہلے برنن کے عنوانات پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ کاوشِ ہٰذا اس سے زیادہ تفصیلوں کی متحمل نہ ہوگی۔

"نا ئیکا نیا ئیکا ورنن" نامی لال چندریکا کے افتتاحی جزو کے رمزِ دوم "تری ودھانا ئیکا بھید" کے اولین بیان موسومہ "سواکیہ نا ئیکا ورنن" کی دو ابتدائی سرخیاں ہیں: گندھر اودواہ ورنن اور اسوراودواہ ورنن جن کے بعد مگدھا نیز مدھیا اور پراودھا نامی تین عنوان ضمنی قایم کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک میں بالترتیب چھے نیز تین اور دو ذیلی سرخیاں باندھی گئی ہیں جن کو ورنن یا بیان ہی قرار دیا گیا ہے۔ پہلے جزو "مگدھا" کے ۶ حصے یوں موسوم ہیں: انکوریتا کوونا ورنن' نوایوونا جنا تا یوونا' نوودھا' وِکر بدھا نوودھا اکلپبی تا کاما ورنن"۔ "مدھیا" کی ذیلی سرخیوں کو لجا ہریوا ورنن' سمانا لجا کاما اور نیونا لجا کا نام دیا گیا ہے۔ "پراودھا" کے صرف دو عنوانات ہیں: سمتا رس کوودا اور مدن متا ورنن۔

اس اجمال سے ہی تصور فرمائیے کہ للولال جی کوی نے "لال چندریکا" کی تبویب و ..

تہذیب سے لے کر تشریح و تعبیر تک میں ذوق نمود سے لے کر ذوق جمال تک کے کتنے اور کیسے کیسے مظاہر نہ پیش کیے ہوں گے۔ اسی خاص الخاص مناسبت سے "لال چندریکا" پر تعارفی نگاہ کے آخر میں ایک اور مرتبہ یہ معروضہ ناگزیر معلوم ہو رہا ہے کہ برصغیر کی قدیم السنہ و ادبیات کے جدید ماہرین جس قدر جلد للو لال جی کوی کے کارناموں کی تدوین نو اور پیش کش پر اپنی عالمانہ توجہات منعطف فرمائیں، علوم کی نئی پہنائیوں کی دریافت اور ان سے اکتساب کے وسیلے سے ارتقائے ذہنی اور تنظیمی ترقی کے اجتماعی عمل کے حق میں اتنا ہی بہتر رہے گا۔ اس طرح ہم اپنی آنے والی نسلوں کی دماغی تربیت اور ان کی روشنی طبع کے لیے کچھ مفید و مثبت انتظام کر جائیں گے۔

"بیتال پچیسی" ہندی و اُردو

للولال جی کوی کا ہندی ترجمہ "بیتال پچیسی"

للولال جی کوی کی مدد سے مظہر علی خاں وِلا کا ترجمہ "بیتال پچیسی" فورٹ ولیم کالج کی تواریخ اور ادبی تحقیقات میں بھی متفق علیہ ہے اور یہ ایک بڑی عامتہ الورود سی اطلاع ہے، چنانچہ اس سلسلے کی متعدد روایات کا حوالہ یہاں بہ ظاہر غیر ضروری ہوگا اور صرف وِلا کے اپنے قول سے رجوع کافی رہے گا۔ اس مناسبت سے وِلا کے ہی بیانات اوّلاً منقول ہیں جن کے ساتھ ہمارے چند افاضل کے اظہارات بھی پیش ہوں گے کہ ان کے وسیلے سے للولال جی کوی کی ادبی سوانح کے ایک بے حد قابلِ غور اور نہایت توجہ طلب انکشاف کی راہ از خود ہموار ہوگی۔

مظہر علی خاں ولا کا ایک مجمل بیان ان کے ترجمہ "جہاں گیر شاہی" ("جہاں گیر نامہ") کے ابتدائیے سے کسی ماخذ میں نقل ہوا ہے جس میں "مادھونل کام کندلا" کے علاوہ "بیتال پچیسی" کے تراجم میں للولال جی کوی کی معاونت کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے: "جان گل کرسٹ صاحب کی خدمت میں جو زبانِ ہندی کے مدرس تھے متعین ہوا اور ممدوح کے فرمانے سے "مادھونل" اور "بیتال پچیسی" سے جو برج بھاشا میں ہیں ان کا ترجمہ للولال کب کی مدد سے اس طرح کیا کہ بیشتر برج کی بولی "بیتال پچیسی" میں رہنے دی کہ مرضی صاحب مدرس کی یوں تھی" (ضمیمہ "بیتال پچیسی" ص ۱۷۳ گو ہر نوشاہی ایڈیشن)

"بیتال پچیسی" کے اپنے تعلق سے اسی اجمال کی تفصیل کتاب کے "ابتدائے داستان" میں مذکور ہوتی ہے جس میں ولا کے دو متصل بیانات اہمیت کے حامل ہیں، چنانچہ ان کے الفاظ ہیں کہ "مظہر علی شاعر نے جس کا تخلص ولا ہے واسطے سیکھنے اور سمجھنے صاحبانِ عالی شان کے بموجب فرمان جناب گل کرسٹ صاحب کے زبان سہل میں جو خاص و عام بولتے ہیں۔ اور جسے عالم جاہل گنی کوڑھ سب سمجھیں اور ہر ایک کی طبیعت پر آسان ہو، مشکل کسی طرح کی ذہن پر نہ گذرے اور برج کی بولی اکثر اس میں رہے، شری للولال جی کوی کی مدد سے بیان کیا تھا" (ص ۱ طبع نوشاہی) اس تسلسل میں وِلا کی "ابتدائے داستان" کی آخری سطور یہ ہیں: "پھر موافق ارشاد مدرس ہندی خداوند نعمت جناب کپتان جیمس موٹ صاحب کے تاریني چرن مترا نے چھاپے کے واسطے

سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ کو، جو ریختے کے محاورے میں کم آتے ہیں نکال کر مروج الفاظ کو داخل کیا۔ مگر بعضی اصطلاح ہندوؤں کی جس کے نکالنے سے خلل جانا بحال رکھی۔ امید ہے کہ حُسنِ قبول پاوے۔" (ص ایضاً)

ظاہر ہے کہ "بیتال پچیسی" کے اردو ترجمے میں للولال جی کوی کی جانب سے مظہر علی وِلا کی ادبی اعانت کا معاملہ واضح ہے اور اس کے پہلو بہ پہلو یہ امر بھی قابلِ فہم ہے کہ "بیتال پچیسی" کے اصل برج ماخذ کی تحریر اور زبان سے بھی اس کے اردو مترجم وِلا قطعاً نابلد تھے۔ اس بابت للولال جی کوی کی ہی مدد سے وِلا کے کیے ہوئے ترجمے "مادھونل کام کندلا" کے مرتب پروفیسر عبادت بریلوی نے بھی اس پر اپنے اوّلین حواشی میں اشارہ کیا ہے جو معاصرین سے متعلقہ باب میں منقول ہوا ہے۔ دوسری طرف للولال جی کوی کالج کے شعبۂ ہندوستانی میں باعتبار فضل و کمال ہندی نیز متعلقہ السنہ و ادبیات کے بلاشبہ جید اور اپنی علمی خدمات کی مناسبت سے وہ غالباً واحد فعّال عالم تھے جنھوں نے گذشتہ تفصیلات کے مطابق کئی ایک بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ مظہر علی خاں وِلا کے محولہ اظہارات کے ساتھ ساتھ خود للولال جی کوی کے یہ چند الفاظ نہایت قیمتی اضافہ ہیں جو للولال جی کوی کی "آپ بیتی" کی "پریچے" میں منقول ہو چکے ہیں: ایک دن صاحب (گل کرسٹ) نے کہا کہ برج بھاشا میں کوئی اچھی کہانی ہو اسے ریختے کی بولی میں کہو۔ میں نے کہا بہت اچھا پر اس کے لیے کوئی پارسی لکھنے والا دیجیے تو بھلی بھانت لکھی جائے۔ انہوں نے دو شاعر میرے تعینات کیے، مظہر علی خاں وِلا اور کاظم علی جوان۔ ایک ورش میں چار پوتھی کا ترجمہ برج بھاشا سے ریختے کی بولی میں کیا: "سنگھاسن بتیسی" "بیتال پچیسی" "شکنتلا ناٹک" اور "مادھونل"۔

للولال جی کوی کے اسی بیان سے استدلال کرتے ہوئے ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے سالِ ترجمہ کا قطعیت سے تعین کیا ہے اور اشاعت کی کارروائی کی بھی تفصیل دی ہے اُن میں "سنگھاسن بتیسی" "شکنتلا ناٹک" اور "مادھونل" کا سنہ ترجمہ ۱۸۰۱ء ہے، یوں مندرجہ بالا بیان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ "بیتال پچیسی" کا سنہ ترجمہ بھی ۱۸۰۱ء ہی ہے۔ گل کرسٹ کی ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کی فہرست سے علم ہوتا ہے کہ اس وقت تک یہ چھپنا شروع نہیں ہوئی تھی (بہ حوالہ "پروسیڈنگس" ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لیے سفارشی فہرست میں یہ طباعت کے لیے تیار شدہ کتابوں کے ذیل میں شامل تھی (حوالہ ایضاً) ـــــــ "بیتال پچیسی" ۱۸۰۵ء میں ہندوستانی پریس سے شایع ہوئی۔

(بہ حوالہ "انلس")۔ یہ فارسی اور ناگری دونوں رسم الخط میں تھی" (ص۲۷۶ تا ۲۷۷)۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے آخری الفاظ بہ ظاہر ایک عام سی اطلاع کا اعادہ ہیں لیکن درحقیقت اس کے حوالے سے کچھ اہم معلومات سامنے آئی ہیں جس کے لیے چند دیگر افاضل سے بھی رجوع مفید مطلب ثابت ہوگا' تاکہ بہ خصوصیت ہندی یا ناگری "بیتال پچیسی" کا سراغ ممکن ہو جس میں مظہر علی خاں کے عمل دخل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا اور جو سراسر للولال جی کوی کا ہی کارنامہ ہے۔

پروفیسر گیان چند راوی ہیں کہ اولاً ناگری نسخہ شایع ہوا: "اس کی صحیح تاریخ ۱۸۰۱ء ہے۔ اس کا ایک حصہ "بیاض ہندی" میں بھی چھپا۔ ۱۸۰۵ء میں مکمل کتاب ہندی رسم الخط میں چھپی۔ اردو کے پہلے ایڈیشن کی تاریخ معلوم نہیں" (ص۲۸۹)۔ تاہم جدید مورخین میں سے ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے علاوہ ڈاکٹر سمیع اللہ اس طبع اول کو مشترکہ اشاعت قرار دیتے ہیں: "۱۸۰۵ء میں اس کا پہلا ایڈیشن اردو اور ناگری خطوں میں شایع ہوا۔ چوں کہ للولال نے اس ترجمے میں وِلا کی کافی مدد کی تھی اس لیے سرورق پر وِلا کے ساتھ ان کا نام بھی درج ہے" (ص۱۲۱)۔ ڈاکٹر سمیع اللہ نے "فورٹ ولیم کالج کی تالیفات" کے نام سے جو فہرست سازی کی ہے اس میں مطبوعہ کتب کے شمار ۱۴ پر ایف ای کی کا یہ تاثر اس کی انگریزی "تاریخ ادبیات ہندی" سے دیا ہے۔

"۱۴۔ "بیتال پچیسی" مظہر علی خاں وِلا: ۱۸۰۵ء: ناگری اردو: اس کی ترتیب میں بھی للولال نے وِلا کی معاونت کی تھی چناں چہ بہ حیثیت مرتب ان کا نام بھی سرورق پر درج تھا لیکن ایف ای کی نے اس کا واحد مصنف للولال کو قرار دیا ہے" (ص۸۴ بہ حوالہ کی ص۸۱)

یہ سب اطلاعات ذہن میں رکھتے ہوتے جب ادبی تبصروں پر نگاہ کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ "بیتال پچیسی" پر ہندی اسلوب کی اثرآفرینی اور لغات کی کثرت استعمال بھی ایک بڑا متفق علیہ نکتہ ہے۔ چناں چہ پروفیسر سید محمد سے لے کر ڈاکٹر عبیدہ بیگم تک سارے ہی متعلقہ اسکالروں کے تاثرات سے یہ خیال نہیں یقین سا ہونے لگتا ہے کہ للولال جی کوی کی محض وقتی اثراندازی سے بڑھ کر "بیتال پچیسی" کا ناگری یا ہندی ترجمہ اور اردو ترجمہ بھی حقیقتاً خود ان ہی کی پوری پوری کارفرمائی کا نتیجہ رہا ہے اور راقم اتنے بڑے دعوے کی طالب علمانہ جرات بلاوجہ نہیں کر رہا ہے۔ عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ منقولہ بالا معلومات اور محولہ ذیل اظہارات سے اس خیال کو پوری تقویت حاصل ہوتی ہے کہ جہاں للولال جی کوی کی زبان و انشا کے اس درجہ قوی اثرات اردو ترجمہ "بیتال پچیسی" پر صاف واضح ہیں کہ وہ صریحاً للولال جی

کوی کا ہی معلوم ہوتا ہے وہیں یہ ایک قدرتی امر ہے کہ للولال جی کوی نے اسی "بیتال پچیسی" کا ہندی متن ناگری رسم خط میں بھی تیار کیا ۔ جو افتتاحی ایڈیشن ۱۸۰۵ء میں شریک بھی ہوا اور ابتدائً منقولہ فہرس کے مطابق بار بار طبع ہوا۔

"اردو بیتال پچیسی" پر للولال جی کوی کے انشائی ولغوی اثر کا اندازہ پروفیسر سید محمد کے اس ابتدائی بیان سے فرمائیے کہ "بیتال پچیسی" میں ہندی الفاظ کا استعمال اس کثرت سے ہوا ہے کہ گویا اصل بھاشا کی کتاب کو دیو ناگری رسم خط سے اردو رسم الخط میں منتقل کر دیا گیا ہے" (صـ۱۷۹)۔ اس سے ملتے جلتے تاثرات ڈاکٹر گیان چند جین نے براہ راست للولال جی کوی کا نام لے کر ظاہر کیے: "ترجمے میں للولال جی غالب نظر آتے ہیں کیوں کہ ٹھیٹھ ہندی الفاظ کثرت سے ہیں۔ ــــــــ نہ صرف زبان اردو کی نسبت ہندی سے قریب تر ہے بلکہ انشا پردازی بھی ہندی کی ہے" (صـ۲۹۹-۳۰۰) پروفیسر وقار عظیم نے "ہماری داستانیں" کے "بیتال پچیسی" پر مقالے میں تین صفحوں پر ان مکالموں اور عبارات کو اقتباس کیا ہے جو بہ قول ان کے سراسر نامانوس اور اجنبی ناقابلِ فہم و غیر مانوس سنسکرت اور برج لغظیات سے مملو ہیں یہی مضمون پروفیسر صاحب کے مرتبہ متن میں بطور مقدمہ درج ہے جس کے صفحات "ہ" "ز" "ا" "وز" "ز" پر وہ عبارتیں نقل ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے ملاحظات کے من جملہ منقولہ بالا مشاہدے سے ڈاکٹر نوشاہی نے اپنے ایڈیشن کے مقدمے میں تعرض کیا ہے اور صـ۲۹ و لبعد پر ان کے اس بیان سے بحث کی ہے کہ ترجمہ وِلا پر للولال جی کوی کا ہی اسلوب نگارش غالب ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس مباحثے میں یہ مرتب متن گوہر نوشاہی ایک طرف ہیں اور پروفیسر جین اپنے متذکرہ تاثرات میں تنہا بالکل نہیں ہیں جن کی تفصیل آرہی ہے۔

اب اصل اور عنوان ہذا کے مرکزی نکتے یعنی للولال جی کوی کے تیار و تحریر کردہ ناگری یا ہندی کے ترجمہ "بیتال پچیسی" کے معاملے کو ذہن میں تازہ کیجیے تو ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے ترتیب دادہ "بیتال پچیسی" کے "حروف آغاز" کے پہلے دو صفحوں پر ایک کے بعد ایک مقامِ حیرت آتا ہے۔ ان مقامات کا تصور کرنے کے لیے خود "حروف آغاز" سے رجوع ناگزیر ہے۔ چنان چہ فاضل ممدوح نے اپنے دو براہ راست ماخذ کا وضاحتی اشاریہ اس طرح فرمایا ہے "زیرِ نظر اشاعت کی ترتیب میں "بیتال پچیسی" کے جن ایڈیشنوں سے مدد لی گئی ہے درج ذیل ہیں (ا) "ہندی اینڈ ہندوستانی سیلیکشنز۔" یہ انتخاب فورٹ ولیم کالج کی طرف سے

۱۸۲۷ء میں کلکتے سے دو جلدوں میں شایع ہوا۔ پہلی جلد کا رسم الخط دیوناگری اور دوسری کا اردو تھا۔ اس انتخاب کے مرتب ـــــ شعبے کے ہیڈ منشی تارینی چرن متر اور نگراں ہندی ہندوستانی زبان کے پروفیسر ولیم پرایس تھے ـــــ "بیتال پچیسی" کا مکمل متن اس انتخاب کی پہلی جلد میں دیوناگری رسم الخط میں موجود ہے۔ میں نے اسے جناب اشفاق انور سے اردو رسم الخط میں منتقل کروایا۔ زیرِ نظر اشاعت کا متن اسی پر مبنی ہے۔ یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کی ملکیت ہے۔" (صا) "بیتال پچیسی" کا یہ دوسرا ایڈیشن اردو اور دیوناگری ہر دو رسم الخط میں ہے۔ بین السطور انگریزی ترجمہ اور مشکل مقامات پر انگریزی زبان میں حواشی بھی درج کیے گئے ہیں۔ یہ ایڈیشن ۱۸۵۵ء میں ہرٹ فورڈ سے شایع ہوا، ڈبلیو بی بارکر نے تیار کیا، ایسٹ وچ نے ترتیب دیا اور ہندوستانی پریس کلکتہ میں چھپا۔ یہ نسخہ بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے سنسکرت سیکشن میں ہے" (ص۲)

ستم یہ ہے کہ ان راست مصادر کے اوّل الذکر ناگری متن کو اردو کا قالب دے کر مظہر علی خاں وِلا سے منسوب کر دیا گیا ہے اور پھر یہ بھی روا نہیں رکھا گیا کہ یہ معلوم کر لیا جاتا کہ آخر وہ ہندی ترجمہ کس کا تھا جس کو فاضل مرتب نے وِلا سے منسوب کر کے شایع کیا ہے۔ دوسرے ماخذ کا معاملہ بھی حقیقتاً کچھ کم سنگین نہیں ہے کیوں کہ اس بارکر ایڈیشن کے مرتب نے اپنا سہ لسانی مجموعہ کسی اور سے نہیں بلکہ للولال جی کوی سے بہ طور مترجم منسوب کر کے شایع کیا ہے۔ بارکر کے مقدمہ سے کم از کم اس حد تک استخراج ممکن تھا کہ اس سہ لسانی جلد کا ناگری متن اور اوّل الذکر ماخذ سے یعنی "سیلیکشنز" کا بھی ہندی ترجمہ "بیتال پچیسی" وِلا کا نہیں بلکہ للولال جی کوی کا تیار کردہ تھا۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے کسی طرح عرق ریزی کی کوئی حاجت نہ تھی کیوں کہ بارکر نے اپنے پیش لفظ میں صرف للولال جی کوی کا نام بہ طور مترجم لیا اور یہ ایڈیشن راست زیرِ استفادہ ہوتے ہوتے بھی اس اساسی نکتے کو نظر انداز کر دیا گیا جس کی بہ ظاہر کوئی معقول توجیہہ نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی قابلِ فہم ہوگی۔

للولال جی کوی کی ہندی "بیتال پچیسی" کے اس بارکر ایڈیشن کا سرورق جس کا عکس طبعِ نو شامل میں شریک ہے راقم کو برٹش میوزیم کے کیوریٹر جناب سلیم الدین قریشی نے انگریزی پیش لفظ کی عکسی نقل کے ہم راہ مرحمت کیا ہے۔ خاکسار معروضات کی طوالت کے مدِ نظر ان عکسی اوراق سے حسبِ ضرورت صرف چند اطلاعیں پیش کرنے پر اکتفا کر رہا ہے جس سے "بیتال پچیسی" کے ہندی

متن کے للولال جی کوی کے تحریر کردہ ہونے کے داعیے کا اثبات ممکن ہو۔ یہ سہ لسانی تالیف ایسٹ انڈیا کالج ہیلی بری کے پروفیسر السنۂ شرقی اور ناظم کتب خانہ ایڈورڈ بلیک ہاؤس ایسٹ وِک کی ایڈٹ کی ہوئی ہے جس میں اصل اور سارا ہی کام ڈبلیو برک بارٹ بارکر ترجمان و پروفیسر عربی، ترکی، فارسی ہندوستانی السنہ ایٹن کالج کا کیا ہوا ہے۔ یہ ہندی متن کا نیا ایڈیشن ہے مطبوعہ ۱۸۵۵ء جس کو اردو دو ناگری رسوم خط میں بین السطری اور حاشیے میں مستقل انگریزی تراجم کے ساتھ تحشیہ نویسی اسی پروفیسر برک ہارڈ بارکر نے ترتیب دیا۔ متن کتاب سے ایک صفحے کا عکس حضرت رام لعل نابھوی نے "ہماری زبان" کے مقالے کے ساتھ شایع کروایا ہے۔

کتاب کا انگریزی پیش لفظ چار صفحات پر مشتمل ہے مگر آخری ورق پر بغیر کسی کے نام کے صرف تاریخ جون ۱۸۵۵ء درج ہے، البتہ آخری دو پیراگرافوں میں پروفیسر ایسٹ کی اعانت کے علاوہ مسٹر شیکسپیر (مرتب پیش رو "منتخبات ہندی" مطبوعہ لندن ۱۸۱۷ء) اور ڈاکٹر فاربس یعنی جان شیکسپیر اور ڈنکن فاربس تینوں کی اپنی اپنی ترتیب دادہ ہندوستانی قواعد کا ذکر ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ پیش لفظ کسی چوتھے شخص یعنی مرتب متون پروفیسر ڈبلیو بی بارکر کا لکھا ہوا ہے۔ اس پیش لفظ سے بارکر کے صرف دو جملے بہ طور تبرک اس کے افتتاحی پیراگراف سے نقل ہیں جن میں بلا شرکت غیرے للولال جی کوی کا نام اس نے لیا ہے:

> "IN 1805, SHRI LALLU JI LAL KAB ——— UNDERTOOK, IN CONJUNCTION WITH OTHER LEARNED NATIVES, TO PREPARE A HINDI VERSION OF THE BAITAL PACHISI — —— THE TRANSLATION NOW PRESENTED TO THE ORIENTAAL STUDENT IS FROM THE HINDEE VERSION OF SHRI LALLU JI LAL KAB."

یہ امر قابل یقین ہے کہ "بیتال پچیسی" کی طرح "سنگھاسن بتیسی" نیز شکنتلا اور "مادھونل کام کندلا" کے تراجم بھی للولال جی کوی کے ہی کارنامے ہیں۔ آخرالذکر کتاب کے حوالے سے معاصرین کے باب میں پروفیسر عبادت بریلوی کا بیان ولا کی برج بھاشا اور اس کے ادب سے عدم واقفیت کے حوالے سے پیش ہو چکا ہے۔ للولال جی کوی کے ان سب ترجموں میں سے فی الحال صرف شکنتلا کے بارے میں بزرگ ممدوح کی ہی اس شہادت پر اکتفا مناسب رہے گا جو انھوں نے کاظم علی جوان کی بھاکھا اور اس کے لٹریچر میں عدم استعداد کے حوالے سے دی ہے چنانچہ ڈاکٹر

عبادت بریلوی نے مقدمۂ "شکنتلا" میں بہ صفحہ ۶ مرزا کاظم علی اور للولال جی کوی دونوں ہی کی زبان دانی کی کیفیات کو تقابلی انداز میں واضح فرمادیا ہے: "مرزا کاظم علی جوان سنسکرت اور انگریزی دونوں زبانوں سے ناآشنا تھے اس لیے ڈاکٹر گل کرسٹ نے کالج کے ایک اور منشی للولال جی کو یہ ہدایت کی کہ وہ اس کام میں مرزا کاظم علی جوان کی مدد کریں۔ للوجی لال سنسکرت اور بھاشا دونوں زبانوں کے عالم تھے۔ انھوں نے اس کام میں مرزا کاظم علی جوان کا ہاتھ بٹایا اور اس طرح یہ کہانی اردو میں منتقل ہوئی۔ للوجی لال اس کہانی کو پڑھ کر سناتے تھے اور مرزا کاظم علی جوان اس کو اردو میں لکھتے جاتے تھے۔"

للولال جی کوی اور ان کے املا نویس معاونین سے مشترکہ طور پر منسوب ان سبھی تراجم پر زیادہ تفصیلات کا اگرچہ یہاں محل نہیں ہے لیکن ایک اشتباہ کی تردید کی خاطر اس کی طرف اشارہ بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر محمد اسلم قریشی مرحوم مقدمۂ شکنتلا" میں ص۲۲ کے حاشیے پر "گل کرسٹ اور اس کا عہد" ص۱۹۵ کے حوالے سے راوی ہیں کہ "محمد عتیق صدیقی کا بیان ہے کہ 'بیتال پچیسی' 'شکنتلا ناٹک اور سنگھاسن بتیسی' کے سلسلے میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ تمام متداول ادبی تاریخوں میں ان کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے کاظم علی جوان اور مظہر علی خاں ولا کے ساتھ ساتھ للولال کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ تینوں کتابیں للولال کے تقرر سے بہت پہلے ترجمہ ہو چکی تھیں، لیکن آگے چل کر ان کتابوں کے جو ایڈیشن شایع ہوتے ان کی تیاری میں غالباً للولال بھی شریک تھے۔ محمد عتیق صدیقی کے بیان کے مطابق للولال کا تقرر ۷ جون ۱۸۵۲ء کو ہوا تھا۔" ڈاکٹر محمد اسلم قریشی نے اپنے فاضل معاصر کے اس تاثر پر کوئی مبصرانہ اظہار ضروری خیال نہ فرمایا ورنہ یہ مسئلہ تبھی صاف ہو چکا ہوتا۔

للولال جی کوی فورٹ ولیم کالج سے جن حیثیتوں میں ابتداً منسلک رہے ان میں سے صرف ایک منصب پر ان کی وابستگی باضابطہ تقرری کے تحت عمل میں آئی تھی لیکن اس تعیناتی سے قبل وہ اسی ادارے سے وابستہ تھے اور اسی اثنا میں انھوں نے ترجموں کا کام شروع کیا جیسا کہ ان کی خود نوشت سے ثابت ہوا۔ زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ محمد عتیق صدیقی صاحب سے دقیقہ رس اور باریک بیں محقق نے جستجو نہیں فرمائی کہ للولال جی کوی کی عدم موجودگی میں شعبۂ ہندوستانی کے دونوں اردوداں اسکالر آیا برج زبان نیز رسم خط اور ادب پر تراجم کے قابل دست گاہ کے حامل تھے بھی یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر دو حضرات از خود اس لایق ہی نہ تھے کہ بھاکھا سے ادبی و تحریری

سطح پر اکتساب کر سکتے اور اپنی ہمہ دانی کا فیضان اردو تراجم کی صورت میں محفوظ کر جاتے۔ للولال جی کوی ایسے اونچے زبان دان فاضل کی عملی مدد کے بغیر نہ تو یہ ترجمے معرض وجود میں آتے اور نہ ہی ان صاحبان کو خواہ کسی حیثیت میں یہ کام تفویض ہوتے۔

للّولال جی کوی کی اردو "بیتال پچیسی" پر اثر اندازی

اوپر اشارتاً عرض کیا گیا ہے کہ مظہر علی خاں ولا کے اردو ترجمہ 'بیتال پچیسی' پر للولال جی کوی کی قلم کاری کے اثرات کا جائزہ دراصل خود للولال جی کوی کے ادبیانہ کردار کے ایک رُخ کا اعتراف ہے۔ اس بارے میں للولال جی کوی کے اپنے ہندی ترجمہ "بیتال پچیسی" پر گفتگو میں پروفیسر سید محمد اور پروفیسر گیان چند کے ارشادات بھی پیش کیے جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے ایک اہم اشارے سے "بیتال پچیسی" کے اوّلین مرتب ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اختلاف کیا ہے اور پروفیسر وقار عظیم کی رایے سے استناد کیا ہے جو آخر الذکر اسکالر نے پروفیسر گیان چند کے زیرِ بحث خیالات کی اشاعت کے بعد ہی دی تھی۔ یہاں آغاز کلام کے طور پر اسی ابتدائی سلسلہ بحث و نظر سے استفاضہ مناسب رہے گا جس کے بعد للولال جی کوی کی اس کاوش پر دوسری

لہ للولال جی کوی کا نام لیے بغیر دونوں الگ مترجمین کے چاروں کارناموں کی لسانی و اسلوبی یکسانیت کی طرف مجموعی طور پر اشارہ کیا۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا یہ تاثر کس درجہ اہمیت کا مالک ہے ملاحظہ ہو: "فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں قصّے کہانیوں اور داستانوں کے سلسلے کی ایک کڑی برج بھاشا سے ترجموں کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ کاظم علی جوان کی "سنگھاسن بتیسی" اور "شکنتلا ناٹک"، مظہر علی خاں ولا کا قصہ "مادھونل اور کام کندلا"، اور "بیتال پچیسی" اس کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ ان چاروں کے اسلوب میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ یہ تصانیف اردو الفاظ کے ساتھ برج بھاشا اور سنسکرت الفاظ کے امتزاج سے ایک بالکل نیا اسلوب پیش کرتی ہیں۔" (ص ۲۵۳) عبیدہ صاحبہ نے متصل سطور میں "شکنتلا" اور "مادھونل کام کنڈلا" کے اسالیب میں بھاکھا کی آمیخت کے لغوی اثرات کا تجزیہ جمالاً پیش کیا ہے جو ایک بھرپور تقابل کا نقطۂ آغاز قرار پا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان لسانی امتزاجات کے کریڈٹ کے لیے سوائے للّولال جی کوی کے اور کوئی نام کسی کے ذہن میں کبھی نہیں آسکتا ہے۔ چاروں ترجموں کا مقابلہ جب بھی تفصیل سے سامنے آئے گا للّولال جی کوی کے اثرات محسوس اور تسلیم کیے جا سکیں گے۔

عبادت بریلوی نے مقدمہ "شکنتلا" میں بہ صفحہ ۶ مرزا کاظم علی اور للولال جی کوی دونوں ہی کی زبان دانی کی کیفیات کو تقابلی انداز میں واضح فرمادیا ہے: "مرزا کاظم علی جوان سنسکرت اور انگریزی دونوں زبانوں سے ناآشنا تھے اس لیے ڈاکٹر گل کرسٹ نے کالج کے ایک اور منشی للولال جی کو یہ ہدایت کی کہ وہ اس کام میں مرزا کاظم علی جوان کی مدد کریں۔ للوجی لال سنسکرت اور بھاشا دونوں زبانوں کے عالم تھے۔ انہوں نے اس کام میں مرزا کاظم علی جوان کا ہاتھ بٹایا اور اس طرح یہ کہانی اردو میں منتقل ہوئی۔ للوجی لال اس کہانی کو پڑھ کر سناتے تھے اور مرزا کاظم علی جوان اس کو اردو میں لکھتے جاتے تھے۔"

للولال جی کوی اور ان کے املا نویس معاونین سے مشترکہ طور پر منسوب ان سبھی تراجم پر زیادہ تفصیلات کا اگرچہ یہاں محل نہیں ہے لیکن ایک اشتباہ کی تردید کی خاطر اس کی طرف اشارہ بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر محمد اسلم قریشی مرحوم مقدمہ "شکنتلا" میں ص۲۲ کے حاشیے پر "گل کرسٹ اور اس کا عہد" ص۱۹۵ کے حوالے سے راوی ہیں کہ "محمد عتیق صدیقی کا بیان ہے کہ بیتال پچیسی" "شکنتلا ناٹک اور سنگھاسن بتیسی کے سلسلے میں یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ تمام متداول ادبی تاریخوں میں ان کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے کاظم علی جوان اور مظہر علی خاں ولا کے ساتھ ساتھ للولال کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ تینوں کتابیں للولال کے تقرر سے بہت پہلے ترجمہ ہو چکی تھیں، لیکن آگے چل کر ان کتابوں کے جو ایڈیشن شایع ہوتے ان کی تیاری میں غالباً للولال بھی شریک تھے۔ محمد عتیق صدیقی کے بیان کے مطابق للولال کا تقرر، جون ۱۸۰۲ء کو ہوا تھا۔" ڈاکٹر محمد اسلم قریشی نے اپنے فاضل معاصر کے اس تاثر پر کوئی مبصرانہ اظہار ضروری خیال نہ فرمایا ورنہ یہ مسئلہ تبھی صاف ہو چکا ہوتا۔

للولال جی کوی فورٹ ولیم کالج سے جن حیثیتوں میں ابتداً منسلک رہے ان میں سے صرف ایک منصب پر ان کی وابستگی باضابطہ تقرری کے تحت عمل میں آئی تھی لیکن اس تعیناتی سے قبل وہ اسی ادارے سے وابستہ تھے اور اسی اثناء میں انہوں نے ترجموں کا کام شروع کیا جیسا کہ ان کی خود نوشت سے ثابت ہوا۔ زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ محمد عتیق صدیقی صاحب سے دقیقہ رس اور باریک بیں محقق نے جستجو نہیں فرمائی کہ للولال جی کوی کی عدم موجودگی میں شعبۂ ہندوستانی کے دونوں اردو داں اسکالر آیا برج زبان نیز رسم خط اور ادب پر تراجم کے قابل دست گاہ کے حامل تھے بھی یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر دو حضرات از خود اس لائق ہی نہ تھے کہ بھاکھا سے ادبی و تحریری

سطح پر اکتساب کر سکتے اور اپنی ہمہ دانی کا فیضان اردو تراجم کی صورت میں محفوظ کر جاتے۔ للولال جی کوی ایسے اونچے زبان دان فاضل کی عملی مدد کے بغیر نہ تو یہ ترجمے معرض وجود میں آتے اور نہ ہی ان صاحبان کو خواہ کسی حیثیت میں یہ کام تفویض ہوتے۔

للّولال جی کوی کی اردو "بیتال پچیسی" پر اثر اندازی

اوپر اشارتاً عرض کیا گیا ہے کہ مظہر علی خاں ولا کے اردو ترجمہ 'بیتال پچیسی' پر للولال جی کوی کی قلم کاری کے اثرات کا جائزہ دراصل خود للولال جی کوی کے ادیبانہ کردار کے ایک رُخ کا اعتراف ہے۔ اس بارے میں للولال جی کوی کے اپنے ہندی ترجمہ "بیتال پچیسی" پر گفتگو میں پروفیسر سید محمد اور پروفیسر گیان چند کے ارشادات بھی پیش کیے جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے ایک اہم اشارے سے "بیتال پچیسی" کے اولین مرتب ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اختلاف کیا ہے اور پروفیسر وقار عظیم کی رایے سے استناد کیا ہے جو آخر الذکر اسکالر نے پروفیسر گیان چند کے زیر بحث خیالات کی اشاعت کے بعد ہی دی تھی۔ یہاں آغاز کلام کے طور پر اسی ابتدائی سلسلہ بحث و نظر سے استفاضہ مناسب رہے گا جس کے بعد للولال جی کوی کی اس کاوش پر دوسری

لہ للولال جی کوی کا نام لیے بغیر دونوں الگ مترجمین کے چاروں کارناموں کی لسانی و اسلوبی یکسانیت کی طرف مجموعی طور پر اشارہ کیا۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا یہ تاثر کس درجہ اہمیت کا مالک ہے ملاحظہ ہو: "فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں قصّے کہانیوں اور داستانوں کے سلسلے کی ایک کڑی برج بھاشا سے ترجموں کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ کاظم علی جوان کی "سنگھاسن بتیسی" اور "شکنتلا ناٹک، مظہر علی خاں ولا کا قصہ" مادھونل اور کام کندلا،، اور "بیتال پچیسی" اس کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ ان چاروں کے اسلوب میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ یہ تصانیف اردو الفاظ کے ساتھ برج بھاشا اور سنسکرت الفاظ کے امتزاج سے ایک بالکل نیا اسلوب پیش کرتی ہیں۔" (ص ۲۵۳) عبیدہ صاحبہ نے متصل سطور میں "شکنتلا" اور "مادھونل کام کنڈلا" کے اسالیب میں بھاکھا کی آمیزش کے لغوی اثرات کا تجزیہ جمالاً پیش کیا ہے جو ایک بھرپور تقابل کا نقطۂ آغاز قرار پا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان لسانی امتزاجات کے کریڈٹ کے لیے سوائے للّولال جی کوی کے اور کوئی نام کسی کے ذہن میں کبھی نہیں آ سکتا ہے۔ چاروں ترجموں کا مقابلہ جب بھی تفصیل سے سامنے آئے گا للّولال جی کوی کے اثرات محسوس اور تسلیم کیے جا سکیں گے۔

گفت گو میں بھی منقول ہوں گی۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے وِلاکی اردو "بیتال پچیسی" پر یہ اظہار خیال فرمایا تھا کہ اس "ترجمے میں للولال غالب نظر آتے ہیں" اس بیان کا مکمل متن یہ ہے: "اردو میں یہ کتاب برج بھاشا سے ترجمہ ہے، اس میں للولال کوی اور مظہر علی ولا دونوں شریک تھے، یہ اردو اور ہندی دونوں خطوں میں چھپی۔ ترجمے میں للولال غالب نظر آتے ہیں کیوں کہ ٹھیٹھ ہندی الفاظ کثرت سے ہیں فجر، گل عذار کی نوع کا کوئی بھولا بھٹکا لفظ کبھی عبارت کے درمیان آبھی جاتا ہے تو کالے چور کی طرح علاحدہ معلوم ہوتا ہے نہ صرف زبان اردو کی نسبت ہندی سے قریب تر ہے بلکہ انشا۔ پردازی بھی ہندی کی ہے۔" (ص ۵۰)

اس جگہ پروفیسر جین نے غالباً طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک مختصر سے اقتباس پر اکتفا فرمایا ہے لیکن پروفیسر وقار عظیم نے اسی اجمال کی تفصیلات اس نقطۂ نگاہ کی موثر توثیق کے بہ طور تین صفحات میں "بیتال پچیسی" سے جمع کی ہیں۔ سید وقار عظیم کا جایزہ ان کی مقالاتی جلد "ہماری داستانیں" کے علاوہ ان کے مرتبہ اور پسِ مرگ شایع شدہ "بیتال پچیسی" کے ایڈیشن میں بہ طور مقدمہ درج ہے۔

"بیتال پچیسی" کے بارے میں پروفیسر وقار عظیم کا واضح تاثر ہے کہ "مولفوں اور مترجموں کے اس دعوے کے باوجود کہ یہ کہانیاں بھاشا کے غیر مانوس الفاظ سے پاک ہیں ان کے مجموعی انداز پر بھاشا چھائی ہوئی ہے۔ بلکہ کہیں کہیں تو جملوں میں سنسکرت کے ایسے مشکل الفاظ آگئے ہیں جو غیر مانوس ہونے کے علاوہ عبارت کی سلاست روانی ہمواری اور آہنگ کو بھی متاثر کرتے ہیں" (ص ۵) اس بیان کو جاری رکھتے ہوتے پروفیسر وقار عظیم نے دو صفحوں پر متعدد فقروں کو بہ طور مثال درج کرنے سے قبل ارشاد کیا ہے کہ بیتال پچیسی اپنے عام اسلوب کے اعتبار سے اس زبان کے قریب ہے جسے ہم اصطلاح میں "ہندوستانی" کہتے ہیں اور اس میں فارسی اور عربی کے مانوس لفظوں کی جگہ ہندی کے مانوس و غیر مانوس الفاظ کی کثرت ہے۔ اس زبان کا اندازہ کیا ہے اس کے اندازے کے لیے بیتال پچیسی کی مختلف کہانیوں کے چند جملے دیکھیے"۔ (ص ایضاً) پروفیسر وقار عظیم کی پیش فرمائی ہوئی۔ عبارتیں اس مقام پر تقریباً ۳۵ ہیں اور ان کلمات کے بعد انھوں نے پھر یہی رائے دی ہے کہ: "بیتال پچیسی" کی ان مثالوں میں بے شمار ہندی اور سنسکرت کے لفظ ہیں، کچھ مانوس اور کچھ غیر مانوس کچھ آسان اور کچھ مشکل ____ لیکن پوری عبارت کی ساخت و ترتیب میں سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ کی کثرت اور غلبہ ہے، اس لیے عبارتوں میں جا بجا ایسے ادق الفاظ بھی آجاتے ہیں جو نہ معنی کے لحاظ سے قریب الفہم ہیں اور نہ صوتی آہنگ

کے اعتبار سے خوش گوار۔ ایسے لفظوں کی کچھ مثالیں دیکھیے" (ص۵۵ وزر) جن کے لیے وقار صاحب نے دیگر بچیس کلمات کا انتخاب کیا ہے اور یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ "یہ مثالیں ان بہت سی مثالوں میں سے صرف چند ہیں جو بیتال پچیسی کی ہر کہانی میں ہر جگہ بکھری اور پھیلی نظر آتی ہیں اور اس لیے عجیب اور بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں کہ پڑھنے والے کے سامنے برابر اس طرح کے مفرد اور مرکب الفاظ آتے رہتے ہیں کہ انہیں آج بھی عام بول چال میں شامل کیا جا سکتا ہے۔" (ص۵۶)

ڈاکٹر گیان چند جین نے للولال جی کوی کا نام لے کر بیتال پچیسی کے ترجمہ والے پر للولال جی کوی کے قلمی تصرفات کے غالب رہنے کی طرف جو اشارہ فرمایا پروفیسر وقار عظیم نے للولال جی کوی کا نام لیے بغیر اسی نکتے کے اثبات میں منقولہ ساری تفصیل شریک گفتگو فرمائی۔ ظاہر ہے کہ للولال جی کوی کے نام کے بغیر بھی اردو بیتال پچیسی پر ان کی اثر اندازی کے تصور کی یہ پوری طرح سے توثیق کرتی ہے اور اس خیال کو بہ خوبی ثابت کرتی ہے۔ عجیب پر لطف سا واقعہ ہے کہ پروفیسر گیان چند کے زیر بحث بنیادی تاثر کے رد میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے سید وقار عظیم کے محولہ مقالے سے ہی استدلال کیا ہے جس میں خود پروفیسر وقار عظیم نے پروفیسر جین کے خیال پر تصدیق کی ' ایک نہ دو کئی مہریں ثبت کی ہیں جو پیش ہوئیں۔ پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر وقار عظیم صاحبان کے فرمودات کے تسلسل میں مرتب بیتال پچیسی ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے اختلافی جائزے کا اضافہ اسی حوالے سے ضروری ہے' آخر الذکر اسکالر نے اس بارۂ خاص میں "شری للولال جی کوی" کے زیر عنوان ابتداً اس جانب یہ اشارہ کیا: "بیتال پچیسی" کے بارے میں گیان چند جین کا خیال ہے کہ اس کے اسلوب پر للولال کوی چھاگئے۔ اس بیان میں کس حد تک صداقت ہے اس پر بحث آیندہ سطور میں ہوگی" (مقدمہ ص۱۵)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے "ان آیندہ سطور" کو مقدمے کے آخری صفحوں ۲۹ تا ۳۱ پر تحریر کرتے ہوئے آغاز کلام میں ہی پروفیسر گیان چند جین کے مرکزی نکتے سے عدم اتفاق ظاہر کیا ہے۔

"گیان چند نے بیتال پچیسی کے اسلوب پر للولال جی کوی کا ہندی نواز ذہن غالب قرار دیا ہے۔ مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے اس لیے کہ "بیتال پچیسی" کی کہانیوں کے موضوع کا تقاضا تھا کہ اس کے لیے ایسا اسلوب اختیار کیا جاتے جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کم اور ہندی اور سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہوں۔ ان کہانیوں کی فضا ہندوستانی معاشرت کے اس دور سے تعلق رکھتی ہے جسے ہم صحیح معنوں میں سنسکرت عہد کہہ سکتے ہیں۔ اس عہد کے لہجے یا اظہار کے پیمانے والا کے عہد سے مختلف تھے' پس ان لفظوں کو محفوظ کرنے اور ان

سے متعلق کرداروں کی زندہ تصویریں پیش کرنے کے لیے لازم تھا کہ ایک ایسا ڈکشن اختیار کیا جاتے جو اس عہد کی بھرپور تصویر ہمارے سامنے پیش کرے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا ڈکشن ہندی اور سنسکرت الفاظ کے بکثرت استعمال کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ شاستروں کی تعلیمات جو "بیتال پچیسی" کی ہر کہانی کا ایک اہم جز ہیں ہندی اور سنسکرت الفاظ کے بغیر کسی زبان کے الفاظ میں پیش نہیں کی جا سکتی تھیں۔" اس حقیقت کو کلی طور پر نظرانداز کرتے ہوتے کہ کیا وِلا اس کی اہلیت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے یہاں اپنے خیالات کا یہ سلسلہ اس اضافی تاثر سے جوڑا ہے کہ "ان حقایق کے پیش نظر بیتال پچیسی یا شکنتلا کے اسلوب کا مقابلہ "باغ و بہار" یا "ہفت گلشن" کے اسلوب سے کرنا میرے نزدیک قرین انصاف نہیں کیوں کہ پہلی دو کتابیں ہندی تہذیب و معاشرت کی نمایندگی کرتی ہیں اور دوسری دو کتابیں عجمی طرز حیات سے ملتی جلتی ہیں۔"

عجیب تر یہ کہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ان تجزیات میں اور ان کے متصل بھی اصل سوال کو موضوع گفتگو نہیں بنایا اور پروفیسر گیان چند کی جس اساسی رائے سے انہوں نے ابتداً اختلاف کی بحث چھیڑی تھی اسی کو اس پورے جایزے میں نظرانداز فرما دیا۔ ڈاکٹر نوشاہی کے منقولہ افادات اپنی جگہ بہ طور ایک قاعدہ کلیہ بالکل درست ہیں جن کے اثبات میں پیش رو مورخین اور بعد کے محققین کے ہم خیال اظہارات کی گرد آوری متعدد اوراق کو محیط ہو گی لیکن فاضل مرتب "بیتال پچیسی" نے از خود جو ادبی مسئلہ اٹھایا تھا کہ آیا یہ سب للولال جی کوی کی قلمی کارفرمائی کا بالراست نتیجہ ہے یا نہیں اس پر سرے سے روشنی نہیں ڈالی۔ جاریہ سلسلۂ کلام میں "بیتال پچیسی" سے چار فقرے اقتباس کرنے کے قبل و بعد ڈاکٹر نوشاہی کا فرمانا یہ ہے کہ "دیکھنا یہ ہے کہ مظہر علی وِلا نے سنسکرت اور ہندی الفاظ کو استعمال کر کے اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔ ———— (محذوف)۔

پروفیسر وقار عظیم اس بات کے معترف ہیں کہ یہ الفاظ "اپنی ساخت اور آواز کے اعتبار سے سبک اور ہلکے پھلکے ہیں" اور ان کے نزدیک ان کہانیوں میں دل نشینی اور تاثیر اس لیے ہے کہ ان کہانیوں کا پس منظر خالص ہندوستانی ہے۔" ترجمے کی یہ خوبیاں صرف مظہر علی وِلا کے حصے میں ہی نہیں آئیں بلکہ فورٹ ولیم کالج کی قریباً ہر کتاب ان صفات سے متصف ہے۔" (ص۱۰۱-۱۰۳)۔ غرض ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اختلاف رائے کے طور پر جو کچھ تحریر فرمایا اس کا نہ تو اصل نکتے سے کوئی تعلق ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی اس سارے فسانے میں اس مسئلے کا کوئی ذکر

ہے کہ اردو "بیتال پچیسی" کے اسلوب نگارش پر ڈاکٹر گیان چند جین کے بہ قول اگر للولال جی کوی کا قلمی تصرف کارفرما نہ تھا تو پھر یہ ادبی اثرات کہاں سے در آتے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے خاص حوالے سے اس مباحثے کے سلسلے میں یہ دو امور ذہن میں تازہ رکھنے ضروری ہیں جن کی جانب پہلے بھی اشارہ گزر چکا ہے۔ ایک تو یہی کہ فاضل موصوف کا ترتیب دادہ اور مظہر علی خاں وِلا سے منسوب "بیتال پچیسی" کا اردو ایڈیشن دراصل فورٹ ولیم کالج کی کتابوں پر مبنی و مشتمل ایک "سیلیکشنز" نامی مجموعے کی اس جلد سے ماخوذ ہے جو دیوناگری متون کا مجموعہ ہے اور للولال جی کوی کے اسی ناگری حروف کے متن کو اردو رسم خط میں منتقل کروا کے وِلا کے ترجمہ اردو کے بہ طور اس کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ شعبۂ ہندی کے مسلمان اردو داں افاضل میں خواہ کوئی ہوں اور بہ طور خاص خود مظہر علی خاں وِلا وہ سنسکرت تو بہت بڑی بات ہے بھاکا کی زبان اور دیوناگری کی تحریر سے ایک دم نابلد تھے اور دونوں سے خصوصاً وِلا کے لاعلم محض رہنے کا حال پروفیسر عبادت بریلوی کے الفاظ میں مذکور ہو چکا ہے۔ ضمناً یہ بھی یاد رہے کہ اس کے برعکس للولال جی کوی سے اردو کی تین بڑی اہم کتب یادگار ہیں۔ یعنی اردو سنگھاسن بتیسی نیز "برج بھاشا کے قواعد" اور "لطایف ہندی" جن کے علاوہ جوان اور وِلا کے بقیہ تینوں تراجم یعنی خود "بیتال پچیسی" نیز مادھونل کام کندلا اور شکنتلا بھی للولال جی کوی کے بغیر ممکن نہ ہوتے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے وِلا کی "بیتال پچیسی" کے علاوہ جوان کی "شکنتلا" کے ذکر میں بھی "بیتال پچیسی" کی زبان و انشاء پر جو رائے دی ہے وہ للولال جی کوی کے تحریری اثرات کی نشان دہی کرتی ہے۔ "بیتال پچیسی" پران کا تاثر ہے کہ کتاب کی زبان صاف اور سلیس نہیں ہے۔ اس میں ٹھیٹھ ہندی کے الفاظ بکثرت استعمال کیے گئے ہیں جن میں سے بعض بعید از فہم ہیں۔ مواد خالص ہند و دیو مالا اور قدیم ہندو تہذیب سے لیا گیا ہے اور انشاء پردازی بھی خالص ہندی کی ہے" (ص ۱۲۷) قبل ازیں ڈاکٹر سہیل بخاری کاظم علی جوان کے ترجمۂ "شکنتلا" میں للولال جی کوی کی قلمی اثراندازی کے "بیتال پچیسی" سے مقابلے کے سلسلے میں تحریر فرما چکے تھے کہ "للولال جی کا اس کتاب کی تیاری میں صرف اتنا ہی حصہ ہے کہ وہ نواج کا نسخہ پڑھ دیتے تھے اور جوان اسے اپنی زبان میں لکھ لیتے تھے جیسا کہ سبب تالیف کی ابتداء میں انہوں نے بیان کیا کہ "للولال جی کب (کوی) کو حکم کیا کہ بلاناغہ لکھایا کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان جوان کی ہی ہے اگر للولال جی کو اس میں دخل ہوتا تو یقیناً بیتال پچیسی کی سی انشاء نظر آتی" (ص ۱۱۰ و ۱۱۱) یہاں اس جانب

اشارہ ضروری ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اردو کی داستانی تحقیق پر اس کتاب کو بعض مشوروں کے زیراثر بہ غرض اشاعت مختصر کر دیا تھا کیوں کہ طباعت کے انتظام میں غیر معمولی تاخیر ہوتی جارہی تھی۔ اغلب ہے کہ "بیتال پچیسی" پر ڈاکٹر سہیل بخاری کی مفصل رائے اسی اختصار نویسی کی نذر ہوگئی۔

ڈاکٹر عابدہ بیگم نے للولال جی کوی کے کسی حوالے کے بغیر "بیتال پچیسی" کی زبان پر ناقدین کی ادبی رایوں کو ادبی اعتراضات میں شمار کیا ہے تاہم انہوں نے مظہر علی خاں وِلا کے دو سابقہ منقولہ بیانات کی سمت متوجہ کرتے ہوئے اپنی طرف سے توجیہات پیش کی ہیں۔ وِلا کے اپنے الفاظ کی گواہی کے ساتھ ڈاکٹر عابدہ بیگم نے اپنی مختصر گفتگو کی ابتدا کی ہے: "بیتال پچیسی" کی زبان کے سلسلے میں یہ اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ اس میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی کثرت ہے۔ شاید ان معترضین کی نظر سے وِلا کی یہ صراحت نہیں گزری۔ وِلاؔ "جہاں گیر شاہی" کے دیباچے میں واضح طور سے لکھتے ہیں: "صاحب ممدوح (گل کرسٹ) کے فرمانے سے "مادھونل" اور "بیتال پچیسی" جو زبان برج میں ہے ان کا ترجمہ للولال جی کب کی مدد سے اس طرح کیا کہ بیشتر برج کی بولی "بیتال پچیسی" میں رہنے دی کہ مرضی صاحب مدرس کی یوں ہی تھی" (بہ حوالہ قلمی نسخہ)۔ "بیتال پچیسی" کے دیباچے میں بھی انہوں نے لکھا ہے: "بہ موجب فرمانے جناب گل کرسٹ صاحب دام اقبالہ کے زبان سہل میں جو خاص و عام بولتے ہیں اور برج کی بھاکا اکثر اس میں ہووے بلکہ کہہ و مہہ کے روزمرہ کے موافق جیسے عالم و جاہل گنی گوڈھ سب سمجھیں اور ہر ایک کی طبیعت پر آسان ہووے مشکل کسی طرح کی ذہن پہ نہ گزرے بیان کیا" (حوالہ: ایضاً ۲۸۰ / ۲۸۱)۔ یہاں ڈاکٹر عابدہ بیگم نے بھی تقریباً تمام مبصرین کی طرح "بیتال پچیسی" کی نگارش ولغات پر بھاکا اور اردو کے لسانی امتزاجات کی جانب اشارہ کیا ہے جس سے عیاں ہوتا ہے کہ للولال جی کوی کے طرز انشا۔ کا "بیتال پچیسی" کی تحریر و لفظیات پر پڑنے والا عکس وہ محسوس کرتی ہیں۔ بیتال پچیسی کا اسلوب اردو اور برج بھاشا کے الفاظ کے امتزاج کا نمایندہ اسلوب ہے۔ ضروری ہے کہ اس میں مستعمل اکثر و بیشتر الفاظ نامانوس اور قدرے اجنبی بھی ہیں لیکن قصے کی ہندوستانی فضا اسی اسلوب اور زبان کی متقاضی تھی۔ سنسکرت اور ہندی کے یہ الفاظ اپنی ساخت اور خد و خال کے اعتبار سے گراں نہیں ہیں۔ ان میں ترنم بھی ہے اور آہنگ بھی۔ بعض نامانوس الفاظ کے سمجھنے میں قصے اور کہانی کے وہ واقعات بھی معاون

ہوتے ہیں جن میں وہ مستعمل ہوتے ہیں۔(۲۸۱) صرف اتنی بات ہے کہ یہاں للولال جی کوی کا نام رہ گیا ہے۔ للولال جی کوی کے اردو ترجمہ "بیتال پچیسی" کے دعوے کے حق میں اگر واقعاتی شہادت کافی نہ ہو تو بھی کم از کم "بیتال پچیسی" میں اردو اور برجا کا لغوی و انشائی آمیزہ للولال جی کوی کی اپنی طباعی اور لسانی ہمہ دانی کا ایسا منہ بولتا ثبوت ہے کہ اس کے حق میں شاید ہی اور دلایل کی ضرورت باقی رہ گئی ہو۔ البتہ اس سلسلے کی جزئیات پر متعلقہ و ممکنہ تفصیل کے ساتھ کام کرنے اور انہیں سامنے لانے کو اب زیادہ ضروری سمجھنا چاہیئے تاکہ ان کے علمی عطیے کا صحیح تر اندازہ ممکن ہو۔

”پریم ساگر“ تعارفی جائزہ

”پریم ساگر“ تعارف اور تاثرات

پروفیسر سید محمد نے للولال جی کوی کی قلمی سرگزشت میں ’پریم ساگر‘ کو سرفہرس رکھا جس کی وجہ غالباً وہی عام تاثر ہے کہ ”پریم ساگر“ ہی للولال جی کوی کی افتتاحی ادبی کاوش ہے۔ اس عام غلط فہمی کے حوالے کئی جگہوں پر آچکے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ للولال جی کوی کا اولین کارنامہ ”راج نیتی“ رہا ہے۔ ”پریم ساگر“ کو متعارف کراتے ہوئے مولوی سید محمد نے یہ ارشاد کیا کہ: ”یہ بھگوت گیتا کے دسویں باب کا ترجمہ ہے۔ برج بھاشا میں اس کو ایک اور پنڈت چتر بھوج مصرا نے بھی لکھا ہے۔ للولال جی نے اس نسخے سے ثقیل سنسکرت الفاظ اور غیر مانوس قدیم ترکیبیں خارج کر کے از سرِ نو ایک کتاب مرتب کی۔ ”پریم ساگر“ میں ہندوؤں کے مشہور دیوتا سری کرشن جی کی روایتی تاریخ اور دیگر حکایات بیان کی گئی ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں شایع ہوا تھا۔ دوسرے ایڈیشن ۱۸۱۰ء، ۱۸۱۰ء اور ۱۸۲۰ء میں شایع ہوئے۔ للولال کی یہ کتاب بہت مقبول رہی، ہندوستان اور یورپ کے ہندی داں طبقے نے اس کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا۔ انگریزی میں بھی اس کے دو ترجمے ہوئے ہیں، ایک کپتان ہولنگس نے ۱۸۴۸ء میں کلکتہ سے شایع کیا اور دوسرا ایڈورڈ ایسٹ وک نے لندن سے ۱۸۶۷ء میں“ (ص ۲۶۵/۲۶۶)۔ آگے بڑھنے سے قبل ایک تاریخی غلط فہمی کا ازالہ ناگزیر ہے۔

اتفاقیہ ”پریم ساگر“ کے ترجمہ ایسٹ وک کا کوئی حال بلکہ حوالہ تک ”ارباب نثر اردو“ کے بعد سے تادم تحریر کہیں اور مذکور نہیں ہوا ہے۔ راقم کے پاس ایسٹ وک ایڈیشن کی جو جلد محفوظ ہے وہ سابقہ ملکیت کے دوران کرم خوردہ ہو چکی تھی اور مقدمہ ایسٹ وک کے پچھلے صفحے پر دبیز کاغذ چسپاں کیا ہوا تھا۔ نہ صرف یہ کہ سرورق پر سنہ طبع اسی کرم خوردگی کی نذر ہو چکا تھا بلکہ مقدمہ ایسٹ وک کی تاریخ تحریر بھی غیر واضح اور غیر متعین تھی۔ اس ایسٹ وک ایڈیشن کی تاریخ طباعت ناقابلِ شناخت ہونے سے راقم یہ فرض کرنے پر مائل ہوا کہ ایسٹ وک نے انگریزی ترجمہ اور یہ ایڈیشن ایک ساتھ ہی ترتیب دیا اور ایک ہی

برس شایع بھی کیا ہو۔ چنانچہ پروفیسر سید محمد کے متذکرہ ترجمہ ایسٹ وِک کے سالِ اشاعت ۱۸۶۷ء پر اس ایسٹ وِک ایڈیشن کا بھی سنہ طبع قیاس کرنا پڑا۔ لیکن برٹش لائبریری لندن کے فاضل کیوریٹر محترمی سلیم الدین قریشی صاحب نے راقم کے ایک عریضے کے جواب میں انکشاف کیا کہ ایسٹ وِک کا ۱۸۶۷ء کا ہرٹ فورڈ ایڈیشن وہاں موجود نہیں ہے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ برطانیہ کی مطبوعہ کتاب سات سمندر پار کے احقر جیسے ایک طالب علم و ادب کی تحویل میں تو ہو مگر خود برٹش میوزیم اور رانڈیا آفس کے ذخایر میں ہم دست نہ ہو۔ یہ اطلاع محض اس تعلق سے ہی حیرانی کا سبب نہ تھی کہ "پریم ساگر" کا برطانوی ایڈیشن خود برطانیہ میں مخزونہ اتنے بڑے بڑے ذخیروں میں غیر موجود ہو جو بالکل ناممکن اور ناقابل یقین سی بات تھی بلکہ اس امر میں اشتباہ محسوس ہونے لگ گیا کہ کہیں "ارباب نثر اردو" میں مندرجہ ۱۸۶۷ء بذاتہ غلط نہ واقع ہوا ہو۔ اسی اثنا میں جناب سلیم قریشی صاحب موصوف کے عکسی عطایا سے موثق طور پر یہ علم ہوا کہ ایسٹ وِک کے انگریزی ترجمہ "پریم ساگر" کا سنہ اشاعت ۱۸۵۱ء ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہی سال طبع ایسٹ وِک کے ترتیب دادہ اور راقم کے یہاں محفوظ "پریم ساگر" کے ایڈیشن کا ہے۔ اس طرح گمان غالب ہے کہ صاحبِ "ارباب نثر اردو" سے ترجمہ ایسٹ وِک پر درج سال پڑھنے یا اس کے اعداد گننے میں اتفاقاً غلطی ہو گئی۔ رومن حروف میں ایسٹ وِک کے انگریزی ترجمۂ پریم ساگر کے سرورق پر تاریخ اشاعت کا اندراج یہ ہے: MDCC L I جو ۱۸۵۱ء کے برابر ہے اور یہی سالِ طباعت "پریم ساگر" کے ایسٹ وِک ایڈیشن کا بھی ہے۔

"پریم ساگر" کے طبع اول کا جو سن پروفیسر سید محمد نے قرار دیا ہے یعنی ۱۸۰۳ء وہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم اور ڈاکٹر سمیع اللہ کے مطابق دراصل اس کی ایک نامکمل اشاعت کا سال رہا ہے۔ ڈاکٹر سمیع اللہ نے "فورٹ ولیم کالج کی تالیفات" نامی باب میں ادارے کی اپنی مطبوعات پر مشتمل فہرست میں ص۸۶ پر یہ اندراج کیا ہے: "۳۰۔ سری بھاگوت" للولال کوی ۱۸۰۳ء ناگری یہ "پریم ساگر" کا نامکمل ایڈیشن ہے"، جب کہ اصل و مکمل کتاب کا اندراج اسی فہرست سازی کے دوران بہ صفحہ ۸۸ یوں ہے: "۵۵۔ پریم ساگر" للولال۔ ۱۸۱۰ء ناگری اس کے کچھ حصے ۱۸۰۳ء میں "سری بھاگوت" کے نام سے شایع ہوتے تھے۔" ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے بہ صفحہ ۷ "پریم ساگر" کے اس مختصر اور نامکمل ایڈیشن کو ڈاکٹر نثار دادیوی کی سند پر صرف

۵۱ ابواب پر مشتمل" قرار دیا ہے۔ جس کا سال طبع ثانی الذکر محقق نے ۱۸۰۵ء ظاہر کیا ہے۔ کالج انلس سے استناد کے ساتھ ڈاکٹر عابدہ بیگم نے یہ اطلاع اسی تسلسل میں اضافہ کی ہے کہ "ولیم پرایس" نے "پریم ساگر" میں مستعمل الفاظ کی بنیاد پر ۱۸۱۴ء میں ہندوستانی پریس سے کھڑی بولی اور انگریزی میں ایک فرہنگ شائع کی تھی" جب کہ مصنفہ موصوفہ نے "متفرقات" کی توضیحی فہرست سے بہ عنوان "پریم ساگر" (کھڑی بولی یا ہندوی میں) کا لغت ولیم پرایس" (ص ۶۲۶) پر بھی اس کو درج کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر متفق علیہ ہے کہ گل کرسٹ نے کالج کے وابستگان کی جن کتابوں پر انعامات کی سفارش کی خاطر فہرست تیار کی تھی اس میں پریم ساگر کو بھی شریک کر کے للولال جی کوی کے لیے دو سو روپیے تجویز کیے تھے۔ اسی مجوزہ فہرست میں "راج نیتی" بھی شامل تھی لیکن جیسا کہ سوانحی باب میں بالتفصیل عرض کیا گیا للولال جی کوی کی دونوں کاوشوں میں سے کسی کو اس وقت یا بعد میں انعام کا مستحق نہیں سمجھا گیا جو بڑی ناقدری کی بات تھی۔

اتفاقاً "پریم ساگر" کی ابتدائی صورت موسومہ "سری بھاگوت" کی تین ہم نام فارسی کتب کا علم ہوتا ہے جن میں سے دو منظوم ہیں۔ ان میں کی دوسری بہ نام "سری بھاگوت" دسم اسکند منظوم مشتمل بر احوال سری کرشن مؤلفہ لالہ پران ناتھ مکتوبہ ۱۹۰۵ بکرمی ۱۸۴۸ء" کا نسخہ" باڈلین ۱۳۱۶ کہ ہمہ در نثر است" مگر کسی کا بھی للولال جی کوی سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج نیز معاصر ادبیات سے متعلق اردو کی کئی تحقیقی و ناقدانہ تصانیف میں سے جناب جمیل نقوی اور ڈاکٹر شہناز انجم کی کتاب میں سرے سے للولال جی کوی کو بہ طور اردو ادب یا مصنف یا مترجم زیب عنوان نہیں کیا گیا ہے جب کہ پروفیسر وقار عظیم اور پروفیسر جاوید نہال صاحبان نے "پریم ساگر" پر اظہار خیال نہیں کیا ہے۔ ہندی شعر و ادب کی اپنی مفید مختصر تواریخ میں علامہ نیاز فتح پوری اور پروفیسر حبیب اللہ غضنفر نے "پریم ساگر" کے خاص حوالے سے ہی للولال جی کوی کے کارہائے نمایاں کا ذکر کیا ہے جو آیندہ ایک مباحثے میں اقتباس ہوگا۔ پروفیسر سید محمد کی طرح ڈاکٹر عابدہ بیگم اور ڈاکٹر سمیع اللہ نے بھی "پریم ساگر" پر اظہار خیال کیا ہے جو ان کے فاضلانہ الفاظ میں منقول ہے۔ آخر الذکر جایزہ نگار نے "پریم ساگر" کی بنیاد پر للولال جی کوی کی ہندی نگاری پر عمومی رائے دی ہے جب کہ ڈاکٹر عابدہ بیگم نے بہ خصوصیت مگر اختصار سے لسانی تجزیہ پیش کیا ہے۔

لے یہ حوالہ دیکھیے اگلے صفحے پر۔

"پریم ساگر" کے حوالے سے ڈاکٹر سمیع اللہ کا اجمالی جائزہ ہے کہ "جدید ہندی نثر کی ترقی میں للولال کی ہندی کتابیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے ہندی نثر کی کوئی قابلِ قدر تصنیف موجود نہیں تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے "پریم ساگر" اور دوسری کئی کتابیں تصنیف کر کے ہندی نثر کے اعلیٰ اور وقیع نمونے پیش کیے جو بعد کے ہندی مصنفین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔" (ص ۱۵۱) اسی تسلسل میں مورخ موصوف نے للولال جی کوی کے ایک ممدوح اور شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر کپتان جان ولیم ٹیلر کا یہ تاثر بھی روایت کیا ہے جو اس انگریز فاضل کی جانب سے ذاتی قدرشناسی کا ثبوت ہے، ٹیلر نے ان کے کارناموں کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ خالص ہندی نثر لکھنے والوں میں للولال سے قابل کوئی دوسرا شخص نہیں۔" ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے "پریم ساگر" کی مناسب تحسین و قدردانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے للولال جی کوی کی ہندی نگاری کا تجزیہ کیا ہے۔ "پریم ساگر" میں للولال جی نے آگرہ اور دلی کی کھڑی بولی استعمال کی ہے چنانچہ "پریم ساگر" میں کھڑی بولی کے بے حد رواں اور شگفتہ نمونے نظر آتے ہیں۔ زبان آسان ہے اور موضوع سے مطابقت رکھتی ہے۔ للوجی کے انداز تحریر نے "پریم ساگر" کے بیانات کو بے حد عمدہ اور نظم کی سی دل کشی عطا کی ہے۔ ہندی کے آسان الفاظ طبع لطیف پر گراں نہیں گزرتے۔ درمیان میں دوہے اور چوپائیاں بھی شامل ہیں۔" (ص ۴۳)

ڈاکٹر عبیدہ بیگم صاحبہ نے اپنے گرامی نامہ مورخہ غازی پور ۲۲/۱۱/۹۰ء میں انکشاف کیا ہے کہ بنارس سے چوکھبا وشوا بھارتی نے "پریم ساگر ناگری رسم الخط میں" شایع کیا ہے۔ یہ ایک بڑا ادارہ ہے جس کی دل چسپی ہندِ قدیم کے آثار کی تجدید و احیاء اور اشاعت کے عمل سے وابستہ ہے اور جس نے صرف مطالعہ سنسکرت کے موضوعات پر اپنے سلسلہ کتب میں ختم سال ۱۹۹۰ء تک ایک سو سے زاید جلدیں پیش کی ہیں۔ اغلب ہے کہ "پریم ساگر" کے تازہ ترین ایڈیشن کو اپنے سلسلۂ مطبوعات میں شریک کرتے ہوئے ادارے نے کسی جدید فاضل کے لکھے ہوئے مقدمہ اور سوانح للولال جی کوی کا اضافہ کیا ہوگا مگر بہ حالات موجودہ

ا؎ ڈاکٹر محمد بشیر حسین "مجلہ ادارۂ تحقیقات پاکستان جامعہ پنجاب" لاہور اکتوبر ۱۹۷۰ء شمارہ خصوصی فہرست مخطوطات شیرانی (ب)، ہندو مذہب و تصوف ص ۲۶۷ تا ۲۶۹ شمارہ ۱۴۸۴ تا ۱۴۸۶۔ ملاحظہ ہو بطور خاص مؤخر الذکر کی تصریح۔

رابطہ ممکن نہیں ہے اس لیے افسوس کہ تفصیلات سے لاعلمی ہے۔ جامعۂ بمبئی کے عکسی عطیات سے مظہر ہے کہ بنارس کی ہی کاشی ناگری پرچارنی سبھا نے اپنی گرنتھ مالا۲۷ کے بہ طور ۱۹۵۳ء کے قریبی برسوں میں برج رتن داس کے ترتیب دادہ "پریم ساگر" کا متن ایک سے زاید بار طبع کیا ہے۔

"پریم ساگر": مختلف النوع تراجم

"پریم ساگر" کے ماخذ برج ترجمے اور اصل متن کے بھی دوسرے مترجمہ روپوں سے للو لال جی کوی کی اس کتاب کا رشتہ و تعلق واضح ہے اس پر مستزاد "پریم ساگر" کے اپنے تراجم جن کی تفصیلات دوسرے مختلف النوع متون سے زیادہ تذکرے اور جگہ کا استحقاق رکھتی ہیں۔ یہ ایک وسیع سا منظر نامہ ہے بشرطیکہ اس کے ہر رخ کی مفصل کیفیتوں کا حصول ممکن ہو اور جو فی الوقت زیادہ ہم دست نہیں ہیں چنان چہ کچھ ضروری مختصرات اور دستیاب تفصیلوں کو یہاں سمونے کی کوشش کی جارہی ہے۔ "پریم ساگر" کے اپنے متعلقات میں سے اس کی اصل یعنی برج کتاب سے مستفاد ہم نام اردو مثنوی نیز "پریم ساگر" کے اردو قالب اور انگریزی ترجمہ ایسٹ وک کو علاحدہ علاحدہ عنوانات کا موضوع بنایا جارہا ہے۔ اس پر ایسٹ وک ایڈیشن کی بالتفصیل کیفیت مستزاد کہ اوراق ہٰذا کی تحریک اسی سے ہوئی ہے۔

"پریم ساگر" کی اردو میں منتقلی کا عمل خود للولال جی کوی کی اس کتاب کے اردو قالب سے ہی ہوتا ہے جس کی مختلف صورتوں کا ذکر چند محققین کے یہاں مل جاتا ہے انجمن ترقی اردو کراچی کی "قاموس الکتب" ج ا ص۱۱۱ میں ایک اندراج بہ الفاظ د: "۲۱۳/۱۱۱۔ للولال کوی: پریم ساگر ۱۸۰۳ء فورٹ ولیم کالج کلکتہ" موجود ہے اور ضروری تفصیل مفقود۔ ممکن ہے یہ ابتدائی مختصر ایڈیشن کا اردو متن ہو۔

۔ پروفیسر جاوید نہال کے یہ الفاظ اہم ہیں کہ للولال جی کوی کی کتب میں سے "لطایف ہندی" "ودیا درپن" اور "پریم ساگر" ہندی لپی کے علاوہ فارسی رسم الخط میں بھی شایع ہوئی تھیں۔ دونوں لپیوں کی زبان ایک ہے، لپیوں کے علاوہ عبارت میں معمولی فرق بھی نہیں ہے" (ص۸۱) ڈاکٹر عابدہ بیگم نے بھی صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ "پریم ساگر" ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں شایع ہوتی رہی" (ص۳۲) اس درجہ قیمتی اطلاعات کی کوئی تفصیل ان ذرایع سے حاصل نہیں ہوتی ہے البتہ ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنی

مترجمہ "تاریخ بنگلہ ادب" میں ایک جگہ مختصر معلومات اضافہ کی ہیں: "پریم ساگر" چوں کہ فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں رہی ہے لہٰذا یہ اردو میں بھی چھپی۔ پریم ساگر کے کئی ایڈیشن ایسے بھی شایع ہوتے جو "باغ و بہار" کے ساتھ چھپے مثلاً "باغ و بہار" و "پریم ساگر" کا ایک ایڈیشن مظہر العجایب پریس کلکتہ دسمبر ۱۸۷۲ء میں نکلا جو اس طرح کا تیسرا ایڈیشن ہے" (حاشیہ ۱ ص ۳۱۲) ظاہر ہے کہ منقولہ روایات میں ضروری کیفیتوں کا فقدان ایک تکلیف دہ امر ہے جس کا مداوا نہ ہو سکا ہے۔

ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی مترجمہ اسی "تاریخ بنگلہ ادب" میں نام ور بنگلا فاضل اور للولال جی کوی کی "بیتال پچیسی" کے مترجم ایشور چند ودیاساگر کے تذکرے میں "پریم ساگر" کا بھی ایک ترجمہ ان سے منسوب ہے: "ودیاساگر کی ابتدائی تصانیف فورٹ ولیم کالج کے نصاب تعلیم سے متعلق ہیں۔ پہلی تصنیف داستانِ کرشن سے ہے جس کی بنیادی ہندی تصنیف "پریم ساگر" پر تھی اور جو فورٹ ولیم کالج کے طلبا کے لیے لکھی گئی تھی لیکن یہ کتاب شایع نہیں ہوئی" (ص ۳۱۲/۳۱۳)۔ یہ ودیاساگر گزشتہ صدی کے وسط اور آخر کی شخصیت رہے ہیں اور فورٹ ولیم کالج سے آخری دور میں منسلک تھے" "پریم ساگر" کا ان کا یہ بنگالی ترجمہ اگر طبع ہوا ہوتا تو ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریا بہ طور مترجم "تاریخ بنگلہ ادب" اپنے مفید حواشی میں اس اطلاع کا بھی اضافہ ضرور فرماتے۔

ڈاکٹر شاردا دیوی ودیالنکار ص کے حاشیے میں راوی ہیں کہ روسی ہند شناس اسکالر بارانیکوف نے "پریم ساگر" کا روسی زبان میں ترجمہ کیا تھا جو لینن گراڈ سے شایع ہوا۔ فاضل بارانیکوف ہندیات پر اپنی تحقیق کے باعث خاصے نام ور ہیں۔ بلوم ہارٹ نے تذکرہ ہندی مطبوعات انڈیا آفس میں "پریم ساگر" کے ایڈیشنوں کی فہرست سازی کرتے ہوئے حسب طریقہ آخر میں تراجم کے ذکر میں E. Lamaresse کے فرانسیسی ترجمہ "پریم ساگر" کا نام لیا ہے جو پیرس سے ۱۸۷۳ء میں شایع شدہ ہے۔ البتہ فرانسیسی عنوان درج نہیں ہے چنان چہ اس ترجمے کی کیفیت بلیوتھیک نیشنل پیرس سے دریافت کی جارہی ہے، ممکن ہے وہیں سے کچھ اور کتابوں کا حال بھی سامنے آجائے۔ البتہ گارساں دی تاسی کے خطبات حصہ اوّل میں "پریم ساگر" کے سلسلے کے فرانسیسی ادب کا اشارتاً اور ضمناً کچھ مذکور مل جاتا ہے جس کے علاوہ بھی خود "پریم ساگر" پر چند ایک مختصر بیانات متعلقہ مجموعے میں پائے جاتے ہیں۔ آیندہ عنوان میں سے ان میں سے زیادہ تر اطلاعیں

جمع کی گئی ہیں اور کچھ اور معلومات دوسرے موقعوں پر اقتباس کی جائیں گی۔

"پریم ساگر" دی تاسی کے خطبات میں:۔

گارساں دی تاسی نے دسمبر ۱۸۵۲ء کے خطبے میں پریم ساگر کے ایک پیش رو ہندی منظومے کے فریخ ایڈیشن ترجمے کے ہم راہ "بھگوت گیتا" پر ایک نامکمل کارنامے کا بھی انکشاف کیا ہے:" اسی پران کے ترجمے اور طبع کا کام جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا ہندیات کے ایک مشہور عالم نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا' وہ اسی دسویں باب تک پہنچا تھا کہ موت نے علم وادب کے اس سرمایہ ناز کو ہم سے چھین لیا۔ لیکن ایک اور کتاب جو ہندی و ہندی نظم میں ہے اور اسی دسویں باب کے تتبع میں لکھی گئی ہے اور پریم ساگر سے بھی قدیم ہے فرانسیسی زبان میں حال میں موسیو TH. Pavie تھامس پاوی نے طبع کرائی ہے' مجھے اس بات کا فخر ہے کہ موسیو موصوف میرے شاگردوں میں ہیں۔ اس کا نام کرشن جی اور ان کی تعلیم ہے۔ اسے یوژین بورنوف Eugene Bournouf کی کتاب کا تتمہ یا تکملہ سمجھنا چاہیے۔" (ص۴۹۔ ح ا)۔ ایک آیندہ موقع پر دی تاسی نے ہندی نظم نگار کا نام لالچ (کذا) اور فریخ ترجمے کا عنوان یہ تحریر کیا ہے (منقول از ح ا ص۱۶۳ حاشیہ)

"Krischna ETSA Doctrina" TH. Pavie

"خطبات" حصہ اوّل میں دی تاسی نے کئی مواقع پر للولال جی کوی کی "پریم ساگر" کا ذکر کیا ہے جس میں سے کچھ مقامات پر تراجم کے مختصر حوالے ہیں جو موقع بہ موقع پیش ہوں گے جب کہ ایک جگہ حضرت عیسے کی زندگی اور سری کرشن جی کی سوانح کا مقابلہ و مکابرہ بھی تحریر کیا ہے۔ ۵ر دسمبر ۱۸۵۲ء کا "تیسرا خطبہ" ڈیڑھ صفحات میں اختصار سے تینوں نوعیتوں کے تذکروں کو جامع ہے:" حضرات! میں اس سال پریم ساگر کی بھی تشریح کروں گا" پریم ساگر ایک کہانی ہے جو مسجع اور مقفےٰ عبارت میں لکھی گئی ہے اور جگہ جگہ اس میں نظم بھی آتی ہے۔ یہ کہانی کرشن جی کے حالات سے متعلق ہے اور بھاگوت کے دسویں باب پر مبنی ہے" (ص۴۹) ابتداً مذکورہ ہم موضوع فریخ کارناموں کے حوالے کے بعد پریم ساگر میں سوانح حضرت عیسیٰ کا عکس تلاش کرتے ہوتے دی تاسی نے دونوں شخصیات کی واقعاتی وکرداری مماثلتوں اور اضداد کو مجملاً بیان کر دیا ہے جس کے

ابتدائی الفاظ ہیں: "پریم ساگر ایک نہایت دل چسپ افسانہ ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مقدس تاریخ سے ماخوذ ہے۔ اس کے ہر صفحے میں عیسائی مذہب کے واقعات کا مبہم سا اعادہ نظر آتا ہے" (ص ۴۹) دی تاسی کے بہ قول ہم موضوع تاریخی مماثلت وتضادات پر اس کی اپنی ایک مستقل کتاب ہے جب کہ کرشن و عیسیٰ کی سوانحی مشابہتوں پر اس موقع کی گفتگو اس نے اگلے صفحے پر جاری رکھی ہے۔ "پریم ساگر" کے خاص حوالے سے کرشن بیتی اور سوانح عیسوی کے مختلف اور مماثل پہلوؤں اور امور کا یہ مقابلہ یقیناً ایک اچھوتا اضافہ تو ہو سکتا ہے لیکن دی تاسی کے اپنے زاویہ نگہ اور موقف کو خالی از غلو در کنار خالی از علت بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ چنان چہ اس کے جائزے سے اقتباسات محض وجہ طوالت ہوں گے۔

دی تاسی نے بعد کے ایک اور خطبے میں للو لال جی کوی کی ایک کاوش کو تقابلی انداز میں سراہا ہے۔ "بھگوت گیتا کے موضوع کرشن جی کی دل چسپ تاریخ پر ہندوستانی میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، سب سے بہتر لالچ (کذا) کی ہے جو فرانسیسی میں ترجمہ ہو گئی ہے۔ بھوپتی اور کرشن داس نے بھی اس مضمون پر بڑی اچھی نظمیں لکھی ہیں لیکن سب سے بڑھ کر لال کی تالیف "پریم ساگر" ہے جو ہندی ادب میں بڑا پایہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کے متن میں جگہ جگہ نظم بھی آتی ہے جس میں پرانے لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی نثر میں اس نظم سے عجیب لطف آتا ہے" (ص ۱۶۲/۱۶۳)۔ کسی موقع پر ایک انگریز افسر نے جس کا نام دی تاسی نے ظاہر نہیں کیا دیگر وقیع کتب کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے کارناموں پر بڑی تنگ دلی سے بلکہ سنگ دلانہ گرفت کی تھی جس پر گارساں دی تاسی خفگی سے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کتابوں میں للو لال جی کوی کی پریم ساگر کے علاوہ "راج نیتی" بھی شامل تھی: "حضرات! میں تصور کرتا ہوں کہ آپ لوگ ہندوستان کے اس انگریز حاکم کی رائے سے اتفاق نہ کریں گے جو اپنی رپورٹ مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۸۵۴ء میں کتابوں کا اور خاص کر "باغ و بہار" "گل بکاولی" "اخلاق جلالی" "زبدۃ الخیال" "پریم ساگر" "ست سئی" اور "راج نیتی" کا جو میری رائے میں ہندوستانی ادب میں بہت نفیس کتابیں ہیں نہایت حقارت سے ذکر کرتا ہے اور بچوں کا کھیل سمجھتا ہے جس سے دل و دماغ میں ہرگز اعلیٰ اور شریفانہ خیالات پیدا نہیں ہو سکتے" (ص ۱۹۶)۔ دی تاسی نے اس شخص کے دیگر مزعومات کی بھی

مذمّت کی ہے اور اب یہ فورٹ ولیم کالج کے لائق مورخین کی ادبی ذمّہ داری ہے کہ وہ اس بے ادب اور کور ذوق کی شخصیت کو بے نقاب کریں۔ بہ ظاہر کالج کے محققین کی نگاہوں سے گارساں دی تاسی کا یہ انکشاف اوجھل ہے اور نیتجتاً اس بد ذوق انگریز کی شخصیت پردۂ اخفا میں ہی ہے۔ ڈاکٹر ستندر کے مقالے" ۱۸ویں اور ۱۹ویں شتابدی میں ہندی" سے معلوم ہوتا ہے کہ فیلن کی "ڈکشنری" کے سمبندھ میں لکھے ہوئے جون بینس کی ٹپنّی تھی۔ "ایک نویودک سویلین کے سامنے جب وہ یہاں آئے 'یدی' پریم ساگر" تھا 'باغ و بہار' جیسی گندی اور بے کار چیزوں کے بجائے ایسا سنگرہ رکھا جائے تو وہ اتنی بھاشا کو ایک ہی سال میں جان لے گا جتنی کہ اب اچھے سے اچھے ودوان دس یا پندرہ ورش میں جان پاتے ہیں۔" (ص۱۹)

گارساں دی تاسی نے اپنے خطبہ مورخہ ۷/۱۲/۱۸۶۳ء میں سرکاری امتحانوں کی نصابی کتب میں" پریم ساگر" کے شمول کا ذکر کیا ہے: سول سروس کے امتحان کے لیے اب حسب ذیل ہندوستانی کی کتابیں نصاب میں رکھی گئی ہیں۔ اوّلاً اردو کے لیے" باغ و بہار" "اخوان الصفا اور" سیر المتاخرین" کے انتخابات ـــــ ثانیاً ہندی کے نصاب میں حسب ذیل کتابیں رکھی گئی ہیں: "پریم ساگر" "سنگھاسن بتیسی" اور شاید" راج نیتی" اور تلسی داس کی" راماین" کے انتخابات۔ میں نے یہ معلومات عبداللطیف سے حاصل کی ہیں" (ص۳۵۲)۔ یہ سلسلہ ایک طویل طریقۂ عمل کا حصّہ تھا چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے اپنے طرز تعلیم و تدریس سے اس کا آغاز ہوا تھا جس کی امتحانی ضروریات کے لیے" پریم ساگر" اور دوسری ساری ہی کتب کو استعمال کیا جاتا تھا جو سبھی داخل نصاب تھیں۔ مثلاً ڈاکٹر سمیع اللہ نے ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کے حوالے سے ایسے نصابات میں" پریم ساگر" کو مستعمل بتایا ہے اور شعبۂ فارسی کے منشی سید علی جعفری کے حالات میں لکھا ہے کہ:" سکریٹری رڈیل نے ۱۸/ مئی ۱۸۲۵ء کو پرلیس کو مطلع کیا کہ ۲۴/ مئی ۱۸۲۵ء کے بعد انہیں جب موقع ملے منشیوں کا ہندی میں امتحان لیں۔ اس کے بعد ہندوستانی اور بنگلہ شعبے کے اکتیس (۳۱) منشیوں نے ہندی کا امتحان دیا' جن میں سید علی بھی شامل تھے۔ اس امتحان کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان منشیوں میں زیادہ تر" پریم ساگر" اور" راج نیتی" کو بہ خوبی پڑھ سکتے تھے لیکن وہ دیوناگری رسم خط نہیں لکھ سکتے تھے" (ص۱۶۴)۔ غالباً یہ سبھی کتابیں یا پھران

کی بیشتر کلکتہ کے علاوہ کمپنی کی دوسری پریسیڈنسیوں میں بھی مستعمل تھیں کم ازکم "پریم ساگر" پر جمع شدہ اطلاعوں کی رو سے للولال جی کوی کی یہ کتاب تمام پریسیڈنسیوں میں شاملِ نصاب تھی۔

"پریم ساگر" ایسٹ وِک کا ترجمہ اور احوال

ایڈورڈ بی ایسٹ وِک نے اپنا انگریزی ترجمہ "پریم ساگر" ۱۸۵۱ء میں شایع کیا جس کے سرورق اور مقدمۂ مترجم کے علاوہ چند اور صفحات سے بھی عکس برٹش لائبریری لندن کے کیوریٹر گرامی قدر سلیم قریشی صاحب نے ارسال فرمائے۔ سرورق کے منسلکہ عکس کے مطابق اس کے مندرجات اردو الفاظ میں منقولہ ذیل ہیں: "پریم ساگر" یا بحرِ الفت۔ شری للولال کب کے ہندی متن سے ادبی ترجمہ (بہ زبان) انگریزی از ایڈورڈ بی ایسٹ وک رکن رایل ایشیاٹک سوسائٹی رکن انجمن ہلئے ایشیائی پیرس و بمبئی نیز پروفیسر اردو اور مہتمم کتب خانہ ایسٹ انڈیا کالج ہیلی بری۔ ہرٹفورڈ: مطبوعہ و شایع کردہ اسٹیفن آسٹن کتب فروش ایسٹ انڈیا کالج لندن: جیمس میڈن، یڈن ہال اسٹریٹ۔ ۱۸۵۱ء" ایڈورڈ بی ایسٹ وِک کا پیش لفظ صرف ایک صفحے پر مبنی ہے جس کے آخر میں تاریخ و مقام کا کوئی داخلہ نہیں ہے اور فاضل کیوریٹر جناب سلیم قریشی کا فرمودہ ہے کہ اس مقدمہ مترجم کا متن اسی ایک صفحے پر درج ہے۔ اس کا ترجمہ ایسٹ وِک ایڈیشن کے مقدمہ مرتب کے ساتھ آیندہ کسی عنوان کے تحت پیش ہوگا۔ کتاب للولال جی کوی کے اپنے پیش لفظ کے ترجمے کے ماقبل اس کی تعارفی سطور سے شروع ہوتی ہے اور صہ ۲ پر اس کے خاتمے کے معاً بعد صہ ۲ سے ہی ابواب کے ترجمے کا ان کے پیشگی خلاصے کے ساتھ آغاز ہوجاتا ہے۔ ایسٹ وِک نے ان ہی خلاصوں کو اپنے ہندی ایڈیشن کی ترتیب میں بھی بعینہٖ یعنی ہرادھیائے کے متن سے پیش تر استعمال کیا ہے۔ یہ انگریزی ترجمہ ایسٹ وِک ۲۱۷ صفحات کو محیط ہے۔ ہر باب کے ترجمہ سے پہلے اس کا خلاصہ بھی دیا گیا ہے۔ ذریعہ ہٰذا ایسٹ وِک کے سوانحی کوائف کی پیش کش کی غرض سے انگریزی مصادر سے عکسی نقول کی فراہمی کا بھی اہتمام خاص حضرت سلیم قریشی ممدوح نے فرمایا ہے۔

سی ای بک لینڈ کے مختصر تذکرے کے مطابق ایسٹ وِک کی سوانح نیز "نیشنل بایوگرافی" سے فہرس مطبوعات ایسٹ وک پیش ہے۔ ایسٹ وک کی ابتدائی تعلیم آکسفورڈ کے کالجوں میں ہوئی۔ بہ عمر ۲۲ سال ۱۸۳۶ء میں ہندوستان آکر بمبئی رجمنٹ میں بھرتی ہو گیا مقامی السنہ

میں مہارت کی بنا پر سیاسی محکمے میں منتقل ہو کر کاٹھیاواڑ اور سندھ میں خدمات سرانجام دیں، ۱۸۴۲ء میں خرابی صحت کی بنا پر وطن واپس ہو ... فرینک فورٹ میں مطالعہ السنہ میں مشغول ہو گیا، ۱۸۴۵ء میں کمپنی نے ہیلی بری کالج میں ہندوستانی کا پروفیسر مقرر کیا کالج کے خاتمے پر ۱۸۵۹ء میں دفتر ہند میں بہ طور نائب سیاسی معتمد تقرری ہوئی مگر ۱۸۶۰ء میں مڈل ٹمپل بار میں شمولیت اختیار کی گو باقاعدہ وکالت نہیں کی، اسی سال شاہ ایران کے دربار میں وفد کا معتمد ہو کر تہران گیا جہاں ۱۸۶۳ء تک اسی عہدے پر رہا، ۱۸۶۴ء اور پھر ۱۸۶۷ء میں بھی جنوبی امریکی ملک وینزولا میں قرضوں کے حصول کے کمشنر کی حیثیت سے مقرر ہو کر گیا، ۱۸۶۶ / ۱۸۶۷ء میں برطانیہ کے معتمد امور ہند کا ذاتی معتمد رہا، ۱۸۶۸ء تا ۱۸۷۴ء دارالعوام میں قدامت پسند جماعت کا رکن رہا لیکن ۱۸۷۴ء کا انتخاب ہار بیٹھا، ۱۸۷۵ء میں آکسفورڈ نے ایم اے کی اعزازی ڈگری پیش کی، ۱۸۷۴ء سے ہی بھرپور ادبی مصروفیات میں منہمک ہوا اور کئی نئے کارنامے سرانجام دے کر ۱۶ر جولائی ۱۸۷۳ء کو رحلت کی۔

ایڈورڈ ایسٹ وِک کی علمی ادبی خدمات کا دائرہ لسانیات سے اٹھا کر مختلف زبانوں سے تراجم کے ایک وسیع اور متنوع منظر نامے کو محیط ہے جس میں اس نے اقصائے عالم کے چند حصوں کے سفر سے خوب خوب فایدہ اٹھا کر ان کا بھی فیضان منتقل کیا۔ اس نے تحریری عمل کی بسم اللہ سفرِ ہند کے دوران ایک سندھی لغت کی تالیف اور "ہندوستان میں پارسیوں کی آمد: قصہ ہائے سنجان" کی منتقلی سے کی (مطبوعہ ۱۸۴۵ء)۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کا ذکر اپنے مقالے "یوروپین محبانِ فارسی ہندوستان میں" مشمولہ فارسی زبان وادب" میں بہ صفحہ ۲۴۳ کیا ہے: "قصہ سنجان، بہمن بن کیقباد نے فارسی نظم میں پارسیوں کی ہندوستان میں آمد اور آباد ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ انگریزی میں ای بی ایسٹ وک صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ (جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی ج ا ص ۱۶۷-۱۹۱- ریو: ا ص ۵)"۔ ایسٹ وِک نے برطانیہ واپسی پر اوّلاً   کی "تقابلی قواعد" کا ترجمہ کیا (مطبوعہ ۱۸۵۶ء) اور شلر کی جرمن کتاب "نیدر لینڈ" کی بغاوت بھی انگریزی میں منتقل کی (مطبوعہ ۱۸۴۴ء)۔ "ہندوستان کی جامع قواعد"، ۱۸۴۷ء میں انگریزی میں شایع کی (بہ قول دی تاسی خطبہ ۱۸۵۹ء "لندن میں ریورنڈ مسٹر اسمال نے مسٹر ایسٹ وِک کی "ہندوستانی قواعد" کا جدید نسخہ مفید اضافوں کے ساتھ شایع کیا ہے" ج ا ص ۲۵۲) ۱۸۵۱ء میں پریم ساگر" کے مترجمہ اور مصحح دوالگ ایڈیشن

طبع کیے، ۱۸۵۲ء میں "باغ و بہار" کا ترجمہ نیز "گلستان" کا ترجمہ "روز گارڈن" اور ۱۸۵۴ء میں "انوارِ سہیلی" کا ترجمہ "فیبلس آف پیل پائے" (بیدپا) چھپوایا۔ (۱۸۵۹ء کے خطبہ دی تاسی میں ص ۲۵۹ پر ایسٹ وِک کے "پریم ساگر" کے رومن حروف کے ایڈیشن کے منصوبے کا ذکر ہے مگر زیرِ تذکرہ دونوں سوانحوں اور کسی اور ذریعے سے اس کی طباعت کا علم نہیں ہو سکا ہے)۔

۱۸۵۹ء میں مرے MURRAY کے مشہور سلسلۂ کتب کے لیئے "ہینڈ بُک فار انڈیا" لکھی جس کے تسلسل میں اسی قسم کی صوبہ وار ہینڈ بکیں متعلقہ مدراس، متعلقہ بمبئی، متعلقہ بنگال، متعلقہ پنجاب وغیرہ ۱۸۸۳ء تک تحریر اور شایع کیں۔ اندریں اثنا سفر و قیام ایران ۱۸۶۰ تا ۱۸۶۳ء پر مبنی مشاہداتِ سفارت دو جلدوں میں ۱۸۶۴ء میں نیز ۱۸۶۸ء میں وینزویلا یا جنوبی امریکی مملکت میں زندگی کے خاکے" متعلقہ سفارت ۱۸۶۴ء و ۱۸۶۷ء بھی طبع کروائے۔

"قیصر نامۂ ہند" نامی دو مجلدات برطانیہ کے دفترِ ہند اور متعدد ہندوستانی راجوں مہاراجوں کی سرپرستی میں ۱۸۷۸ء و ۱۸۸۰ء میں شایع کیں جو مختلف ہندوستانی رجواڑوں اور دیسی ریاستوں کی گزشتہ و عصری تاریخ کا حصہ ہیں۔ کئی علمی ادبی جراید کے علاوہ جن میں چارلس ڈکنس کا مجلہ (مجموعہ؟) "آل دی ایئر راؤنڈ" بھی تھا اور جس کے لیے اسی کی فرمائش سفارت پر وینزویلا کا سفرنامہ لکھا تھا۔ ایسٹ وِک نے "برٹانیکا" کے طبعِ ہشتم کے لیے بھی مقالے تحریر کیے۔ ایسٹ وِک نے بائبل سوسائٹی کے لیے ایک متن دکنی میں بھی ایڈٹ کیا تھا نیز بکلینڈ کے بہ موجب اس نے برصغیر کے کئی سفر کیے تھے اور سندھی لغت کے علاوہ قیامِ سندھ کے تجربات بھی سپردِ قلم کیے مگر ان سب بیانات کی تفصیل نہ مل سکی۔ دی تاسی نے "مقالات" جلد ۲ میں ایسٹ وِک کے ۱۸۷۵/۱۸۷۶ء کے سفرِ ہند کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر نیرج گوئل کی کتابیات سے فریڈرک چارلس ڈنورس کی تفصیل "میموریلس آف اولڈ ہیلی بری کالج" لندن ۱۸۹۳ء کا علم ہوتا ہے۔ اس کتاب کو اپنے عنوان پر درجہ استناد حاصل ہوگا لیکن خود اس کا حصول ممکن نہ ہو سکا۔ چنان چہ فی الحال بر سبیلِ تذکرہ بلکہ اسی خاص مناسبت سے ہیلی بری کالج پر بھی مختصر سی اطلاعات گارساں دی تاسی اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم سے مستفاد ہیں۔ ثانی الذکر مورخ نے ہیلی بری کالج کی تاسیس کے بارے میں لکھا ہے کہ ۱۲ر مئی ۱۸۰۶ء کو کورٹ آف ڈائریکٹرس نے کم و بیش فورٹ ولیم کالج کی طرز پر ہیلی بری میں "ایسٹ انڈیا کالج" کے نام سے ایک تعلیم گاہ قایم کی۔ اس

کا بھی مقصد یہ تھا کہ ہندوستان جانے والے کمپنی کے ملازم کو ابتدائی تربیت بہم پہنچائی جائے، انہیں اعلا معیار کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ ہندوستان میں مختلف عہدوں پر اپنی کارگزاریاں دکھا سکیں۔ یہ کالج ایک پرنسپل اور چھے پروفیسروں کے ساتھ شروع ہوا۔ یہاں کلاسیکی اور جنرل ادب، ہندی ادب، ایشیا کی تاریخ، عربی، فارسی اور ہندوستانی ادب کی تعلیم دی جاتی تھی" (ص۵۶)۔ ڈاکٹر سمیع اللہ نے تقریباً یہی معلومات بہ عنوان "ایسٹ انڈیا کالج ہیلی بری کا قیام اور فورٹ ولیم کالج کا چھوٹا روپ" ص۵۹/۶۰ پر دی ہیں۔ اور خلیل علی خاں اشک کے حالات میں اس اطلاع کا اضافہ کیا ہے کہ "اس کالج کے لیے ہندوستان سے بھی کچھ اساتذہ بھیجے گئے تھے ـــــ ان میں مرزا ابو طالب، میر عبدالعلی اور خلیل علی خاں اشک کے نام بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ادارہ اپنے قیام کے صرف پچاس برس پورے کرنے کے تقریباً فوری بعد ۱۸۵۷ء میں ختم کر دیا گیا تھا جس کے بعد کچھ متبادل انتظامات عمل میں آئے تھے، دونوں پر چند متفرق اطلاعیں دی تاسی کے ہاں سے دریافت ہوتی ہیں۔

گارساں دی تاسی نے ۱۰ دسمبر ۱۸۵۷ء کے خطبے میں اس ادارے کے سربراہ کے انتقال پر اپنے ذاتی تعلق کے حوالے سے تعزیتی کلمات تحریر کیے ہیں جس سے ان کے حالات کا پتہ چلتا ہے: "حال ہی میں تہران میں مرزا محمد ابراہیم کا انتقال ہوا ہے جو ہیلی بری کے ایسٹ انڈیا کالج کے پرنسپل تھے جہاں میری ان سے ۱۸۳۷ء میں ملاقات رہی۔ پھر موجودہ شاہِ ایران نے ان کو عہدۂ فرماں روا (گورنر) پر تقرر کر کے طلب کر لیا۔ وہ نہایت عمدہ انگریزی بولتے اور لکھتے تھے اور بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے لیے مشہور تھے۔ ہم ان کے احسان مند ہیں کہ انہوں نے ایک عمدہ فارسی صرف و نحو لکھی اور بہت سے دل چسپ مضامین فارسی علم و ادب کے متعلق یادگار چھوڑے۔ ۲۰ برس ہوتے کہ یہ مضامین ایک رسالہ موسوم بہ Athenaeum میں شائع ہوتے تھے۔ انہوں نے یشیغا نبی کی کتاب کا اور تاریخ روما کا فارسی ترجمہ اپنے شاگرد شاہِ ایران کے لیے کیا تھا" (ص۲۳/۲۲)۔

وسط ۱۸۵۹ء کے خطبے میں دی تاسی نے ہندوستان کے سلسلے میں ملکہ وکٹوریا کے انتظامی اعلانات کے حوالے سے اس کالج کے خاتمے کا ذکر کیا ہے: "ہیلی بری کا ایسٹ

انڈیا کالج قطعی طور پر ۴ ار دسمبر ۱۸۵۷ء کو مسدود کر دیا گیا اور اس موقع پر ایک پر وقار مجلس تقسیم انعامات کی منعقد کی گئی جس کے صدر نشین ریورنڈ مسٹر میلوں پرنسپل کالج تھے۔ یہ کالج پچاس سال سے قایم تھا' اس میں سے ۲۰۵۵ تلامذہ فارغ ہو کر نکلے (بہ حوالہ Allen's انڈین میل دسمبر ۱۸۵۷ء) جن میں ایسے افراد بھی ہیں جن کی شہرت یورپ بھر میں ہے۔ اس کالج کے پروفیسروں میں میکنٹوش ایپس' جرمی اور شرقی السنہ کے لیے ہاٹن' اسٹیوارٹ' جانسن اور ایسٹ وِک جیسے افراد تھے۔ ایسے فاضل پروفیسروں کے ہوتے ہوئے یہ امر باعث تعجب نہیں کہ یہاں سے کیسے کیسے قابل لوگ نکلے" (ص ۲۴۶)

ہیلی بری کالج کی بندش کی وجہ سے دی تاسی نے اسی مقام پر آیندہ اقدامات کی امید ظاہر کی تھی: "ہیلی بری کالج کی مسدودی سے جو نقصان مشرقی علوم کی تحصیل میں واقع ہوا ہے وہ ابھی سے محسوس کیا جانے لگا ہے۔ توقع ہے کہ انڈیا کونسل جدید کالج ان نوجوانوں کے لیے قایم کرے گی جو انڈین سول سروس کے لیے نام زد کیے جاتے ہیں"۔ (ص ۲۴۶)۔ کوئی پانچ برس بعد دسمبر ۱۸۶۲ کے خطبے میں دی تاسی نے متبادل انتظامات کا حوالہ دیا ہے: "ہیلی بری کالج کی جگہ Woolwich کی فوجی اکاڈمی میں مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے' یہاں مسٹر کاٹن ماتھر ہندوستانی زبان کی تعلیم دیتے ہیں مگر اب لندن کے کنگز کالج میں مشرقی علوم کا ایک علاحدہ شعبہ قایم ہوا ہے۔ ہیلی بری کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد متعدد اشخاص نے ملکی نظم و نسق اور علم و فضل میں بڑا نام پیدا کیا تھا' امید ہے کہ وہی روایات اب بھی قایم رہیں گی۔ کنگز کالج کے مشرقی علوم کے شعبے میں مسٹر فشنر ایڈورڈ ہال ہندوستانی زبان کی تعلیم دیتے ہیں اور مسٹر بلنٹاین سنسکرت پڑھاتے ہیں" (ص ۳۴۱)۔ متذکرہ علما کے من جملہ بہ خصوصیت کاٹن ماتھر کے کارناموں کے حوالے گارساں دی تاسی نے کئی خطبوں میں دیے ہیں جب کہ فشنر ایڈورڈ ہال کا نام للو لال جی کوی کی کتابوں کے تعلق سے بہ طور مترجم قبل ازیں لیا جا چکا ہے۔

پریم ساگر۔۔ ایسٹ وِک ایڈیشن

ایسٹ وِک کا مصحح و مرتبہ "پریم ساگر" کا ایڈیشن ایسٹ وِک کے انگریزی ترجمہ "پریم ساگر" کے علاوہ ہے۔ ثانی الذکر مجرد ترجمہ و خلاصہ ہے جب کہ یہ ایک حد تک مشترکہ ہندی

وانگریزی ایڈیشن ہے مگر مکمل طور پر مشترک انگریزی و ہندی اشاعت اس کو نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ وجہ یہ کہ مثلاً "مہابھارت" کے ایک کھنڈ کے اصل سنسکرت متن کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ شایع شدہ "نل اوپکھیانم" کے مشترکہ ایڈیشن کی طرح "پریم ساگر" کے اس طبعِ ایسٹ وِک میں ایک صفحے پر ہندی اور مقابل ورق پر انگریزی ترجمہ موجود نہیں ہے۔ دراصل اس ایڈیشن میں ایسٹ وِک نے سرے سے ترجمہ شامل ہی نہیں کیا ہے بلکہ ہر باب کی پیشانی پر اپنے ترجمے والا پیشگی انگریزی ملخص ہی درج کر دیا ہے۔ آخر میں ایک مکمل و جامع ہندی انگریزی فرہنگ کا اضافہ بھی کر دیا ہے اور یہ دونوں ہی اضافے یعنی تلخیص اور لغت بہر حال بے حد قیمتی ہیں۔ فریڈرک پنکاٹ نے ایسٹ وِک کے ترجمے سے اختلاف کی بناء پر لیکن ایسٹ وِک کے ہی اصل ہندی ایڈیشن سے خود بھی ۱۸۹۷ء میں "پریم ساگر" کا اپنا ترجمہ شایع کیا۔

"پریم ساگر" کے اس طبعِ ایسٹ وِک کے منسلکہ سرورق کے مندرجات کا سطر بسطر ترجمہ یہ ہے:-

---

لہ مونیر ولیمس "نل اوپکھیانم یا اسٹوری آف نل" آکسفورڈ ۱۸۷۹ء یعنی "مہابھارت" کے چھٹے کھنڈ متعلقہ تفصیل دمینتی کے اصل متن کے مقابل صفحوں پر انگریزی ترجمہ ڈین ملمن کی نظرثانی شدہ طباعت فاضل مرتب کے ۱۴ صفحات کے عالمانہ مقدمے کے بعدہ ۱۷ صفحوں پر متون اور ۱۵۵ صفحات کی مبسوط سنسکرت انگریزی فرہنگ سمیت اس بیش قیمت تالیف کی کل ضخامت ۵۳۲ صفحے کی ہے۔ یہ دوسرا ایڈیشن بھی راقم کے پاس موجود ہے اور برگزیدہ ہندوستانی فاضل ایم آر کالے کے چند بالراست سنسکرت انگریزی تراجم بھی عین اسی طرز پر مطبوعہ ہیں مثلاً "ابھیگیان شکنتلم"۔ یہاں یہ اضافے بے محل نہ ہوں گے کہ "ہریش چندر نل اوپکھیانم" نامی سنسکرت سے راست مستفاد منظومہ ۱۲ ویں صدی کے تیلگو شاعر رام راج بھوشن سے بھی یادگار ہے جب کہ منظومے پر مبنی احمد سرادی کی اردو مثنوی "نل دمن" مرتبہ پروفیسر سید عبداللہ انجمن ترقی اردو کراچی سے ۱۹۷۸ء میں طبع شدہ ہے۔ انگریزی میں سنسکرت "نل اوپکھیانم" کا فاضل مترجم ڈین ملمن بھاری بھرکم علمی شخصیت کا مالک تھا۔ جبکہ زیرِ تذکرہ ایڈیشن کا مرتب مونیر ولیمس خود بھی سنسکرت کا بڑا عالم اور قریب ۱۸۷۵ء آکسفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ اس ماہر ہندیات کو اردو سے بھی یک گونہ تعلق تھا۔ چنانچہ انگریزی حروف میں "باغ و بہار" کے ڈنکن فاربس کے مشہور تر ایڈیشن کے علاوہ مونیر ولیمس کا بھی ایک رومن قالب معروف رہا ہے۔

"پریم ساگر"

یا

بحرِ اُلفت

یعنی

سوانحِ کرشن

بہ مطابق دسواں بابؔ بھاگوت" از ویاس دیو

چتر بھوج مسر[1] کی برج بھاکھا[2] سے ہندی میں مترجمہ

از للولال

سابق بھاکھا منشی فورٹ ولیم کالج

طبع نو بہ مع فرہنگ

از ایڈورڈ بی ایسٹ وِک رکن انجمن ہمایونی ایشیا

رکن انجمن ہائے ایشیائی پیرس و بمبئی نیز پروفیسر اردو اور ناظم کتب خانہ ایسٹ انڈیا کالج ہیلی بری

ہرٹ فورڈ

طبع شدہ برائے عزت مآب ایسٹ انڈیا کمپنی بدست اسٹیفن آسٹن

کتب فروش ایسٹ انڈیا کالج

MDCCCLI

اس ایڈیشن کی ترتیب یہ ہے کہ ابتداً مقدمۂ مرتب کے بعد کتاب للولال کوی کے ہندی پیش لفظ پر انگریزی نوٹ کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اس کے معاً بعد یعنی دوسرے ہی صفحے سے جہاں للولال جی کوی کا دیباچہ ختم ہوتا ہے ایسٹ وِک کے اپنے انگریزی ترجمۂ "پریم ساگر" کی طرح پہلے باب یا ادھیائے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ابتدائے ابواب میں ترجمۂ انگریزی کی ہی طرح خلاصے کے انگریزی کلمات تحریر ہیں۔ کتاب چھوٹے بڑے کل نوّے ادھیاؤں کے ساتھ ۳۰۴ صفحات اور پھر ۱۹۵ صفحوں کی باضابطہ ہندی انگریزی

۱: اردو میں "مسر" اور "مسرا" کی ہی تحریر مناسب ہے ورنہ "مصر" سے التباس ہوگا۔

۲: "بھاکھا" کے اس روپ کا بھی چلن ہے اس لئے بعینہٖ تحریر کیا گیا ہے۔

فرہنگ کو جامع ہے اور یوں جملہ ۳۵ ۴ صفحات کو محیط کتاب کے موضوع کو کرشن بیتی کا نام دیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ فرہنگ کے صفحہ اوّل کے عکس سے ظاہر ہے اس کی ابتدا بھی ایک انگریزی نوٹ سے ہوتی ہے جس کے مطابق مشمولہ الفاظ کی تعداد ۵۳۸۸ ہے۔ اس کی ترتیب روایتی انگریزی لغات کی طرز پر قایم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک بسیط لغت ہے اور نہ صرف کتاب ہٰذا سے اکتساب کی خصوصی ضرورت کے تحت بلکہ اس کے معاصر ہندی ادب سے بھی استفادے کے لیے یہ قارئین کو حالیہ اور اس زمانے کی بھی اچھی سے اچھی ڈکشنری سے بے نیاز کرنے کے لیے کافی ہے جیسا کہ ایسٹ وِک کا داعیہ ہے۔

فرہنگ ہٰذا کی ترتیب و تالیف کا انداز اور طریقہ ملاحظہ ہو۔

—— ہر صفحے کی پیشانی پر پہلے کالم کا اولین اور دوسرے کا آخری لفظ درج ہے'

—— پھر انگریزی حروف S برائے سنسکرت اور H برائے ہندی وغیرہ ہر لفظ سے عین قبل بہ طور لسانی ماخذ تحریر ہیں۔

—— ازاں بعد دیوناگری میں ہندی لفظ اور ضمن میں اسی کے ہجے کو ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔

—— ساتھ ہی علامات قواعد بھی درج ہیں مثلاً N برائے Noun اور Adj برائے Adjective

—— اس کے بعد معنی اور تشریح ہے جو بہت کچھ مفید مطلب ہے'

—— ہر لفظ کے متعلقات کا اسی کے ضمن میں اندراج ہے نہ کہ بہ طور علاحدہ لفظ جیسے "انکوار" کی ذیل میں "انکوار بھرنا"۔

—— اضافی معنوں کے لیے انگریزی میں ۲ اور ۳ کے ہندسے لگا کر دیگر مطالب لکھے ہیں۔

—— اکثر الفاظ کی تشریح کے خاتمے پر کتاب میں ان کے پہلے پہل استعمال کا اشارہ تین اعداد دے کر اس طور کیا گیا ہے۔

—— ۱۶۴ : ۱ : ۸ یعنی بہ صفحہ ۱۶۴ پہلے پیراگراف کی آٹھویں سطر۔

یہ اطلاع دل چسپی کا باعث ہوگی کہ وسط ۱۸۵۹ء کے خطبہ دی تاسی کی رو سے ایسٹ وِک اپنے ترجمہ "پریم ساگر" اور زیر تذکرہ ایڈیشن کے علاوہ رومن حروف

میں بھی ایک اشاعت کی تیاری کر رہے تھے۔ گارساں دی تاسی نے اس منصوبے کا حوالہ چند ہندوستانی مطبوعات کے انگریزی کے ایسے ہی دوسرے ایڈیشنوں کے ذکر کے دوران دیا ہے: "نیز پریم ساگر کا ایک ایڈیشن۔ یہ ہندوستانی تصانیف میں شاہ کار ہے اوراس رومن ایڈیشن کی اشاعت مسٹر ایڈورڈبی ایسٹ وِک کر رہے ہیں۔ مسٹر ایڈورڈ بی ایسٹ وِک کا احسان ہے کہ انھوں نے دیوناگری حروف میں بھی اس کا ایک نسخہ شایع کیا اور بہت اچھا ترجمہ کیا ہے" (۲۵۹/۲۶:ج ۱)۔

"پریم ساگر" مقدمات ایسٹ وِک

ایسٹ وِک کے مقدمات بہ حیثیت مترجم و مرتب "پریم ساگر" متعلقات و ضمنیات پر وافر اطلاعیں فراہم کرتے ہیں اور دونوں کی مطلب خیز ترجمانی سے محصلہ معلومات کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ متون صرف ایک ایک صفحے کے ہیں اور بہ قول جناب سلیم قریشی کیوریٹر برٹش لائبریری ان مقدمات کا کوئی حصہ متعلقہ ورق کی دوسری جانب جاری اور واقع نہیں ہے۔

مقدمہ مترجم: "ناظرین کے روبرو "بھگوت پران" کے دسویں باب کے برج ترجمے کے ہندی قالب کا انگریزی ترجمہ ہے' یہ وہ مراحل ہیں جن کے وسیلے سے ہم اصل سنسکرت متن تک پہنچتے ہیں اور جو کتاب کے قبولِ عام کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ویدوں کے تراجم دنیا میں ہندوؤں کے اس مذہب کا علم عام کر رہے ہیں جو پرانے دھندلے ادوار کے آثار میں محفوظ تھا' "پریم ساگر" کا ترجمہ برمحل سمجھا جائے گا کیوں کہ واضح طور پر یہ آج کی ایک عظیم قوم کے مذہب کا مظہر ہے۔

اس کے ساتھ ہی توقع ہے کہ یہ قالب طلبائے ہندی کے لیے بھی کارآمد ہوگا اور اس خیال سے اس کو بالکلیہ ناقابلِ فہم ہونے سے بچاتے ہوئے ممکنہ حد تک لغوی بنانے کی زیادہ سے زیادہ سعی کی گئی ہے۔ کپتان ہولنگس کے گزشتہ ترجمے کے بارے میں یہاں کچھ کہنا ضروری نہ ہوگا۔ اس میں قابلِ لحاظ اغلاط ہیں حتیٰ کہ چند جگہوں پر پورے جملے تک چھوڑ دیے گئے ہیں اور مقدمہ تک نہیں ہے۔ اس میں اسمائے خاص کے

روپ بھی بدل گئے ہیں جس میں جزوی طور پر طباعت کے نقائص بھی ہوں گے۔ بڑی مشکل سے یہ نام پہچانے جا سکتے ہیں مثلاً "کام دھینو" "رام دھینو" بن گیا ہے نیز "اندر" "اندرو" اور "ویشیا" "By" "بن گیا ہے۔

یہ جھان بین کہ کس حد تک کرشن کی کہانی Gospel کی سوانح کی مضحک روایات کا بہروپ اختیار کر گئی ہے یہاں پر اضافہ کرنے کے لیے ذرا زیادہ سنجیدہ ہو جائے گی تاہم چوں کہ یہ یقین کرنے کے لیے محکم شواہد ہیں اس کتاب میں دل چسپی کی غرض سے تنہا یہی امر لازمی محرک رہے گا۔"

"پریم ساگر" کے ایسٹ وک ایڈیشن کے پیش لفظ سے متصل **مقدمۂ مرتب:-** معلومات کے مطابق زیرِ تذکرہ طباعت بہ قول اس کے ۱۸۱۵ والے اولین و بہترین ایڈیشن کی ضروری احتیاط کے ساتھ تیار کردہ اشاعتِ نو تھی جس میں ابواب کی انگریزی تلخیص اضافہ کی گئی جو طلباء کے لیے فایدہ مند سمجھی گئی خاتمۂ کتاب پر ایک بھرپور فرہنگ بھی شامل کی گئی جس سے قارئین کسی ہندی لغت سے بے نیاز ہو جائیں' اس میں ایسے متعدد الفاظ جمع کر دیے گئے جو تھامپسن کی تازہ ترین ہندی لغت تک میں غیر موجود تھے۔ مزید یہ کہ متنی اشارات کو بیش تر تبدیل کر دیا گیا اور حسبِ ضرورت سوالیہ و استعجابیہ نشانات بڑھاتے گئے۔ ٹائپ کی اغلاط کا بڑی حد تک ازالہ کر دیا گیا' تاہم چند در چند نقائص کی موجودگی کو قارئین کی جانب سے قابلِ معافی تصور کیا گیا خاص کر اس صورت میں کہ گزشتہ اشاعتوں بہ خصوصیت طبع ۱۸۳۱ء میں بارہ سو سے زیادہ غلطیاں در آئی تھیں۔

ایسٹ وک نے اس کے بعد اس تاثر کا اظہار کیا کہ یہ ذہن نشیں رکھتے ہوئے کہ ہندی ہندوستان کے سب سے بڑے علاقے کی زبان ہے اور متعدد مقامی بولیوں کے روپ میں بہار اودھ' نیپال' بندیل کھنڈ کی زرعی آبادیوں نیز راجپوتانہ اور سندھ و پنجاب کے قابلِ لحاظ علاقوں میں بولی جاتی ہے' یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے مطالعے کی اہمیت کو گویا خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا ہو۔ حکومت بنگال نے شمال مغربی صوبوں کو جانے والے سرکاری عمال کو قدرتاً یہ ہدایات جاری کیں کہ وہ ہندی کے امتحان میں کامیابی حاصل کریں' اور یہی استعداد زیادہ بڑے پیمانے پر افسرانِ فوج کے لیے بھی مطلوب رہی

چاہیے' اس صورتِ حال میں "پریم ساگر" کی تصحیح شدہ طباعت ناگزیر تھی کیوں کہ یہ کتاب ہندی میں بہ منزلہ اردو کی "باغ و بہار" کے ہے اور اسی لیے انتظامی و فوجی عملوں کے امتحانات کے نصاب میں یہ مقررہ ہے۔ بنا بریں ایسٹ وک نے امید ظاہر کی کہ عزت مآب مجلس نظما۔(ایسٹ انڈیا کمپنی) کی سرپرستی میں اس نصابی کتاب کی فراہمی ممکن ہو سکے گی۔

افسوس کہ راقم کے پاس محفوظ اس قدیم جلد کے سابقہ مالکوں میں سے کسی نے اس کے چند اوراق کی کرم خوردگی کے نتیجے میں مقدمہ مرتب کے صفحہ دوم پر بھی اس ورق کی حفاظت کے خیال سے ایک دبیز کاغذ چسپاں کر دیا ہے اور اس طرح بہ ظاہر ایسٹ وک کے پیش لفظ کا اگلا اور آخری صفحہ قابلِ مطالعہ واستفادہ نہیں رہا ہے۔ تاہم جناب سلیم قریشی کیوریٹر برٹش لائبریری کے فرمانے کے بہ موجب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندی فرہنگ کے اضافے اور ابواب کے ملخص انگریزی ترجمے نیز محتاط انداز میں متن کی تصحیح کے ساتھ پیش کردہ ایسٹ وک ایڈیشن کا یہ مقدمہ مرتب جو ایسٹ وک کے مقدمہ مترجم کی تاریخ تحریر کے اندراج کے بغیر ہے اسی ایک صفحے پر مشتمل ہے اور ورق کی پشت پر متن جاری نہیں ہے۔

"پریم ساگر" دیباچہ للولال جی کوی

فاضل ہندی مترجم للولال جی کوی کے پیش لفظ پر ایسٹ وک کا انگریزی نوٹ موجود ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: "فورٹ ولیم کالج کے منشی للولال جی کا پیش لفظ جنہوں نے "پریم ساگر" کو برج بھاکھا سے ہندی میں ترجمہ کیا بہ عہد گورنر جنرل مارکویس آف ویلزلی۔" یہ عین وہی الفاظ ہیں جو ایسٹ وک نے ترجمۂ "پریم ساگر" میں بھی اسی مقام پر تحریر کیے ہیں۔ اپنے پیش لفظ کا آغاز للولال جی کوی نے "شری گنیش آیے نام" کے الفاظ اور ایک برج قطعہ سے کیا جس کے بعد چند سطروں کے آگے بھی ایک برج قطعہ تحریر کیا۔ ان قطعات کو اردو "پریم ساگر" کے عکسی ورق میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ للولال جی کوی نے اس پیش لفظ میں جو کچھ لکھا اردو رسم الخط میں بعینہٖ منقول ہے۔

"ایک سمے بیاس دیو کی شری مدبھگوت کے دسویں کھنڈ کی کتھا کو چتر بھوج مسر نے

دو ہے چوپائی میں برج بھاشا کیا۔ سو پاٹھ شالا کے لیے شری مہاراج ادھیراج مسکل گن پندھان پلنیوان مہاجان مارکولیس ویلزلی گورنر جنرل پرتاپی کے راج میں اور شری یت گن گاہک گنئین سکھ دایک جان گل کرسٹ مہاشے کی آگیا سے سمبت بکرم ۱۸۶۰ میں شری للولال جی کوی گجراتی سہس اودیچ آگرے والے نے وس کا سارے یامنی بھاشا چھوڑ دلی آگرے کی کھڑی بولی میں کہہ نام "پریم ساگر" دھرا۔ پر شری یت جان گل کرسٹ مہاشے کے جانے سے بنا ادھ بنا چھپا ادھ چھپارہ گیا تھا' سو اب شری مہاراجیشور الی دیال کر پائیشوی یتجوی گل برٹ لارڈ منٹو پرتاپ وان کے راج میں اور شری گنوان سکھ دان کر پاندھان بھاگیہ وان کپتان جان ولیمس ٹیلر کی آگیہ سے اور شری یت پرم سجان دیا ساگر پروپ کاری ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی سہایتا سے اور شری نیٹ پر دین دیا یت بشن ابراہام لاکٹ ریونٹ کے کہنے سے اسی کوی نے سمبت بکرم ۱۸۶۶ میں پورا کر چھپوایا پاٹھ شالے کے ودیارتھوں کے پڑھنے کے لیے۔" ظاہر ہے کہ مدرسے سے مراد فورٹ ولیم کالج ہی ہے جب کہ مذکورہ سنین عیسوی ۱۸۰۳ء اور ۱۸۰۹ء کے برابر ہیں۔

للولال جی کوی کے اس اجمالی پیش لفظ میں ایک ایسا نکتہ بھی ہے جس پر بہ غور تامل کی ضرورت ہے۔ راقم کی مراد للولال جی کوی کے ان الفاظ سے ہے جن میں انہوں نے دلی آگرے کی کھڑی بولی اختیار کرنے کی توجیہہ کی ہے' متعلقہ عبارت یہ ہے: "وس کا سارے یامنی بھاشا چھوڑ' دلی آگرے کی کھڑی بولی میں کہہ نام" پریم ساگر" دھرا۔ لالہ سوامی دیال کے اردو "پریم ساگر" میں ان کلمات کا قالب یہ ہے: "اس کا سارے جامنی بھاکھا چھوڑ دہلی آگرے کی کھڑی بولی میں کہہ کر نام" پریم ساگر" دھرا۔" ایسٹ وک نے اس فقرے کا ترجمہ یہ کیا ہے: ...CAREFULLY REJECTING THE FOREIGN DIALECT OF THE YAVANS, TURNED INTO THE PURE LANGUAGE OF DELHI AND AGRA"

سوال یہ ہے کہ للولال جی کوی کی یہ "یامنی بھاشا" یا "جامنی بھاشا" یا "یمنوں یا ونوں کی غیر ملکی زبان" آخر کیا اور کون سی ہے جس کو ترک کرنے پر للولال جی کوی مجبور ہوئے یا اسے جبر و اکراہ کے ساتھ چھوڑ کر دلی آگرے کی کھڑی بولی اپنائی جس کا نام لینا اردو دنیا میں آگے چل کر وجہ نزاع بھی بنا۔

ایسٹ وک کی فرہنگ میں لفظ "یامنی" کے جو معنی دیتے ہیں اور جس کو اسی کے ترجمے

کے لفظوں میں للولال جی کوی نے محتاط انداز میں مسترد کیا ان کی تشریح کے لیے ماہرِ لسانیات ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی سے رجوع مفید رہے گا۔ پہلے پریم ساگر کی لغت کی یہ صراحتیں متعلقہ "یامنی" اور "یمن" ملاحظہ ہوں:

S यामनी YĀMANĪ (S यवन: यवन (THE COUNTRY OF THE YAVANS OR IONIANS) GRECIAN, BUT NOW APPLIED TO EUROPEONS AND MOHAMMADANS.— P.155

S. यमन YAMAN (S. यवन: यु TO MIX, OR जु TO BE SWIFT) M.A. YAVAN, WHICH NAME FORMALLY MEANT AN IONIAN OR GREEK, BUT IS NOW APPLIED TO BOTH THE MOHAMMADAN AND EUROPEAN INVADERS OF INDIA, AND IS OFTEN USED AS A GENERAL, TERM FOR ANY FOREIGN OR BARBARIAN RACE.—P. 154

لغوی اعتبار سے یہ لفظ اپنی اصل میں سنسکرت "یم" یا "جم" نیز "یم دوت" اور "یم راج" یعنی موت اور فرشتہ موت سے ہم رشتہ بلکہ مشتق بھی ہو سکتا ہے تو تاریخی لحاظ سے اس کی قدامت اور ہند پارینہ پر حملہ آور اقوام سے اس کی نسبت اعلانیہ واضح ہے۔ دوسری جانب خود مسلمانوں پر اس کا اطلاق تاریخی تسلسل کے علاوہ ملک یمن کے عربوں کے حوالے سے نیزان کو یمنی اور اردو کو غیر ملکیوں یا غیر ملکی یمنی زبان سے منسوب کرنا بھی قابل فہم معلوم ہوتا ہے۔ اس کی توجیہہ یہ ہے کہ مثلاً علاقہ تلنگانہ میں صدیوں سے مسلمانوں کو تیلگو میں "ترکولو" TURKOLLU یعنی ترک اور اردو یا دکنی کو "ترکا ماٹا" یعنی ترکوں کی زبان سے موسوم کیا جاتا رہا ہے چنانچہ وہاں گاؤں میں لوگ آپس میں مسلمانوں کے ذکر یا زبان کے حوالے کے لیے تلنگی میں ترکولو اور ترکا ماٹا کے الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ شمال میں قدیم حملہ آور اقوام کی تاریخی نسبت کے ہی تسلسل میں اور اس کے علاوہ بھی عرب و یمن سے تعلق کی بناء پر مسلمانوں کی یامنی اور اردو کو یامنی بھاشا کہا جاتا رہا ہو۔ گویا للولال جی کوی کے عہد تک موت کے دیوتاؤں یا جارحوں سے وابستہ پرانے تاریخی اور لغوی تصوّرات کے زیر اثر مسلمانوں کو "یامنی" اور "مسلمانی زبان" کو "یامنی بھاشا" کی تشریح "یامنی" کے منقولہ بالا معنی کا ہی مفہوم رکھتی ہے جب کہ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی کی تحقیق "انڈو آرین اینڈ ہندی" کے حوالے سے پروفیسر عزیز احمد نے اس تصور کی اصلیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔" اسٹڈیز ان اسلامک کلچر" کے باب

CULTURAL ORIENTATIONS کے جزو ۳ "لسانی تنازعہ" کے آغازِ کلام میں للولال جی کوی سے متعلقہ آیندہ منقولہ گفتگو کی بنیاد پر عزیز احمد کا مشاہدہ یہ رہا ہے جس کا انگریزی اقتباس ماہر لسانیات پروفیسر چیٹرجی کا ہی فرمودہ ہے: "جیسا کہ ہم نے دیکھا جدید ادبی ہندی کا جوار تقا بہ قول گریرسن للولال سے ۱۸۰۳ء میں شروع ہوا حالیہ اور متناقض رہا ہے۔ ادبی ہندی کا علاحدگی پسندانہ اور بہ مقابلۂ اردو منکرانہ مزاج ہندوؤں کے لیے بہت زیادہ متنازعہ نہیں تھا جو (اردو کو) رسمی طور پر غیر خالص اور غیر درست قرار دیتے تھے اور اس کو "جامنی" یا "یامنی" یا "ونی" کہتے تھے: (ص ۲۶۹ بہ حوالہ چیٹرجی ص ۱۸۸)

A LANGUAGE SUITABLE FOR YAVANS OR NON-HINDU BARBARIANS

للولال جی کوی کے مقدمے کے بیان کا وہ حصہ جو اس "یامنی بھاشا کو چھوڑ کر" دلی آگرے کی "کھڑی بولی" کو اختیار کرنے سے متعلق ہے۔ نہ صرف ایک بڑی بحث تحیص کی بنیاد رکھتا ہے بلکہ چند در چند غلط فہمیوں اور ہندی اردو نزاع سے بھی ہم رشتہ رہا ہے۔ راقم کے حقیر خیال میں للولال جی کوی کے "یامنی بھاشا" والے تصور کے باوجود اس تنازعے کی بنیادیں رکھنے سے ان کا سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور حق و انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ للولال جی کوی کو بری الذمہ کرنے کے لیے ان غلط فہمیوں پر سے جو اردو دنیا میں علمی و تحقیقی سطحوں تک بعد میں عام ہوئیں۔ پردہ اٹھایا جائے۔ ان نزاعات کے پردۂ زنگاری کے پیچھے موجود چند در چند شخصیات کو بے نقاب کرنا بھی ضروری ہے جن کی درپردہ حرکتوں کی بنا پر اردو و ہندی تنازعوں سے بالکل غیر مناسب اور غیر ارادی طور پر ملوث کر دیئے گئے اور ان کے بارے میں غلط فہمیاں خواہ مخواہ پھیلیں۔ یہ بحثیں للولال جی کوی کے ادبی مرتبہ و مقام کے باب میں اختصار و جامعیت سے سمٹ گئی ہیں۔

"پریم ساگر" اردو قالب لالہ سوامی دیال

"پریم ساگر" کے جس پہلے اور آخری اردو روپ کا علم ہوتا ہے وہ لالہ سوامی دیال کا تیار کیا ہوا ہے اور اگرچہ یہ قالب ترجمے سے ہی موسوم ہے اس کو للولال جی کوی کے "پریم ساگر" سے مترجمہ بہ مشکل ہی سمجھا جا سکتا ہے" قاموس الکتب" ج ۱ ص ۱۱۲۶ ع ۱۲۹۶ پر اس کا اندراج موجود ہے: "سری سوامی دیال۔ ترجمہ سری مدبھاگوت دسم اسکند موسومہ "پریم ساگر" ص ۶۹۸، نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۳ء" تاہم چند سطروں کے ہم راہ اولاً اس کا حوالہ جدید اردو ڈراما

کی ایک ممتاز شخصیت ابراہیم یوسف مرحوم اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے ہاں نظر نواز ہوا۔ دونوں اسکالروں نے اس اردو "پریم ساگر" کی کوئی تفصیل تو نہیں لکھی البتہ چند سطور حسب موقع اقتباس کیں۔ ازاں بعد مخدومی حضرت رام لعل نابھوی نے اپنے مفصل مکرمت نامہ میں اپنے یہاں طبع ہفتم ۱۸۹۵ء کی موجودگی سے بالتفصیل مطلع فرمایا، پھر بزرگ ممدوح اور کتب خانہ خدابخش کے جناب عطا خورشید نے لالہ سوامی دیال کے اس اردو قالب کے دو مختلف ایڈیشنوں سے چند ابتدائی و آخری عکسی اوراق مرحمت کیے جن کی نقول شریک ہٰذا ہیں۔

جیسا کہ ان اوراق سے پیوستہ عکسی صفحوں سے عیاں ہے نول کشور کے دونوں ایڈیشنوں پر لالہ سوامی دیال کو مترجم کتاب لکھا گیا ہے جب کہ اس کو اردو ترجمہ کے بجائے محض اردو روپ باور کرنے کی وجہ قابلِ غور ہے۔ یعنی یہ کہ اس کا صرف خطی پیکر اردو ہے اور رسمِ خط کی تبدیلی کے سوا للولال جی کوی کی اپنی قلمی کاوش میں کوئی متنی یا لفظی تبدیلی تک روا نہیں رکھی گئی ہے غالبًا ہوا یہ کہ یا تو اصل ہندی متن کے ساتھ مطبوعہ اردو قالب نول کشور والوں کو دریافت نہ ہوسکا یا پھر بہ وجوہ اس اردو روپ کی اپنے ہاں سے اشاعت انھوں نے مصلحت کے خلاف سمجھی ہوگی۔ غرض لالہ سوامی دیال سے "پریم ساگر" کو صرف اردو خط میں لکھوانے کا کام لیا گیا ورنہ واقعہ یہی ہے کہ ترجمے اور سرورق پر ظاہر کردہ نگاہ ثانی دونوں ہی کا کوئی عمل دخل نظر نہیں آتا ہے۔ دراصل لالہ سوامی دیال نے للولال جی کوی کا "پریم ساگر" اردو میں ترجمہ نہیں "حرف بہ حرف نقل ناگری بہ خط فارسی" کرنے کا کام سرانجام دیا اور غالبًا لالہ سوامی دیال کو ایسے کاموں میں مشاقی اور تجربہ دونوں حاصل تھے۔ یہ امر لالہ سوامی دیال کی ایک اور ایسی ہی کتاب کے اشتہار سے مترشح ہے، نول کشور والوں کا یہ اشتہار "پریم ساگر" کے نویں ایڈیشن جولائی ۱۹۱۰ء کے خاتمۃ الطبع والے صفحہ ۲۲۶ کے بعد کے ورق پر درج ہے۔ اس اشتہار کی منقولہ ذیل عبارت عرض کردہ نکتے کے تعلق سے لائق توجہ اور غور طلب ہے: "سنگیا سکھ دیولال، حرف بہ حرف نقل ناگری، بہ خط فارسی، زبان بھاکھا عام فہم، مرتبہ منشی سوامی دیال" انہی لالہ سوامی دیال سے ایک اور کتاب "تلسی کرت راماتن بسنتیک" بھی منسوب اور شایع شدہ ہے، ممکن ہے یہ بھی اسی نوعیت کی ہو۔

مرحوم ابراہیم یوسف صاحب کے مطابق ان کا زیرِ حوالہ لالہ سوامی دیال کے اردو "پریم ساگر" کا ایڈیشن ۱۹۰۱ء میں نول کشور کا طبعِ ہشتم ہے۔ بہ قول مرحوم "فاضل" میرے کتب خانہ میں جو نسخہ ہے اس کا رسم خط اردو مگر زبان برج بھاشا ہے" (ص۲۹ حاشیہ) جس سے انہوں نے دو اقتباسات ص۲۲ نیز ص۲۸ و ۲۹ پر ضرورتاً پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے نول کشور کے ہی ۱۹۳۰ء میں شائع کردہ للولال جی کوی للو کے "پریم ساگر" کے اردو ترجمے کا حوالہ مترجم کی صراحت کے بغیر اردو کتابیات میں دیا ہے جو غالباً لالہ سوامی دیال کے ہی اردو روپ کا ایڈیشن ہے۔ موصوفہ محترمہ نے دیباچے اور متن کی بھی چند سطور (ص۲۷ تا ۳۰) اقتباس کی ہیں اور وہ بھی شاہد ہیں کہ یہ کلمات ترجمہ نہیں بلکہ حرف بہ حرف نقل ناگری بہ خط فارسی ہی ہیں۔ نسخہ نابھوی مصوّر ہے مگر نسخہ خدا بخش بے تصویر ہے، ممکن ہے قبل و بعد کے ایڈیشنوں میں سے کچھ باتصویر ہوں اور چند سادہ۔

زیرِ استفادہ چاروں ایڈیشنوں کے اقتباسات کے للولال جی کوی کے اصل متن مرتبہ و مصححہ ایسٹ وِک کے ساتھ تقابل کے نتائج ملاحظہ ہوں تاکہ حتمی طور پر یہ طے پا سکے کہ لالہ سوامی دیال نے پریم ساگر کو اردو کا روپ جو دیا تو یہ کام کس حد تک ترجمے کے عمل سے متعلق تھا اور کس قدر "حرف بہ حرف نقلِ ناگری بہ خط فارسی" واقع ہوا تھا۔

اردو متون : نشان دہی اوراق : "پریم ساگر" للولال جی کوی : کیفیتِ مقابلۂ عبارات:

(۱) عکس نابھوی — فہرستِ ابواب — عنواناتِ ادھیائے — ایسٹ وِک کے مرتبہ متن میں ابواب کا کوئی عنوان نہیں ہے بلکہ نمبر شمار کا رومن ہندسوں اور ہندی الفاظ میں اندراج اس طور ہے: پرتھمو ادھیائے، دوتیو ادھیائے، ترتیو ادھیائے، چترتو ادھیائے، پنچمو ادھیائے وغیرہا۔ جیسا کہ عکسی فہرست سے ظاہر ہے ہر ادھیائے کا اردو "پریم ساگر" میں باقاعدہ عنوان قایم کیا گیا ہے مگر الفاظ اردو کے نہیں بلکہ للولال جی کوی کے "پریم ساگر" سے اخذ کیے ہیں۔

(۲) عکس نابھوی — آغازِ متن بہ صفحہ ۱ — مقدمہ للولال جی کوی — ہندی کلمات اور اردو عبارت میں الفاظ کا کوئی فرق نہیں ہے البتہ کتابت کی اغلاط سے بعض لفظوں کا حلیہ بگڑ گیا ہے اس اردو قالب میں کئی ہندی الفاظ کے متبادل اردو روپ تحریر کیے گئے ہیں مثلاً: برج بھاشا کی بجائے برج بھاکھا، آگیہ / آگیا، یامنی بھاشا / جامنی

بھاکھا سری یُت رسری جُت۔

(۳) عکس ناگری۔ اٹھ کتھا آرمبھ صلا پر تھم ادھیائے اردو اور ہندی عبارتوں میں کلمات کی ترتیب اور الفاظ کی ساخت میں سرے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔

(۴) عکس خدا بخش آخری ص۲۲۶ آخری صفحہ ناگری ان آخری سطور کے بھی متن کے الفاظ میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ البتہ خاتمے کے دو اشعار اردو میں محذوف ہیں۔

(۵) اقتباس عبیدہ بیگم ص۴۷۶ ۶۵واں ادھیائے کاشی پوری کے راجا کا نام پونڈرک مذکور ہوا ہے جو اصلاً پونڈرک ہے کتابت کی دیگر غلطیوں کے علاوہ کوئی لغوی تغیر موجود نہیں ہے۔ بیچ میں چند الفاظ چھوٹ گئے ہیں یا چھوڑ دیے گئے ہیں یعنی نقل یا کتابت میں۔

(۶) اقتباس ابراہیم یوسف ص۲۲ ۳۴واں ادھیائے لالہ سوامی دیال نے اس مقام پر کچھ لفظی تبدیلیاں کی ہیں جیسے "کچھ لینٹ" (ستر پوش ملبوس حیا) کی جگہ "نکھدم" اور "براتی ناری" کے بجائے "پرائی استریوں"۔

اس جائزے سے لالہ سوامی دیال کے ترجمے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ہندی متن کی اردو لپی میں منتقلی تک محدود تھا اور زیادہ صحیح الفاظ میں 'حرف بہ حرف نقل ناگری بہ خط فارسی' سے عبارت۔ چنانچہ صحیح تر ہوگا اگر اس کو ترجمے کے بجائے اردو قالب سمجھا جائے۔

اردو ڈرامہ کے مصنف و نقاد اور محقق ابراہیم یوسف نے چند نکات کی توضیح کے لیے اپنے مباحث میں "اسی اردو 'پریم ساگر'" سے استدلال کیا ہے۔ اپنی تحقیق کے باب "لوک ناٹک" اور "اندر سبھا امانت" میں راس لیلا کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مرحوم اسکالر نے چند سطریں ۳۴ ویں ادھیائے سے اخذ کی ہیں جو خود راس لیلا کے ہی بیان میں ہیں: "راس لیلا کا تعلق اگرچہ کرشن جیسی عظیم ہستی سے ہے مگر غلط فہمیوں کا بھی شکار ہے کہ یہ انسانی خواہشات کی نمایندگی کرتی ہے جیسا کہ راجا پریکشت پوچھتا ہے کہ "دین دیال یہ مجھے سمجھا کر کہو کہ کرشن تو اسھروں کو مار پرتھوی کا بھار اتارنے اور سادھ سنتوں کو سکھ دے دھرم کا پنتھ چلانے کے لیے اوتار لے آئے تھے انہوں نے پرائی استریوں کے ساتھ راس بلاس کیوں کیا یہ تو ایک نکھ دم کرم ہے جو پرائی استریوں سے

بھوگ کرے"۔ اسی طرح کی اور بہت سی غلط فہمیاں ہیں جو راس لیلا کے متعلق پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ سنسکرت میں تشبیہوں اور استعاروں کی زبان میں بات کرنے سے پیدا ہوتی ہے"۔ للولال جی کوی کے اصل متن کی رو سے اس کے جواب میں سکھ دیو جی نے یہ اشعار پڑھے اور شیو جی کے ایک اور موقعہ کی طرف اشارہ کیا' تاہم راوی نے سوال کے نفس مضمون یعنی راس لیلا کے پس منظر میں نفسانی خواہشات کو نظر انداز کر دیا:

سُن راجا یہ بھید نہ جانیو   مانُش سم پرمیشور مانیو
جن کے سُمِر پاتک جات   تیجونت پاوَں ہیں گات
جیسے اگنی مانجھ کچھ پرَے   سو اُو اگنی ہو یکے جرَے

راس لیلا کی اسی بحث کے تسلسل میں ابراہیم یوسف نے اردو "پریم ساگر" کے ایک اور بیان کو ایک اہم تاریخی اطلاع کے طور پر پیش کیا ہے' ان کا مشاہدہ یہ ہے: "یہاں ایک دل چسپ انکشاف جو "پریم ساگر" کے مصنف نے کیا ہے بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو راس لیلا کی ڈرامائی حیثیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے جب کرشن کی بانسری سن کر گوپیاں جمع ہوگئیں تو "سری کرشن نے اپنی مایا کو آگیا کی کہ ہم راس کریں گے اس کے لیے تو اچھا استھان رچ اور یہاں کھڑی رہ جو جو جس بست کی آگیا کرے سو سو دیجو۔ تب اس نے سنتے ہی جمنا تیر جانے ایک کنچن کا منڈلا کار چوترا بناتے موتی ہیرے جڑا اس کے چاروں اور ریلوست کیلے لگائے۔ تن میں پند نوار بھانت بھانت کے پھولوں کو لا باندھا' سری کرشن سے کہا دے سنتے ہی پرسن ہو اسب برج ناریوں کو ساتھ لے جمنا تیر کو چلے۔ وہاں دیکھیں تو چندر منڈل کے چوترے کی چمک چوگنی سو بھا دے رہی ہے' اس کے چاروں اور ریتی چاندنی سی پھیل رہی ہے۔ پون سگندھت ملیٹھی ملیٹھی چل رہی ہے اور ایک سگھن میں کی ہریالی اجیالی رات میں ادھک چھب لے رہی ہے"۔ اس طرح اسٹیج بنایا جانا نہ صرف اسٹیج اور ڈرامے سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے اہمیت رکھتا ہے بلکہ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ راس لیلا کھیلنے کے لیے "منڈلاکار" اسٹیج اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ یہ کرشن کے حکم پر تعمیر کیا گیا تھا۔ (ص ۲۸/۲۹)۔

ڈاکٹر عابدہ بیگم نے "پریم ساگر کی زبان کا نمونہ" اقتباس کرنے کے لیے جو متن استعمال کیا ہے منقول ہے: "سری سکھ دیو جی بولے کہ مہاراج کاشی پوری میں ایک پونڈرک نام مہابلی اور پرتاپی تھا۔ اس نے بشن کا بھیش کیا اور چھل بل کر سب کا من ہر لیا۔ سدان پیت بس بیجنتی مال، مکٹ مال، بن مال پہنے رہے۔ سنکھ چکر گدا پدم لیے دو ہاتھ کاٹھ کے کیے ایک گھوڑے پر کاٹھ ہی کا گرڈ دھرے چڑھا پھرے۔ وہ باسو دیو پونڈرک کہاوے اور سب سے آپ کو پوجا وے۔ جو راجا اس کی آگیا مانے اس پر چڑھ جا اور مار دھاڑ کر اپنے بس میں رکھے" (ص۲۷۶۔۲۷۷) یہ سطور للولال جی کوی کے "پریم ساگر" کے ۶۵ ویں ادھیائے کے اردو روپ کا حصہ ہیں اور یا تو اردو پریم ساگر میں یا اس سے ماخوذ اقتباس میں کتابت کی غلطی سے کاشی پوری کے اس راجا کا نام "پونڈرک" سے "پونڈرک" میں بدل گیا ہے اور کہانی کی ابتدا میں پونڈرک کے نام کے ساتھ لفظ راجا بھی حذف ہو گیا ہے جس سے اس کی شخصیت غیر واضح ہو کر رہ گئی ہے۔

مقدمۂ مترجم فریڈرک پنکاٹ

پنکاٹ نے ایسٹ وک کے کوئی پچاس سال بعد نئی ضرورت کے طور پر لیکن زیادہ تر ایسٹ وک کے ترجمے سے عدم اتفاق کے سبب سے اور ایسٹ وک کے ہی مرتبہ اصل متن کی بنیاد پر للولال جی کوی کے پریم ساگر کو انگریزی قالب دیا۔ یہ ترجمہ جامعہ بمبئی میں موجود ہے جس کے یونیورسٹی لائبریرین گرامی قدر پروفیسر اے سی ٹکیکر صاحب کے عنایت کیے ہوئے عکسی تحایف میں پنکاٹ کا مقدمہ مترجم شریک ہے جو چھ صفحوں پر ہے۔ پنکاٹ نے ایڈورڈ بی ایسٹ وک کے طرز ترجمہ اور انتخاب لغات وغیرہ کے تئیں اختلافات پر لکھا ہے اور للولال جی کوی کے کارنامے کی تحسین کے علاوہ اس کی عام مقبولیت و افادیت پر اہم اشارے کیے ہیں۔ پنکاٹ کے اظہارات سے ہندی کے علاقے سے لے کر دونوں انگریزی تراجم کے تقابل تک کئی نکات روشن ہوتے ہیں اس لیے اس کے خیالات سے اکتساب ناگزیر ہے چنانچہ اس مقدمے سے اہم اجزا منتقل کیے جا رہے ہیں۔ اس عالم ہندیات کے بارے میں شخصی کوایف عام نہیں ہیں۔ من جملہ اس کی مطبوعات کے کھڑی بولی پدیہ کا

ایک مجموعہ بھی ہے جس کے مقدمے "بھومیکا" میں اس کے سرگرم بیانات اردو والوں کو نالاں کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہی کیفیت زیرِ ترجمانی تاثرات میں سے اور چند ایک کی بھی ہے۔

فریڈرک پنکاٹ اپنے مقدمہ مترجم کو ہندی کے جغرافیے کی وسعت سے شروع کرتا ہے اور اس کو "ہندی یا بھاشا" کہتے ہوتے اس کا ہندوستان گیر لسانی طول و عرض متعین کرتا ہے۔ اس کی نظر میں ہندی وسیع علاقوں میں پھیلی ہوئی زبانوں بنگالی و پنجابی نیز گجراتی و مراٹھی اور زیادہ جنوب کی تامل و تیلگو ہر اپنے بولنے والوں کی تعداد عددی کثرت کی بناء پر بھاری تھی۔ اس کے بہ قول ہندوستان کی یہ اہم ترین زبان راج محل کے مشرقی سلسلۂ کوہ سے لے کر مغرب میں سندھ تک نیز اوپر کشمیر سے لے کر جنوب میں نظام کی ریاست تک مختلف شکلوں میں پھیلی ہوئی زبان تھی جس کے بولنے والے آٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ تھے جو فرانس و جرمنی کی مشترکہ آبادی کے برابر تھے بہ طور مادری زبان ہندی یا بھاشا کا جو لسانی حدود اربعہ پنکاٹ نے طے کیا ہے اس کے حکم لگانے کے انداز سے یہ خیال آتا ہے گویا وہ آج لندن میں بیٹھا ہوا ہندی کے لسانی جغرافیے کا فیصلہ کر رہا ہو۔ اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ اس کا فرمودہ قریب ایک سو سال قبل تو در کنار آج بھی بعینہٖ درست نہیں ہے کیوں کہ اس نے اس وقت کی ہی تسلیم شدہ کتنی بڑی زبانوں مثلاً سندھی اور راجستھانی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ادھر جن زبانوں کا مقام یا درجہ اس وقت واضح نہیں تھا آج ان کی لسانی اور ادبی دونوں حیثیات مسلمہ بھی ہیں مستحکم بھی، مثلاً بھوج پوری نیز ہریانی اور بہار کی میتھلی الغرض پنکاٹ نے متنوع اور مختلف سی بولیوں پر مشتمل ہندی یا بھاشا کو دو بڑی شاخوں یا انواع میں منقسم بتایا ہے "مشرقی ہندی یا مغربی ہندی۔

مغربی ہندی کو فریڈرک پنکاٹ اپنے معاشی و سماجی اثرات اور سیاسی رسوخ کے پہلو بہ پہلو قدیمی اور روز افزوں ادبی شمول کی بناء پر اہم تر گردانتا ہے نیز للولال جی کوی کو اس کے ادب کا ایک جدید موسس"؛ اسی مغربی جدید ادب کے بانیوں میں سے ایک للولال کوی تھے جو کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سب سے مشہور ایک تو برج کی " راج نیتی" تھی اور دوسری "پریم ساگر" جو کلاسیکی ہندی میں تحریر ہوئی۔

ثانی الذکر کو ہمیشہ ہی طلبائے ہندی کی اوّلین کتاب قرار دیا گیا ہے اور طویل عرصے تک اس کو ایسی بنیادی قدر کی کتاب کا رتبہ ملا رہے گا جو شمالی ہند میں مقیم ہر یوروپی کے لیے نا گزیر، ہر ایک عیسائی مبلغ کے لیے بھی پریم ساگر سے بھرپور واقفیت بالکلیہ لازمی ہے۔ اس لیے کہ یہ اس شخصیت کی سوانح ہے جس سے ہندوستان بھر کے عوام کو شدید گہری دل بستگی ہے۔ رام او کرشن ہندوستان گیر پیمانے پر عبادت کے محور ہیں جن کی روحانی سرگزشت تلسی داس کی "راماین" اور داستانِ حیات "بھگوت گیتا" میں محفوظ ہے۔ اسی دوسری سوانح کو للولال نے اپنے ہم وطنوں کے لیے اس عظیم زبان کی تصنیف پریم ساگر" میں پیش کیا۔ سری کرشنا کی تعظیم و تکریم کے مدنظر یہ عیاں ہے کہ مبلغوں اور اساتذہ اور دوسروں کے لیے بھی جن کا عوام سے میل جول ہو نیز ہندوستان کی عظیم زبان کی تحصیل کی خاطر" للولال کی "پریم ساگر" سے بہتر کوئی اور کتاب ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ یورپ والوں کے ہاں بھی اس کتاب کا اہم استعمال تھا اور یہ ضرور ہی اس مقام پر فائز رہے گی (۵تا۱۰)۔

"پریم ساگر" کے ابتدائی چند ایڈیشنوں کے ذکر کے بعد پنکاٹ نے کپتان ولیم ہولنگس کے ترجمے پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کے بہ قول ہولنگس جو ۳۴ویں رجمنٹ بنگال نیٹو انفنٹری میں تھا اپنی پیشہ ورانہ مشغولیات کے باعث ترجمے کے کام پر صحیح طرح سے توجہ نہیں دے سکا اور نتیجتاً اس کا کام طلبائے ہندی یعنی گوروں کے لیے کارآمد نہ ہو سکا۔ تاہم پنکاٹ نے یہ کہہ کر اس کے کام کی توصیف بھی کی کہ وہ اوریجنل اور قابلِ قدر ہے۔ اس لیے کہ ہولنگس نے ہندوستانیوں سے قریبی تعلقات سے حاصل ہونے والی لسانی معلومات اور عقایدی کیفیتوں کا فایدہ اٹھایا جس کے فیض سے کتاب کے لغات و محاورات کے معنوں کا اس پر بہ خوبی ابلاغ ہو سکا۔ کپتان ہولنگس کا یہ ترجمہ کسی ابتدائی ایڈیشن پر مبنی تھا۔ اس کے مقدمے سے صرف اتنا تاثر ایک ثانوی ذریعے سے حاصل ہو سکا ہے کہ "پریم ساگر" کی ہندی اَلیکھنیہ روپ سے شدہ ہے۔" جو آگرا کالج کے ڈاکٹر ستندر نے ۱۸ویں اور ۱۹ویں شتابدی میں ہندی نامی مقالے میں "پریم ساگر" کے تراجم کے احوال میں اقتباس کیا ہے" (ساپتاہک ہندوستان" دہلی مورخہ ۱۱۔۵۔۱۹۵۸ء ص ۱۸)۔

ایڈورڈ ایسٹ وک کے ترجمہ" پریم ساگر" پر فریڈرک پنکاٹ کا انتقاد معترفانہ بھی

ہے معترضانہ بھی۔ اس کے زمانے تک یہی نصاب میں رائج تھا مگر نادر اور بہ مشکل دستیاب کیوں کہ برسوں سے غیر مطبوعہ تھا اور اسی لیے اس کے نسخے گراں تھے۔ پنکاٹ کے نزدیک یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ "پریم ساگر" کا ایک ترجمہ اور گویا عام طور پر مطلوب تھا ہر چند کہ اس کو اپنے منصوبے کے لیے نہ تو عذر کی ضرورت تھی اور نہ ہی اس عذر خواہانہ انداز کی اس لیے کہ ایسٹ وِک کے مترجمہ متن پر اس کی اختلافی رائے ہی ترجمے کی راہ ہموار کرنے کے لیے کافی تھی۔ کم از کم دو صفحوں پر اس نے ترجمہ ایسٹ وِک پر تنقید کی ہے اور ایک سے زیادہ صفحوں میں اپنے طریقۂ کار یا طرز ترجمہ کی تشریح کی ہے۔ آخر میں اس نے ایسٹ وِک کے مرتبہ "پریم ساگر" کی متنی اور طباعتی اغلاط کو بھی نشان زد کر دیا ہے جس کو پنکاٹ نے خود اپنے ترجمے کی بنیاد بنایا کیوں کہ وہ عرصے سے معیاری ایڈیشن بھی تھا اور بہ آسانی ہم دست بھی۔

ان کیفیات کی تفصیلوں سے صرف نظر فریڈرک پنکاٹ نے للولال جی کوی کے زیر ترجمہ "پریم ساگر" کی خصوصیات کے حوالے سے اپنے محبوب موضوع کو جس طرح چھیڑا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے ان ہی ملاحظات کے دوران بہ صفحہ ۷ اس نے افسوس کیا ہے کہ "ہندوستان کی بد قسمتی کہ ہندی ویسی حوصلہ افزائی نہ پا سکی جیسا کہ اس کی اہمیت کا استحقاق تھا، چنان چہ صرف بیوپاری نیز اساتذہ اور مبلغین ہی اپنی اپنی ضروریات سے مجبور ہو کر اس کے مطالعے پر متوجہ ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بہ قول اس کے اس متموّل نیز ادا ے سلب پر قادر اور کار آمد زبان کی تحصیل کے خواہاں (انگریزی اور یوروپی مراد ہیں) صرف اپنے ہی ذرائع پر زیادہ تر انحصار پر مجبور ہوتے ہیں۔ اسی صورتِ حالات کے پیشِ نگہ اس نے پروفیسر ایسٹ وِک کے (مرتبہ ہندی) متن سے اپنا ترجمہ تیار کیا۔ پنکاٹ کے اپنے لفظوں میں اس ترجمے کو مبتدیوں کی سطح تک لے آیا گیا ہے جو کسی گرامر سے زبان سیکھے ہوتے ہوں اور کسی استاد کی مدد کے بغیر پریم ساگر کو نصابی کتاب کے طور پر ہندی کی خواندگی نیز ترجمہ سازی اور تحصیل کے لیے پہلی پہلی کوشش کر رہے ہوں" (صک)۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ "اس ترجمے کو استعمال کرنے والوں کے لازماً ذہن نشیں رہنا چاہیئے کہ اس کا مقصد وحید ہر کلمے کے صحیح صحیح قالب اور بنیادی تفہیم کے ذریعے زبان سکھانا ہے کیوں کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے

کہ ہندوستان میں رہنے والے یوروپینوں کو یہ سبھی کچھ (اس کے وسیلے سے) جاننا ہی چاہیے" (ص ۹ و ۸)۔

سوئے اتفاق کہ دونوں انگریز افاضل کے تراجم سے فیض یابی ممکن نہ ہو سکی ہے اس لیے نہیں عرض کیا جا سکتا کہ تقابلی زاویے سے کیا صورت رہی ہے۔ ممکن ہے فریڈرک پنکاٹ کے دعویٰ میں وزن ہو اور اس نے مطلوبہ ضرورتوں اور تقاضوں کا ایسٹ وِک سے زیادہ لحاظ رکھا ہو۔ البتہ جہاں تک للولال جی کوی کی اپنی خدمات کی قدر دانی اور تحسین کے عملی پہلو کا تعلق ہے ایسٹ وِک کا عطیہ بدرجہا جاندار ہے کیوں کہ اس نے تنہا پریم ساگر کی متنی تصحیح اور ترجمہ سازی دونوں کاموں میں بڑی جاں کاہی کی — پنکاٹ کا مقصود اوّل و آخر ہندی کا بول بالا کرنا تھا اور اسی ذیل میں اس نے "پریم ساگر" پر بھی کام کیا۔ ایسٹ وِک کا کام للولال جی کوی کی اپنی ادبی سوانح میں براہ راست افادیت کا حامل ہے اور دوگونہ ہونے کی بنا پر کہیں زیادہ متنوع اور وزن دار محسوس ہوتا ہے۔

"پریم ساگر" شاردا دیوی کے مباحث

ڈاکٹر شاردا دیوی ودیالنکار کی قابلِ قدر محققانہ تصنیف سے متعدد عکسی صفحوں کا عطیہ محترمی پروفیسر اے سی ٹکیکر صاحب قبلہ کی کرم فرمائی سے عین اس وقت باصرہ نواز ہوا جب مبیضہ ہٰذا مکمل ہو چکا تھا۔ مصنفہ ممدوحہ نے للولال جی کوی کے کارنامے پر اپنی کتب کے خاص حوالے سے فرداً فرداً بحث و نظر کے لیے کئی اوراق وقف کیے ہیں۔ خصوصیت سے "پریم ساگر" پران کا مفصل جائزہ متنوع مباحث کا مجموعہ ہے جس کا افادہ یک جا ہی منتقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جب کہ دیگر گفتگوؤں سے متعلقہ مقامات پر اکتساب کیا گیا ہے۔ حسنِ اتفاق کہ گزشتہ چند عنوانوں میں پیش کردہ بحثوں اور معروضات میں سے کسی ایک سے ڈاکٹر شاردا دیوی کے فاضلانہ تجزیات ہم رشتہ ہیں اور یوں "پریم ساگر" کے پرتنوع موضوعات پران کی تحقیقی و ناقدانہ آرا سے روشنی پڑتی ہے۔ شاردا دیوی صاحبہ موصوفہ کے اظہارات کی ملخص ترجمانی ملاحظہ ہو (ص ۲۱۲ تا ۲۰۷) جس کے ساتھ چند اور مناسب موقع مشاہدات بھی اضافہ کیے جا رہے ہیں۔

"پریم ساگر" کے ابتدائے ۱۸۰۵ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے مطبوعہ ۱۵ باب اور ۱۷۶ صفحوں کے مختصر ایڈیشن اور مکمل طبع اوّل ۱۸۱۰ء کا اپنے مخصوص انداز میں تقابل کرتے ہوتے ڈاکٹر شاردا دیوی نے کچھ الفاظ کا اور ۱۸۲۵ء کے ولیم پرایس کے مرتبہ ایڈیشن سے کسی لغات میں مستعمل خطی اشارات کا جایزہ تدبھو لفظوں کی جگہ تت سم روپوں کی مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ انداز نظر "ہندی نثری ادب کا ارتقا: ۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۶ء" کے زیرِ بحث اجزا کی لغوی تجزیہ کاری کا تسلسل ہے اور یہاں اس سے للولال جی کوی کے اپنے تحریرا اور شایع کردہ متن کی ایڈیٹنگ کے رجحان کا اشارہ ملتا ہے۔ بہ قول موصوفہ ۱۸۳۱ء کے طبعِ سوم کے بعد ۱۸۴۲ء میں پنڈت یوگ دھیان مسرا نے حکومت ہند کی سرپرستی میں نیا ایڈیشن محتاط نظرثانی کے ساتھ شایع کیا جس کے بعد ایسٹ وِک کا ترجمہ اور پھر ودجر تن داس کا مرتبہ ایڈیشن آیا۔

ورجبر تن داس سے تصحیح واصلاح یافتہ متن پر ڈاکٹر شاردا دیوی کا مشاہدہ یہ ہے کہ مکمل طبع اوّل سے یہ ذرا بھی مختلف نہیں ہے سوائے اوقاف (کے اضافوں) کے۔ یہ رائے پریم ساگر کے اس فاضل کے ادعا اور قلمی ریاض کی تصدیق کرتی ہے جو ورجبرتن داس نے کچھ درمیانی ایڈیشنوں سے سامنے آنے والی متنی مشکلات بلکہ شکایتوں کی بنا پر کیا۔ اپنے ابتدایے موسومہ "وکتویہ" میں چند گزشتہ ایڈیشنوں میں کی گئی لفظی تبدیلیوں اور ان سے پیدا شدہ شکایات اور دقتوں کا ذکر کرکے ورجبرتن داس نے ان تحریفوں کو سخت نشانۂ تنقید بنایا اور ان متون کی مختلف کیفیتوں کی جانب اشارہ کیا۔ اس صورتِ حال کا زیادہ صحیح تصور ان کے اصل الفاظ سے ہی کیا جا سکے گا۔ چناں چہ ورجبرتن داس کا بیان ملاحظہ ہو۔

"وکتویہ: ہندی گدیہ ساہتیہ میں پریم ساگر ایک پرسدھ گرنتھ ہے اور اب تک انیک سنسکرن چھپ بھی چکے ہیں۔ شکشا وِشیشک سنگرہوں میں بہودھا اس کا کچھ نہ کچھ انش اُدھرت کیا جاتا ہے۔ اس پرکار شِکشت سماج میں اس کا بہت پرچار ہے۔ پرنتو ادھر اس کے جتنے سنسکرن نکلے ہیں وے سبھی سنسکرت وِگیہ ودوانوں دوارا شدھ کر دے گئے ہیں، پر وے للولال جی کوی کے پریم ساگر سے کتنے بھن ہیں یہ اس سنسکرن سے ملان کرنے پر معلوم ہو سکتا ہے۔ انہوں نے (یعنی للولال جی کوی نے)

سنسکرت کے شبدوں کو جو روپ دیا تھا ان کا ان نئے سنسکرنوں میں سنسکرت روپ ہی دیا گیا ہے، جس سے اس سمے کی شبد رچنا کا ٹھیک گیان نہیں ہو سکتا۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے پریم ساگر کی وہ پرتی پراپت کی گئی جسے سویم للوجی لال نے اپنے منترالیہ سنسکرت پریس میں ۱۸۱۰ء میں پرکاشت کیا تھا۔ یہ پرتی کلکتے کی امپیریل لائبریری سے پراپت ہوئی تھی۔ دوسری پرتی جو ۱۸۴۲ عیسوی میں پرکاشت ہوئی تھی وہ کلکتے کے بورڈ آف ایگزامنیشنس کے پستکالیہ سے ملی ہے۔ اس پر لکھا ہے شری یوگ دھیان مشرین پرشکرتیہ یتھامتی سمنکیتن لال کرتن پریم ساگر پستکم" پہلی پرتی کے ٹائیٹل پر شٹ پر "ہندوی" تھا، پرنتو وہ دوسری پرتی کے ٹائیٹل پرشٹ پر پرشکرت ہونے سے ہندی ہو گیا ہے۔ سمپادک نے یتھامتی اس پرتی میں بہت سا سنشودھن کر دیا ہے۔"

ورجرتن داس کا بیان مظہر ہے کہ جب للولال جی کوی کے اپنے طبع کردہ متن میں پچیس تیس برسوں میں اتنی قلمی دست برد دیدہ و دانستہ ہو چکی تھی تو اس کو صحیح و اصل صورت بخشنے کی خاطر جو جان بوجھ کر بگاڑ دی گئی تھی ورجرتن داس کو اطلاع کا بیڑا اٹھانے پر کتنی مشقت کرنی پڑی ہوگی۔ ان کی اس محنت شاقہ کی توثیق شاردا دیوی ودیا لنکار نے یہ کہہ کر کر دی کہ ورجرتن داس کا مصححہ ایڈیشن للولال جی کوی کے اپنے طبع اوّل سے سرِ مُو بھی اختلاف نہیں رکھتا ہے۔ اسی مقام پر ڈاکٹر شاردا دیوی نے لکھا ہے للولال جی کوی کے مس روپ میں سدا سکھ لال اور رام پرشاد نرنجنی بھی سوانح کرشن تحریر کر چکے ہیں جس سے ہندی کتب مراد ہیں۔

ڈاکٹر شاردا دیوی کا انکشاف (بہ صفحہ ۴۳) ہے کہ گل کرسٹ نے ہندی اور ہندوستانی کو ناگری خط میں مطالعے کے لیے روشناس کرانے کی غرض سے جو مطبوعات خود تحریر یا تالیف کیں ان میں سے "ہندی اسٹوری ٹیلر" (۱۸۰۲ء) میں کھڑی بولی ہندی کو استعمال کیا نیز یہ کہ ۱۸۰۱ء میں طلبا کے لیے ہندی اور ہندوستانی کی شایع شدہ مشقوں میں بھی اسی کو برتا۔ محقق موصوف نے انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ "ایکسر سائیزز کالج آف فورٹ ولیم ۱۸۰۲ء" میں موجود سال ۱۸۰۱ء کی مشقوں سے ناگری تحریر کی دو مشقیں بہ مع ترجمہ پیش کر کے ان پر لسانی و لغوی نقاط نظر سے تبصرہ کیا ہے۔ "ہندی اسٹوری ٹیلر" سے بھی ایک ہی قصّے کے ناگری وار دو متون بہ غرض جایزہ اقتباس کیے ہیں، نیز

گل کرسٹ کی ہی "اورینٹل لنگوسٹ" (۱۸۰۲ء) سے اس کے خیالات پیش کیے ہیں اور اپنے زاویۂ نگہ سے حکایات کے نمونوں کو برج اور اردو کے علاوہ خاص کر گل کرسٹ کی "ہندوستانی" سے موسومہ زبان کو کھڑی بولی ہندی کا مثالی نمونہ قرار دیا ہے۔ یہ قول ان کے موخر الذکر کو گل کرسٹ ہندی کا نام نہیں دے سکا ہے کہ اس کو یہ ادراک نہ تھا۔

اسی طرح ڈاکٹر شاردادیوی کا اصرار یہ ہے کہ ہر چند کہ کھڑی بولی ہندی کالج میں شروع سے ہی مستعمل رہی اس کو قدرے بعد گل کرسٹ نے "ہندی اسٹوری ٹیلر" (۱۸۰۳ء) للولال جی کوی نے "پریم ساگر" کے مقدمے (۱۸۰۳ء) نیز سدل مسرا نے "چندراوتی" یا "ناسکیت اوبکھیان" (۱۸۰۵) میں تسلیم کیا۔ تاہم تینوں مصنفوں کی کھڑی بولی سے مراد مختلف تھی چنانچہ للولال جی کوی نے "دلی آگرے کی کھڑی بولی" سدل مسرا نے "کھڑی بولی" اور گل کرسٹ نے یہ الفاظ خود

"KHUREE BOLEE OR THE PURE HINDUWEE STYLE OF THE HINDOOSTANEE

کو اپنا وسیلۂ اظہار قرار دیا۔ ان قدرے اختلافی سے ناموں کے قطعِ نظر شاردادیوی دو یا لنکار اس زبان کو واحد ادبی زبان کہتی ہیں یعنی ڈاکٹر صاحبہ موصوفہ کے یہ قول

THE MOST PREVALENT FORM OF HINDI AS "KHARI BOLI" AND THE ONLY FORM OF PROSE LITERARY LANGUAGE"

للولال جی کوی کی "پریم ساگر" کے ہی حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری کے مذکورہ نظریے کی (کہ کھڑی بولی للولال جی کوی کی لہ بجادبندہ قسم کی زبان نہیں تھی اور زبان کا یہ نام پہلے سے ہی معروف و مقبول رہا ہے جس کو للولال جی کوی نے بھی برتا) تائید ڈاکٹر شاردادیوی کے علاوہ گراہم بیلی کے بھی ایک بیان سے ہوتی ہے جو موصوف نے گل کرسٹ کی طرف سے کھڑی بولی ہندی کی عدم تعیین یا کم از کم ناواقفیت ثابت کرنے کے لیے اقتباس کیا ہے۔ بیلی نے بی ایس او اے ایس کے ایک مقالے

لے ٹی گراہم بیلی : جریدہ مدرسۂ مطالعات شرقیہ و افریقہ جامعہ لندن ج ۸ (۱۹۳۵/۱۹۳۷)، نیز بیلی کی کتاب "اسٹڈیز اِن نارتھ انڈین لینگویجز"، لندن ۱۹۳۸ بہ حوالہ شاردادیوی ص ۴۸

میں اپنی اس "تازہ دریافت" کا ذکر کیا ہے کہ گل کرسٹ نے ۱۸۰۳ء میں یہ اصطلاح چار بار استعمال کی جب کہ سدل مسرا اور للولال جی کوی نے صرف ایک ہی مرتبہ جس سے اولیت کے شرف میں اس کا حصہ بلکہ "تفوق" ظاہر ہے۔ بیلی لکھتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ ظاہر ہے کیوں کہ گل کرسٹ نے نہ صرف یہ نام للولال جی کوی اور سدل مسرا سے سنا بلکہ روزمرہ کے تبادلۂ خیالات میں اس کے صحیح معنوں کو انگیز کرنے کے وافر مواقع اس کو حاصل تھے۔ تاہم ڈاکٹر شاردا دیوی نے گل کرسٹ کی اور کتابوں سے متون اور بیانات جمع کر کے اپنے اس ادّعا کی تائید میں طویل بحث کی ہے کہ گل کرسٹ زبانوں کے ایک دوسرے سے مختلف نمونوں میں کھڑی بولی ہندی کی شناخت ونشان دہی میں ناکام رہا۔

کھڑی بولی کی اصطلاح کے سدل مسرا اور للولال جی کوی کے ہاں ۱۸۰۳ء میں اوّلین استعمال کے باوجود شاردا دیوی صاحبہ نے بہ صفحہ ۶۵ واضح کیا ہے کہ "پریم ساگر" میں اپنے اسلوب کی ان الفاظ میں کہ "یامنی بھاشا چھوڑ دلی آگرے کی کھڑی بولی میں کہہ نام "پریم ساگر" دھرا" تشریح کے علاوہ للولال جی کوی نے کوئی اور صراحت (کھڑی بولی کے نام کی) نہیں کی۔ فاضل مصنف نے لگی لپٹی رکھے بغیر "یامنی بھاشا" کا ترجمہ صاف سیدھے انداز میں "فارین لینگویج آف دی محمدنز" کر دیا ہے اور اس میں شاید ہی کسی تکلف یا تامّل کی حاجت تھی۔ "پریم ساگر" سے اقتباسات مع ترجمہ سطور درج کرتے ہوئے جنہیں ڈاکٹر شاردا دیوی کھڑی بولی ہندی کے (فورٹ ولیم کے) اوّلین نمونے قرار دیتی ہیں۔ انہوں نے للولال جی کوی کے اسلوب پر اپنی رائے بہ مع تجزیہ تحریر کی ہے۔ اسی تسلسل میں انہوں نے گریرسن کی طرف سے للولال جی کوی کے ہندی زبان کو ایجاد Invent کرنے کے تصوّر کی تردید میں بھی مدلّل گفتگو کی ہے۔

"پریم ساگر" کے اسلوب پر تبصرے میں صہ ۶۷/۶۸ پر "ہندی نثری ادب کا ارتقاء" کی فاضل مورخ نے آگرہ کے توطن کے حوالے سے للولال جی کوی کے برج اثرات کو قبول اور شاملِ تحریر کرنے کی طرف بالاصرار اشارہ کیا ہے۔ شاردا دیوی ودیالنکار کا تاثر یہ ہے کہ اسی کے لازمی نتیجے کے طور پر برج اور راودھی کی تتسم نیز تدبھو اور دیسج لغات کا اس کتاب میں اثر آفریں امتزاج ملتا ہے۔ چوں کہ یہ ہندی کھڑی بولی کے ادبی

استعمال کی للولال جی کوی کی گویا افتتاحی کاوش تھی اس میں الفاظ کی کارک اور کریا پد صورتیں غیر متعین ہیں جن کے برتنے میں پابندی یا باقاعدگی نہیں ہے۔ اس کی مثالوں میں الفاظ کی یہ شکلیں شامل ہیں: بلا اور بلائے' بلاکر اور بلاکے' پرکھتی اور پرتھوی۔" تدبھو الفاظ کے نمونے یوں ہیں: پرسنتا بھئی' پیاسے بھئے' ہمارے آئے سے' تمہارے گئے سے' مایا نومت رسائے' کھلائے پلائے' وردادیوی کو مناتے۔ بہ قول صاحبہ موصوفہ یہ الفاظ روزمرہ کا جزو تھے اور مقبول و عام فہم بھی کیوں کہ للولال جی کوی کی نگارش کا مقصود نصاب سازی تھا۔ اگرچہ للولال جی کوی نے طے کر لیا تھا کہ کوئی بدیسی لفظ نہیں لائیں گے' وہ بہ قول ڈاکٹر شارداد یوی پوری طرح ان کا تدارک نہ کر سکے چنانچہ "پریم ساگر" کا پہلا ہی کلمہ اردو سنٹیکس میں ہے: "ایک سمے واسدیو کرت شریمت بھاگوت کے دسم اسکندھ کی کتھا کو چتربھوج مسرا نے دوہے چوپائی میں برج بھاشا کیا۔" رسم الخط کی پیشگی شرط کے قطع نظر یہ ظاہر ہے کہ ایسی ساخت اور بندش کے سبھی جملوں کو اردو کہا جائے گا جب کہ اردو والے رسم خط کے علاوہ الفاظ کی بھی وجہ سے ان کلمات کو ہندی سمجھیں گے۔

عجیب سی بات ہے کہ ڈاکٹر شارداد یوی ودیالنکار کی کھڑی بولی ہندی کے زاویہ نگہ سے "پریم ساگر" کو دی ہوئی غیر معمولی اور قرار واقعی اہمیت کے بالکل برعکس ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے اپنی دوسری تصنیف "آدھونک ہندی ساہتیہ" کے ص ۳۸ و ۳۹ پر للولال جی کوی کی مطبوعات کی فہرست سازی کرتے ہوئے "پریم ساگر" کو تراجم میں درج کر کے صرف اتنا کہتے ہیں کہ یہ "چتربھوج مسر کی پدیاتمک برج بھاشا رچنا پر آدھارت ہے۔ ان کی کوی رچنا مولک (تصنیف شدہ) نہیں ہے کنتو کھڑی بولی یا برج بھاشا گدیہ کی درشٹی سے ان کا مہتو ہے"۔ اس فہرست کے عین قبل للولال جی کوی اور معاصرین کی تقریریوں کے بیان میں بھی اتنا سا تاثر ملتا ہے کہ "کھڑی بولی گدیہ میں رچنا کی درشٹی سے للولال اور سدل مسرا کے نام ہی اُلیکھنیہ ہیں"۔ پروفیسر وارشنے کتاب کے باب متعلقہ نثر میں راجا شیو پرشاد کے اسلوب پر "للولال جی کو" کو اس طور نشان زد کرتے ہیں: "ان پستکوں کی بھاشا" کے ہووے"، "ہوو نے"، "سیوتے"، "آتے جاتا ہے"، "بھگوت" "آوتے"، "بتاے"، "بھتے ہیں"، "سو" آدی پریوگوں میں برج بھاشا کا پربھاو یا للولال ان

ملتا ہے" (ص۱۰۲)۔ ہندی نثر کے ارتقا میں للولال جی کوی کے کردار پر ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کے ملاحظات آگے اقتباس کیے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر شاردا دیوی ودیالنکار نے آخر میں ہند شناس مغربی علماء کے اس خیال سے تعرض کیا ہے کہ للولال جی کوی نے ہی سب سے پہلے ہندی کا کھڑی بولی روپ "پریم ساگر" میں پیش کیا اور یہ کہ ان سے قبل ہندوستان میں اس ادبی زبان کا کوئی وجود نہیں تھا اس خصوص میں گریرسن کے تعارف "لال چندریکا" کے علاوہ لسانی جایزہ ہند حصہ اول ج ۹ سے اظہارات اقتباس کرتے ہوئے اس تاثر کو بعید از انصاف قرار دیا ہے۔ شاردا دیوی صاحبہ اس تعلق سے اپنی واضح اور موثر تردید میں لکھتی ہیں کہ گریرسن کا یہ کہنا غیر منصفانہ ہے کیوں کہ "پریم ساگر" میں مستعمل زبان کم و بیش وہی ہے جو للولال جی کوی کے وطن آگرا میں مروجہ تھی اور آج بھی تھوڑے بہت سے فرق کے ساتھ وہاں رائج ہے۔ بہ قول موصوفہ اگر یہ کتابیں سامنے نہ آتیں تب بھی ہندی نثر کا ۱۹ویں صدی سے خاصا قبل وجود بہر حال تھا جب کہ کھڑی بولی ہندی کی اپنی تاریخ بہت قدیم ہے اور ۱۳ویں صدی سے یہ معروف ہے گو ہندوی اور ہندووی وغیرہ اس کے اور بھی نام رہے ہیں۔

"ہندی نثری ادب کا ارتقا" کی فاضل محقق کے الفاظ میں للولال جی کوی اور سدل مسر کو ایک نئی زبان کو "ایجاد" یا متعارف کر کے مقبول بنانے کا کریڈٹ نہیں جا سکتا کیوں کہ ان کے ان پیش روؤں نے جو قابلِ لحاظ عرصہ پہلے آزادانہ تخلیقات چھوڑ گئے اس کی ابتدا کی تھی۔ ان کی تصانیف بہ صورت مخطوطات محفوظ ہیں اور للولال جی کوی کے پریم ساگر کی طرح معروف نہیں ہو سکیں اپنی نوعیت میں ڈاکٹر شاردا دیوی کے بہ قول زیادہ ادبی نیز غیر مخلوط اور غیر مقامی Less Colloquial mla واقع ہوئی ہیں گریرسن کی ہی طرح "مسر برادران" (مشر بندھو ور یا ہندی ساہتیہ کا اتہاس ج ۲ لکھنو ۱۹۲۷ء) بھی اس کے قابل تھے کہ "ورتمان گدیہ کے جنم داتا سدل مسرا اور للولال مانے جاتے ہیں" اور اس رائے کو روسی فاضل بارانیکوف نے "ہندوستان میں عام طور پر مشہور تاثر" کے بہ طور اپنے مقالے "جدید ادبی ہندی" (مطبوعہ بی ایس او ایس شمارہ محولہ گزشتہ) میں نہیں کیا۔ تاہم شاردا دیوی صاحبہ کا خیال ہے کہ منقولہ تجزیے پر گریرسن کا اثر واضح

ہے جس سے شیام سندر داس (مقدمہ "ہندی شبد ساگر" ۱۹۲۹ء) اور رام چندر شکل ("ہندی ساہتیہ کا اتہاس" ۱۹۳۱ء) نے اظہار اتفاق نہیں کیا۔ تاہم رام چندر شکل اور شیام سندر داس صاحبان کی گفتگوؤں سے اضافے کے بغیر ہی یہ مباحثہ تمام ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے مفصل انتقادمیں ڈاکٹر شاردا دیوی ودیالنکار نے محکم انداز میں اپنے نظریوں کا اثبات اور اختلافی اظہارات کا رد کیا۔ ان کے تجزیات سابقہ چند عنوانوں کی بحثوں پر نئے زاویوں کے بھی سامنے آنے کا موجب ہوے اور اس کے پہلو بہ پہلو چند علمی غلط فہمیوں کے ازالے کا بھی باعث رہے۔ مخصوص طرز کار کے سبب کچھ نئے نکات بھی للو لال جی کوی کے "پریم ساگر" کی بنیاد پر روشن ہوے۔

ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے بھی جو "فورٹ ولیم کالج" پر ہندی کے اوّلین محقق ہیں۔ دوسری ادبی تاریخ ہیں ہند شناس مغربی فضلا۔ اور ہندوستانی عالموں کے اس موقف کے حامی نہیں ہیں کہ للولال جی کوی نے "پریم ساگر" تحریر کر کے ہندی نثر ایجاد کی۔ "آدھونک ہندی ساہتیہ" میں پروفیسر وارشنے ص۲۶ و ص۲۷ پر اسی نکتے سے بحث کرتے ہوے اور للولال جی کوی کے متعدد پیش روؤں کے کارناموں کی مثالیں پیش کرتے ہوے اس مسئلے کو سلجھاتے ہیں: "کھڑی بولی گدیہ کے اتہاس پر وچار کرتے سمے تاسی (گارساں دی تاسی)، گریرسن، فریزر (الیف ای) کی، گریوز آدی ودیشی اور ان کے آدھار پر بھارتیہ اتہاس لیکھکوں نے للولال اور سدل مسر پر دھانت للولال کے ناتے آدھونک کھڑی بولی گدیہ کا جنم فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں گل کرسٹ کی ادھیکشتا میں مانا ہے۔ دوسرے شبدوں میں انگریزوں نے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں آدھونک کھڑی بولی گدیہ کا اوشکار کیا۔ کنتو یہ مت کتنا نرمول ہے یہ اوپر کے ووِرن سے سدھ ہو جاتا ہے (ایک طویل گفتگو کی طرف اشارہ) انگریزوں کے بھارت ورش نے یا فورٹ ولیم کالج کی استھاپنا یا للولال سے پورو ہندی میں برج بھاشا، راجستھانی اور سویم کھڑی بولی کی گدیہ پرم پرا رہتی یدیپی کھڑی بولی کی پرم پراکشین روپ میں تھی۔ ۱۹ ویں شتابدی سے پورو ہندی ساہتیہ میں کھڑی بولی کا برابر اپیوگ ہوتا تھا۔ کاویہ کے کشتیر میں امیر خسرو اور سنت کویوں سے لے کر دکھنی ہندی کے کویوں تک اس کا کسی نہ کسی روپ میں سدیو پریوگ، ہونا ہندی ساہتیہ

کے سادھارن گیان کی بات ہے، کالج سے پہلے یا اس سے باہر کھڑی بولی گدیہ کا نرمان ہوا تھا اور ۱۹ ویں شتابدی کے آس پاس ہی یا اس کے پرتھم دشابد (عشرے) میں بھی ہو رہا تھا۔ اتہاس لیکھکوں کے مت انوسار للولال سے ایسی بھاشا میں 'پریم ساگر' رچنے کے لیے کہا گیا تھا جس میں سے عربی فارسی یا انیہ ودیشی شبد نکال کر ان کے استھان پر شدھ سنسکرت شبدوں کا پریوگ کیا گیا تھا اور جس کے پھل سروپ آدھونک ہندی گدیہ کا جنم ہوا۔"

بہ قول پروفیسر وارشنے جو اسی تسلسل میں اس کے قابلِ عہد کی ادبی یادگاروں کی جانب اشارہ کناں ہیں: "یہ مت بھی بھرانتھ مولک ہے کیوں کہ ۱۸ ویں شتابدی میں پٹیالا کے رام پرساد نرنجنی کرت "بھاشا یوگ وسشٹھ" (مورخہ عیسوی سن ۱۷۴۱ء) اور مدھیہ پرانت کے دولت رام کرت "جین پدم پران" ۱۷۶۱ء کی بھاشا میں عربی فارسی شبدوں کا پریوگ نہیں ہوا۔ ۱۷۶۱ء میں انگریز ہندی پردیش تک پہنچے بھی نہیں تھے۔ سویم کالج کی استھاپنا کے سمے متھرا ناتھ شکل نے "پنچ انگ درشن" (مورخہ ۱۸۰۰ء) اور رلگ بھگ اسی سمے سدا سکھ لال نے وشنو پران پر آدھارت گدیہ رچنا کی اور ۱۷۶۸ء اور ۱۸۰۸ء کے بیچ انشا نے "رانی کیتکی کی کہانی" کی رچنا کی۔ ان سب رچناؤں میں عربی فارسی شبدوں کے استھان پر وشدھ سنسکرت یا ٹھیٹھ ہندی شبدوں کا پریوگ ہوا ہے۔ استو، آدھونک کھڑی بولی گدیہ کا جنم انگریزوں کے سنرکشن میں فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی وبھاگ کے ادھیکش جان بورتھ وک گل کرسٹ کے پروتساہن سے رچے گئے للولال کرت "پریم ساگر" سے نہیں مانا جا سکتا۔ للولال آدھونک کھڑی بولی گدیہ کے جنم داتا تو نہیں کہے جا سکتے۔ کنتو اب تک کی اُپلبدھ سامگری کے آدھار پر رام پرساد نرنجنی، دولت رام، متھرا ناتھ شکل، انشا تتھا انیہ کئی اور چھوٹے چھوٹے لیکھکوں کے ساتھ للولال اور سدل مسر بھی چاہے ان کی رچنائیں جس درشٹی کون سے ہوئی ہوں کھڑی بولی گدیہ کے پرارمبھک انامیکوں میں سمجھے جا سکتے ہیں (۲۶ و ۲۷)۔

خلاصہ یہ کہ خواہ ایجاد کا عمل مجرد للولال جی کوی سے منسوب کیا جائے یا ان کے سرپرست مربی انگریزوں سے پروفیسر لکشمی ساگر وارشنے صاحب کے منقولہ مشاہدات کی رو سے "انگریزوں کے سنرکشن میں آدھونک کھڑی بولی گدیہ کا جنم تو نہیں ہوا اُس

کا سوتنتر استتو پہلے ہی سے تھا اور انیسویں شتابدی میں سوتنتر روپ سے وہ بڑھ بھی رہا تھا" (ص۲۷)۔

پروفیسر وارشنے کے اقتباس کیے ہوئے کلمات کے شروع میں جس پیوستہ بحث کا حوالہ گزرا وہ دراصل کھڑی بولی ہندی نیز راجستھانی اور برج تینوں ادبیات کے علاقہ وار ارتقائی عمل کے جائزے میں ہے اور خاصی مفصل ہے۔ ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کے وہ ملاحظات للولال جی کوی کی قلمی عطایا اور خاص کر "پریم ساگر" کی تجزیہ کاری سے علاقہ نہیں رکھتے ہیں اگرچہ کہ وہ جائزہ نگاری اپنے مبحث پر خاصی مبسوط اور صاحب کتاب کے مورخانہ زاویۂ نظر سے بڑی افادی ہے۔ اس کا بہرحال افسوس ہے کہ ازاں بعد ان مقامات پر جہاں للولال جی کوی کی مجموعی خدمات کی فہرست سازی کی گئی ہے۔ پروفیسر صاحب ممدوح کا قلم "پریم ساگر" وغیرہ پر متوقعہ اور مطلوبہ انتقاد سے گریزاں رہا۔

"پریم ساگر" منظومۂ دیا شنکر فرحت

للولال جی کوی کے "پریم ساگر" کے نصف صدی سے زاید بعد برج بھاشا سے ہی مترجمہ و مستفاد منظوم اردو "پریم ساگر" معرض تخلیق میں آئی۔ مثنوی اردو "رامائن" یا "رامائن تلسی داس" نیز "شیو پران منظوم" کے مصنف اپنے وقت کے مشہور نظم نگار منشی دیا شنکر یا شنکر دیال فرحت نے بھاکھا سے اپنی منظوم "پریم ساگر" ۱۸۶۳ء میں تحریر کی۔ اس کا علم ابتدأً سید مسعود حسن رضوی ادیب کے ایک مقالے متعلقہ نانک منشی خادم حسین افسوس سے ہوا جس میں پروفیسر صاحب مرحوم نے ضمناً "پریم ساگر فرحت" کا ذکر کیا۔ جناب رام لعل نابھوی صاحب قبلہ نے راقم کی گزارش پر اس منظومۂ فرحت کے ایک متعاقب ایڈیشن سے چند اوّلین اوراق کے عکس ارزانی فرمائے تاکہ مثنوی کے متن سے بالراست اکتساب احقر کے لیے ممکن ہو۔ ان سے مظہر ہے کہ یہ ایڈیشن با تصویر رہا ہے مگر پروفیسر ادیب کے ثمر ہند مطبع کے ایڈیشن سے اقتباس کی ہوئی منشی افسوس کی نثری اور منظوم تحریریں اس میں شامل نہیں ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے تعارف "نانک بزم سلیمان" (ص۵ تا ۵۲) کی اطلاعات کے مطابق ان کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ثمر ہند ایڈیشن کے مشمولات میں شروع میں منشی خادم کی "تاریخ تصنیف مثنوی پریم ساگر"

مصنفہ منشی دیا شنکر فرحت" اور اخیر میں منشی افسوس کی ہی "نثر خاتمہ کتاب" کے ہم راہ راۓ ہر پرشاد کا "بارہ ماسہ" بھی درج ہے۔ سن اشاعت جو مقالہ ہٰذا میں غیر مذکور ہے ۱۸۶۴ء ہے۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب کے انکشاف کی رو سے منشی شنکر دیال فرحت کے منظومے کی تخلیق کی تاریخ یہ ہے: "تاریخ تصنیف مثنوی "پریم ساگر" مصنفہ منشی دیا شنکر فرحت طبع زاد منشی خادم حسین افسوس:

یہ افسوس ہے نسخۂ لاجواب — کہ ہیں شایق اس کے صغیر و کبیر
سرِ درد کو دور کر کے کہو — ہوا کیا انیا ترجمہ بے نظیر

سمبت ۱۹۲۰ = ۱۲۸۰ ہجری" (صـ۵ـ)

خادم حسین افسوس نے جو خاتمہ کتاب تحریر کیا پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مقالے کے مندرجات سے پیش ہے: "افسوس کی نثر خاتمہ: منشی شنکر دیال فرحت نے "پریم ساگر" کا منظوم اردو ترجمہ مثنوی کی شکل میں ۱۲۸۰ ہجری میں تمام کیا۔ اس کا خاتمہ افسوس نے لکھا جو عنوان کی عبارت سمیت ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ نثر خاتمہ کتاب طبع زاد شاعر بے بدل و عالم باعمل برگزیدۂ دارین منشی خادم حسین متخلص بہ افسوس:

ہزار شکر کہ ہنگام خوش گوار آیا — چمن میں دھوم مچی موسم بہار آیا
ہوئی ہے فصل ہری سے ہری بھری ہر شاخ — مراقبے میں ہر ایک نخلِ میوہ دار آیا
ہر ایک مرغِ چمن محو بیت خوانی ہے — نہال بیت میں بھی اب کی بار بار آیا
بہم یہ ہے چمنستان میں ساز و برگ طرب — کہ پتی پتی کو موسم یہ سازگار آیا

یعنی ان دنوں شنکر دیال فرحت خلف منشی پورن چند نے ترجمۂ "پریم ساگر" بھاکھا سے زبان اردو میں نہایت دل چسپ و دل پسند کیا "قلزم ذخار اور بحرِ ناپید کنار کو کوزے میں بند کیا۔ مضمون راست براست بے کم و کاست ہے اور کا اور نہیں، مثل دیگر کتب مترجمہ حال فسانے کا انداز مثنوی کا طور نہیں۔ اسمائے مقدسہ کے پیش تر لفظ "نثری" موجود ہے، اس صورت میں یہ کتاب تحفہ ہنود ہے۔ مطلع کی صنعت اظہر من الشمس ہے حاجت اظہار نہیں، مضمون حرف حرف شفا ہیں تشریح درکار نہیں۔ بندش الفاظ مخصوص اسلام سے معرا، اپنے محاورات کو دیکھیے کیا زبان ہے۔ کیسا روزمرہ ہے۔

آغاز سے انجام تک گستاخی کا مضمون بے ادبی کا ڈھنگ نہیں، اگر چشم غور سے دیکھیے تو آئینۂ سخن میں زنگ نہیں۔ قبل از نسخہ شیو پران مترجم ہٰذا کی کوشش سے منظوم ہوا سو دا گویا کی کثرت، ہوئی خریداروں کا ہجوم ہوا۔ یقین کامل ہے کہ اسی طرح صفحہ ہٰذا کی گرم بازاری ہو، شایقین نزدیک و دور مطبع ثمر ہند سے طلب فرماویں نہایت خریداری ہو" (ص ۵۱/۵۲)

منشی شنکر دیال یا دیا شنکر فرحت "پریم ساگر" سے قبل "نسخۂ شیو پران" کو بصورت مثنوی اردو کا پیکر عطا کر چکے تھے جب کہ انھوں نے بعد میں "تلسی کرت رامائن فرحت" کی تخلیق کا کارنامہ بھی سرانجام دیا اور یہ تصنیف تلسی داس کی ہندی رامائن کے ساتوں کانڈ کے لب لباب پر مبنی تھی۔ "پریم ساگر فرحت کے نسخۂ نابھوی کے سرورق پر سالِ اشاعت کا اندراج نہیں ہے تاہم حضرت رام لعل نابھوی کا ارشاد ہے کہ نول کشور ایڈیشن ۱۸۷۹ء میں مطبوعہ بار دوم ہے اور ڈیمائی سایز کے ۴۸ صفحوں پر محیط بہ قول ممدوح "بالکل صحیح حالت میں نابھوی کے پاس ہے۔" کتاب کے شروع کی طرح اخیر میں بھی نسخۂ ثمر ہند مطبوعہ ۱۸۶۴ء کے منسلاک از قسم خاتمۂ نثری از منشی افسوس اور "بارہ ماسہ" تصنیف شری ہر پرشاد شاد شریک نہیں ہیں۔ نول کشور کا طبع اول ۱۸۶۸ء کا تھا۔ زیر نظر طبع نول کشور کی کتابت قدیم املا کی حامل ہے اس لیے کلام فرحت کا نمونہ موجودہ طرز میں نقل ہے۔ مقدمہ شاعر فنی دست گاہ اور سخن ورانہ کمال کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔

ہری ہر روش سے ہو شاخ قلم — نئے گل کھلائے پھلے دم بہ دم
قلم اپنا گل دستۂ گل بنے — زباں اپنی منقارِ بلبل بنے
ہر اک مصرعۂ شعر ہو نخلِ نور — روش کی روش پر ہو بین السطور
مِرا تختۂ کاغذِ زر فشاں سے — بنے تختۂ غیرت گلستاں
بہار مضامین بر جستہ ہو — عیاں ہو بہو رازِ سربستہ ہو
جمے رنگِ مضمون آراستہ — ہر اک مصرعہ ہو سرو نو خاستہ
ہر اک نقطہ ہو خالِ روئے نگار — چھپے مردم چشم دنبالہ دار
فدا دائروں پر ہوں شمس و قمر — وہ مد ہو جو مردم کو مدِ نظر
وہ مرکز جو ہو مرکزِ چشم جاں — وہ نقطہ جو ہو تحفۂ نکتہ داں
کشش کھینچ لے عقلِ وحدت گزیں — اڑے رنگ از رنگِ نقاشِ چیں

بنے چرخ چارم زمینِ سخن — چمک جائے نقش و نگینِ سخن
نہ حرف آ سکے معنی و حرف پر — شفق ہو فدا رنگِ شنجرف پر
بہ ظاہر میرے دیدہ و دل کھلیں — جو باطن کے اسرار کا مل کھلیں
مرا سینۂ صاف بے کینہ ہو — ہر آئینہ مانندِ آئینہ ہو

منظومہ ہٰذا کے مختلف اجزاء اور اس کی تصاویر کے بھی عنوانات نثر میں ہیں اور داستانی طرز رکھتے ہیں مثلاً "جانا راجہ پریچھت حاکم ہستنا پور کا صحرا میں شکار کے واسطے اور ملاقات ہونا کل جگ سے" یا "شبیہہ راجا پریچھت کا شکار گاہ کو جانا اور ملنا کل جگ کا در پے آزار ہوتے ہوئے دھرم اور زمین شکل گاؤ کے" نیز "بیٹھنا راجا پریچھت کا اور سننا بھاگوت کا بزبانی سکھ دیوجی کے لب دریا پر سات دن میں"۔

باب وار عنوانیہ کی جھلک پیش کی جاتی ہے: (۱) ادھیائے پہلا بیان راجہ اوگر سین حاکم شہر متھرا کا' (۲) ادھیائے دوسرا بیاہ جانا دیوکی خواہر کنس کا بسد یوجی کے ساتھ اور سننا آکاش بانی یعنی الہامِ غیب (۳) ادھیائے تیسرا قتل ہونا چند بنسیوں کا اور جانا رہی کانند کے گھر میں اور ظہور فرمانا سری بلدیوجی کا۔

"پریم ساگر" ہم موضوع کتابوں کی جستجو

"پریم ساگر" کی چند اور ہم نام و ہم موضوع کتابیں مختلف ذریعوں سے دریافت ہوئی ہیں۔ ہم معنون کتب میں سے کسی ایک کی تفصیلات سے عدم واقفیت کے باوجود ان کا مبحث ظاہر ہوتا ہے لیکن ہم نام کتابوں کے موضوعات غیر واضح بھی ہیں اور مختلف بھی۔ "قاموس الکتب" ج ا نیز انجمن ترقی اردو کراچی میں مخزونہ "مخطوطات" میں بھی للولال جی کوی کی "پریم ساگر والے گیتا کے دسویں کھنڈ کے متعلق چند ہم موضوع مخطوطات و مطبوعات کا ذکر ہے جو تاریخی ترتیب سے اقتباسات ہیں۔ سری مد بھگوت گیتا کے متعدد اور مختلف النوع اندراجات میں سے صرف ان مطبوعہ و مخطوطہ کتب نظم و نثر تک فی الحال محدود رہا جا رہا ہے جو دسویں کھنڈ سے مخصوص ہیں۔ ان اندراجات میں سے بھوپت رائے کی "پورن سری دسم اسکند سری بھاگوت" اور پنڈت رام جس دہلوی کی "محیط الحقایق" نامی مثنویوں کی تفصیلیں پیشِ نگہ ہیں اور بقیہ سب کی زیر نظر کیفیتیں

مختصر سی ہیں۔

(۶) قاموس صـ۱۱۲۶ ۱۱۲۷۶ بھوپت رائے: "پورن سری دسم اسکندسری بھاگوت" صفحات ۴۸۷ ما بعد... ۱۱ھ قلمی (بھاشا نظم) حوالہ کتب خانہ سالار جنگ (حیدرآباد دکن) فہرست صـ۲۸۲۔ بھگوت گیتا کا دسواں حصہ ہے۔ ("مخطوطات" ج ۱م صـ۲۴۱ ۳/۲۲۴ میں مندرجہ "بھاگوت گیتا" منظومہ دیال داس ولد رتی رام مصنفہ قریب... ۱ ہجری کی تفصیل مظہر ہے کہ "بھوپت رائے کے دسویں اسکند کی تکمیل کے بعد اس مصنف نے گیارہویں اسکند کو بھاشا میں تصنیف کیا۔" بھوپت رائے کا اصل نسخہ "مخطوطات" ج ۵ کے شمارہ ۲/۴۲۹ و ۳۳۰ نیز ج ۶ شمارہ ۳/۱۵ پر بھی درج ہے اور کل ملا کر خاص معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔)

(۷) قاموس صـ۱۱۲۷ ۱۱۲۹۵، سردار سنگھ بھارگو: "دسم اسکندسری بھاگوت" صـ۳۷۹ نول کشور لکھنؤ۔

(۸) قاموس صـ۱۱۳۰ ۱۱۳۲۲: نسیم، سردار سنگھ بھارگو: "ترجمہ دسم اسکندسری بھاگوت منظوم" صـ۳۷۵ نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۷ء۔ (یہ ظاہر نہیں کہ آیا دونوں ایک ہی کتاب کے ایڈیشن ہیں یا اول الذکر نثری ترجمہ یا تالیف ہے۔)

"پریم ساگر" للولال جی کوی کی ہم نام خطی اور شایع شدہ کتب میں سے مکھن لال کی "پریم ساگر" کے علاوہ جو مذکور ہوئی فرداً فرداً یہ طے نہیں ہے کہ کون سی اس سے نسبت رکھتی ہے، یعنی بہ اعتبار موضوع و متن کیوں کہ ان کی تفصیل سامنے نہیں ہے۔ تاہم زیرِ نگہ معدودے مندرجات احتیاطاً منقول ذیل ہیں۔

(۱) قاموس صـ۱۱۱۶ ۱۱۲۰۲: "پریم ساگر" نظم اردو ۱۸۶۲ء نول کشور لکھنؤ۔ منشی دیا شنکر فرحت کی مثنوی اور للولال جی کوی کی "پریم ساگر" کی اس ہم مضمون تخلیق کے علاوہ یہ کوئی اور منظوم ہے کیوں کہ فرحت کی نظم ۱۸۶۳ء میں تصنیف ہوئی جو اولاً مطبع ثمرِ ہند سے ۱۸۶۴ء میں نول کشور سے پہلی بار ۱۸۶۸ء میں شایع ہوئی۔)

(۲) قاموس صـ۱۱۱۶ ۱۱۲۰۶: "عزیز، گوپی ناتھ: "پریم ساگر" صفحات ۲۸ ۱۸۷۳ء حوالہ کیٹلاگ، برٹش میوزیم لائبریری لندن صـ۱۰۳"۔

(۳) قاموس صـ۱۱۱۶ ۱۱۲۰۱: "پریم ساگر" ۶ ۲۲ ورق ۱۸۸۵ قلمی۔ حوالہ: فہرست کتب

خانۂ خاص ڈاکٹر مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو پاکستان الف ۳/۵۰۔
"پریم ساگر" نامی ایک ایسی اردو کتاب کا بھی علم ہوتا ہے جو ماقبل آزادی کی مطبوعہ ہے، غالباً کسی سکھ بزرگ کا مجموعۂ پندو موعظت ہے۔ راقم کے وسیع المطالعہ بزرگ جناب محمد سعداللہ عاکف اس کے راوی ہیں تاہم تفصیل انہیں مستحضر نہیں ہے۔ حسن اتفاق کہ ڈاکٹر سہیل بخاری سے ایک مختصر دلکش رومانی نظم بہ عنوان "پریم ساگر" یادگار ہے جو قریب ۱۹۵۰ء کی تخلیق ہے۔ جو مغفور کے فرزند پروفیسر سید ذریت احمد نقوی کے اہتمام میں زیرِ ترتیب شعری مجموعے کی زینت ہوگی۔

سنگھاسن بتیسی

صاحب "ارباب نثر اردو" نے "سنگھاسن بتیسی" کے بارۂ خاص میں یہ صاف سیدھا اور بالکل واضح موقف اختیار کیا کہ اس کے مترجم للولال جی کوی تھے جنھوں نے مرزا کاظم علی جوان کے اعانت سے یہ کارنامہ سرانجام دیا' پروفیسر سید محمد کے یہ متعلقہ بیانات آگے منقول ہوں گے۔ تب سے اب تک کی معلومات کی روشنی میں منظر یہ بنتا ہے کہ" اردو سنگھاسن بتیسی کے للولال جی کوی سے موسومہ ایڈیشن بہ لحاظ تعداد کم اور زیادہ تر کاظم علی جوان سے منسوب مطبوعہ اور قلمی نسخے بھی محققین نے برآمد کیے جس کے باعث یہ قدرے اختلافی معاملہ ہو کر رہ گیا۔ اب اس مسئلے کی نوعیت سہ رخی ہو گئی ہے یعنی اردو " سنگھاسن بتیسی" کی مرزا کاظم علی سے نسبت کا معاملہ' ترجمے میں للولال جی کوی اور جوان کی شراکت یا باہمی معاونت و نیز اس اردو "سنگھاسن بتیسی" کے للولال جی کوی کے مترجمہ ہونے کی حقیقت۔ اس خصوص میں تینوں ہی پہلوؤں کے نکات و شواہد کا معرض بحث میں آنا ناگزیر ہے تاکہ اس ادبی مباحثے کا کوئی گوشہ کسی بھی طرح "گوشے" میں نہ رہ جائے اور ہر موقف کے تمام زاویہ ہائے نگاہ سامنے رہیں۔

اس سہ گانہ جائزے سے مترشح ہوگا کہ جس طرح "شکنتلا" نیز "بیتال پچیسی" اور "مادھونل کام کندلا" کے اردو تراجم کاظم علی جوان اور مظہر علی خاں ولا نے للولال جی کوی کی مدد سے تیار کیے بالکل اسی طرح للولال جی کوی نے مرزا کاظم علی کی مدد سے اردو "سنگھاسن بتیسی" کا ترجمہ پیش کیا جس کو انہوں نے ہندی میں بھی تحریر کیا۔ یہ وہ حقیقت ہے جو براہ راست نفس گفتگو بننے سے قبل ہی اس موضوع کے دوسرے دونوں پہلوؤں کے مباحث سے خود بہ خود آشکارا ہوتی چلی جائے گی۔ کوشش کی گئی ہے کہ اختلافی گفتگو یا دلایل کا کوئی رخ نظر انداز نہ ہونے پائے اور تمام نوعیتوں کے خیالات کی ترجمانی ہو جائے۔

مرزا کاظم علی جوان سے ترجمے کی نسبت

کاظم علی جوان سے موسومہ ایڈیشن کا اوّلین حوالہ ڈاکٹر گیان چند جین نے بالتفصیل دیا جن کے بعد بزرگ پاکستانی اسکالر جمیل نقوی نیز تازہ وارد ہندوستانی محقق ڈاکٹر شہناز انجم نے بھی مرزا کاظم علی سے منسوب علاحدہ اشاعتیں برآمد کیں۔ اس سب پر مستزاد اوّلاً ڈاکٹر جاوید نہال اور پھر ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے بھی جوان کے ترجمے کے مخطوطے تک دریافت کر لیے اور انہی سے استناد کیا۔ مختلف آثار سے استفادہ کرتے ہوئے دوسرے افاضل بھی اردو "سنگھاسن بتیسی" کو صرف کاظم علی کا مترجمہ قرار دینے کے حق میں ہیں اور اس طرح تعداد کی رعایت سے اسی موقف کو اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔ متعلقہ حقایق کی جستجو کے دوران یہ عجیب و دلچسپ اتفاق سامنے آتا ہے کہ زیادہ تر ایڈیشنوں پر صرف مرزا کاظم علی جوان کا نام بہ طور مترجم درج ہوتا آیا ہے اور تنہا للولال جی کوی سے موسومہ ایڈیشنوں کی تعداد نسبتاً کم رہی ہے۔ دونوں ہی باتوں کے باوجود ظاہر ہے کہ اس نوع کے معاملات کا انحصار کثرتِ آرا۔ یا کم زیادہ تعداد پر نہیں ہوا کرتا ہے۔

پروفیسر جاوید نہال نے اوّلین شہادت کے بہ طور اردو "سنگھاسن بتیسی" کے کاظم علی جوان کے مترجمہ متن کا انکشاف کیا اور پرزور الفاظ میں مولوی سید محمد کے اس ادّعا کی تردید کرنی چاہی کہ یہ ترجمہ للولال جی کوی کے کارناموں میں سے ہے۔ ڈاکٹر جاوید نہال کے اپنے دعوے کی بنیاد "سنگھاسن بتیسی" کا وہ مخطوطہ ہے جس میں بہ حیثیت مترجم مرزا کاظم علی کا "سبب تالیف" بھی شریک ہے اور اسی کے چند کلمات سے فاضل محقق نے استدلال کیا ہے۔ پروفیسر نہال کا فرمودہ ہے (ص ۱۳۲) کہ "سنگھاسن بتیسی" اور "شکنتلا ناٹک" دونوں ہی کو اردو داں طبقوں میں بڑی مقبولیت اور شہرت نصیب ہوئی اور یہی دو نثری داستانیں جوان کے نام کو ادبی دنیا میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔" "سنگھاسن بتیسی" کے متعلق "ارباب نثر اردو" کے مؤلف جناب سید محمد کا یہ خیال غلط ہے کہ یہ للولال جی کب کی تالیف ہے اور کاظم علی جوان نے للولال جی کب کو مدد دی تھی بلکہ بات اس کے برعکس ہے۔ جوان نے خود ترجمہ کیا تھا اور جان گل کرسٹ کی ہدایت پر للولال جی نے ترجمے میں کاظم علی جوان کو مدد دی تھی۔ اس کا ثبوت سنگھاسن بتیسی کے دیباچے میں ملتا ہے۔"

مرزا کاظم علی جوان کا داعیہ اس عبارت سے ظاہر ہے جو پروفیسر صاحب موصوف نے

اپنے ملاحظے میں موجود اردو "سنگھاسن بتیسی" کے قلمی نسخے سے پیش فرمائی ہے": کاظم علی نے اس کتاب کا سبب تالیف خود بیان کیا ہے: "سنگھاسن بتیسی" کہانی اصل میں سنسکرت تھی لیکن شاہ جہاں بادشاہ کی فرمایش پر سندر کبیشور نے برج کی بولی میں کہی۔ اب شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں موافق ارشاد جناب گل کرسٹ صاحب والا مناقب ۱۲۱۵ ہجری مطابق ۱۸۰۰ء کاظم علی شاعر نے جس کا تخلص جوان ہے محاورہ خاص و عام میں اہلِ ہند کے لیے لکھی اس لیے کہ نوسکھ صاحبوں کو سیکھنے اور سمجھنے کو سہج ہو اور ہر ایک کے روزمرے کی انہیں سمجھ ہو" (ص ۱۳۲/۱۳۳ بہ حوالہ دیباچۂ مخطوطہ ص ا و ۲) ڈاکٹر جاوید نہال اسی تسلسل میں بالاصرار لکھتے ہیں کہ "اس دیباچے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کاظم علی جوان نے "سنگھاسن بتیسی" کو اردو میں لکھا تھا اور اسے للولال جی کب کی تالیف سمجھنا غلطی ہے۔ سنگھاسن بتیسی کا خطی نسخہ ۱۳۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور سایز ۵×۷ ہے۔ خطی نسخہ خوش خط نہیں ہے، پڑھنے میں الجھن ہوتی ہے۔" (ص ۱۳۳)۔

ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے جوان کی مترجمہ "سنگھاسن بتیسی" کا جو مخطوطہ دریافت کیا اس سے انہوں نے جوان کے دیباچے کے یہی الفاظ پیش کیے اور ان کی شہادت پر اپنے موقف کے حق میں لکھا: "سنگھاسن بتیسی" ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی "سنگھاسن بتیسی" کے دیباچے میں کاظم علی جوان نے سببِ تالیف یوں بیان کیا ہے: "یہ کہانی سنگھاسن بتیسی کی سنسکرت میں تھی، شاہ جہاں بادشاہ کی فرمایش سے سندر کبیشور نے برج کی بولی میں کہی ــــــ الخ"۔ اس اقتباس کا حوالہ ص ۲۵۹ پر حاشیہ ۲ میں صرف اس قدر تحریر ہے": دیباچہ "سنگھاسن بتیسی" قلمی نسخہ ورق ا و ۲'اور کوئی صراحت نہیں ہے جب کہ یہ صفحہ ۸۰، "قلمی نسخے" کی فہرس میں ص ۲۹ پر بھی صرف اس قدر تحریر ہے: کاظم علی جوان کے الفاظ ہیں۔ پروفیسر جاوید نہال نے بھی متعلقہ مقام پر خطی نسخے کی کسی کتب خانے کی ملکیت نہیں ظاہر کی ہے البتہ اپنے ابتدایئے میں یہ صفحہ ۹ "ایشیاٹک سوسایٹی کلکتہ کے کتب خانے کے بیش بہا اردو مخطوطات سے" سب سے زیادہ مدد لینے کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے قلمی نسخوں کی طرف ایسے واضح اشارے کے بغیر مختلف شہروں میں اپنی تفتیشی سیاحت کی فہرس کے طور پر ایشیاٹک سوسایٹی آف بنگال کلکتہ کا بھی نام لیا ہے۔ اغلب یہی ہے کہ دونوں افاضل کے مطالعے اور

اکتساب میں آنے والے خطی مصادر یا تو ایک ہی تھے یا پھر ایک ادارے کے مزونہ رہے ہوں گے اس لیے باقاعدہ حوالوں کی عدم موجودگی سے فرق نہیں پڑے گا۔

سید جمیل نقوی نے ایک نامعلوم (؟) یا غیر واضح ایڈیشن مخطوطے سے دیباچہ جو ان کی یہی عبارت پیش کرتے ہوئے قرار دیا کہ "۱۸۰۱ء میں انہوں نے للولال جی کوی کو "سنگھاسن بتیسی" کے ترجمے میں مدد کی تھی جو ۱۸۰۵ء میں دیوناگری رسم الخط میں شایع ہوا تھا لیکن جوان نے بھی اس کتاب کو اردو رسم الخط میں اس کے ساتھ ہی ۱۸۰۱ء میں علاحدہ ترتیب دیا تھا جس کا ثبوت حسبِ ذیل اقتباس سے ملتا ہے" (ص۲۶۹)۔ کاظم علی جوان کا یہ اقتباس ایک شعر سے شروع ہوتا ہے اور بقیہ متن بالکل وہی ہے:

"الٰہی دے زباں مجھ کو وہ گویا | کہ تا حاصل ہو مطلب میرے دل کا"

یہ کہانی "سنگھاسن بتیسی" کی سنسکرت میں تھی شاہ جہاں بادشاہ کی فرمائش سے سندر کبیشور نے برج کی بولی میں کہی (الخ)"

اوّل الذکر دو فاضل نے اس بنیادی سوال کو چھیڑا ہی نہیں ہے کہ کاظم علی جوان راست بھاکھا کے متن کو کیوں کر اردو میں تحریر کر سکتے تھے اور ہندی ترجمے کے لیے للولال جی کوی ان کے ممنونِ کرم کیسے ہو سکتے تھے۔ جب کہ سید جمیل نقوی کا یہ موقف عیاں ہے کہ جوان نے اوّلاً للولال جی کوی کو مدد دی اور ایک مسوّدہ خود الگ سے تیار کیا۔ اس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی اور کچھ پہلے ہی پروفیسر عبادت بریلوی کے مرتبہ "مادھونل کام کندلا" کے حوالے سے بہ سلسلہ "بیتال پچیسی" منقول ہوئی ہے کہ مثلاً وِلا کو ہندی دانی میں کتنی دست رس تھی۔ یہ آیندہ واضح ہوگا کہ مظہر علی خاں ولا مترجم "مادھونل کام کندلا" اور "بیتال پچیسی" کی طرح خود مرزا کاظم علی جوان بھی برج زبان اور لٹریچر سے علمی ادبی سطح پر اکتساب کی استطاعت سے کس حد تک بہرہ مند تھے یا اس کے برعکس وہ للولال جی کوی کی ادبی و لسانی استعداد کی غرض سے ان کے کس قدر محتاجِ کرم۔ فی الحال چند اور علما کی رائیں پیش ہیں۔ آگے بڑھنے سے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ پروفیسر عبادت بریلوی نے مقدمہ "شکنتلا" میں اردو سنگھاسن بتیسی اور اس سے جوان کے تعلق بہ طور مترجم کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جب کہ "شکنتلا" کے ایک اور فاضل مرتب ڈاکٹر محمد اسلم قریشی مرحوم نے کاظم علی کے کارناموں کی فہرست سازی دو جگہ الگ الگ منابع کی گواہی پر کی ہے اور نتیجتاً انہیں دو علاحدہ

موقف اختیار کرنے پڑ گئے۔

پروفیسر اسلم قریشی نے مولوی سید محمد اور محمد عتیق صدیقی کے حوالے سے کچھ مصنف کے بارے میں لکھتے ہوئے مترجم "شکنتلا" کے کاموں کی یہ کیفیت دی ہے: "کالج میں تقرری کے دوران ان کی تالیفات وتراجم کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے: ۲۔ "سنگھاسن بتیسی" مولوی سید محمد نے لکھا ہے ۱۸۰۵ء میں جوان نے للولال کو سندر کبیشور کی کتاب 'سنگھاسن بتیسی' کے ترجمے میں مدد دی لیکن محمد عتیق صدیقی کی فراہم کردہ معلومات (بہ حوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۹۳ اور ۱۹۴) سے واضح ہوتا ہے کہ گل کرسٹ کی رپورٹ مورخہ ۱۲ جنوری ۱۸۰۱ء کے مطابق گیارہ کتابیں تصنیف وتالیف یا ترجمہ ہو چکی تھیں اور طباعت کی منزل سے گزر رہی تھیں ان میں جوان کی "سنگھاسن بتیسی" اور "شکنتلا" بھی شامل ہیں۔ مزید برآں سکریٹری کالج کونسل کی یکم فروری ۱۸۰۲ء کی رپورٹ میں ان کتابوں کی فہرست شامل ہے جن کا انتخاب شائع کرنا طے پایا تھا۔ اس فہرست میں جوان کی مذکورہ دونوں کتابیں شامل ہیں" (ص ۲۱۰)

تاہم چوں کہ مرحوم اسکالر نے بہ صفحہ ۹ خطبات دی تاسی کی بنیاد پر جوان کو للولال سے مل کر سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کنندہ قرار دیا اس لیے اصل موقف عیاں نہیں، پروفیسر قریشی کا یہ بیان ایک آیندہ سرخی کے تحت اقتباس ہوگا۔

ڈاکٹر شہناز انجم مرزا کاظم علی جوان کے نثری کارناموں میں اردو "سنگھاسن بتیسی" کو شمار کرتی ہیں اور جوان کی ادبی مصروفیتوں میں سے ان کی سخن گوئی کے ذکر کے ساتھ لکھتی ہیں: شاعری کی دنیا میں تو کاظم علی جوان مشہور نہ ہوتے البتہ اردو نثر کے افق پر "شکنتلا" ناٹک ترجمہ اور "سنگھاسن بتیسی" جیسی تالیفات کے باعث نمایاں جگہ حاصل کرلی" (ص ۱۷۹)۔ آیندہ صفحوں میں اپنے زیرِ نظر ایڈیشن سے چند سطور دو مقامات پر اقتباس کرتے ہوئے موصوفہ نے یہ حوالہ درج کیا ہے: "سنگھاسن بتیسی تیرھویں بار ۱۹۵۳ء میں بپن بہاری کپور مینیجر مطبع نول کشور لکھنؤ" یعنی مترجم کا نام ان مواقع پر غیر مذکور ہے۔ لیکن "فہرست کتابیات" میں بہ صفحہ ۳۰۶ ص ۲۶ کے اندراج میں نام موجود ہے "۲۶۔ جوان، کاظم علی "سنگھاسن بتیسی" تیرھواں ایڈیشن بپن بہاری کپور مینیجر مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۵۳ء"۔ تاہم ڈاکٹر شہناز انجم کا موقف بھی صاف نہیں ہے کیوں کہ مرزا کاظم علی کا یہ ایڈیشن پیش نگہ ہونے کے باوجود وہ ابتداً منقولہ بیان سے قبل اس ترجمے

کو دونوں اسکالروں کا مشترکہ کارنامہ باور کرتی ہیں۔ اسی خیال پر ڈاکٹر صاحبہ موصوفہ کو اصرار ہے جس کی تفصیل اگلی سرخی کے ماتحت ضبط تحریر میں آسکے گی۔

کاظم علی جوان کو ڈاکٹر سمیع اللہ بھی اردو "سنگھاسن بتیسی" کا مترجم سمجھتے ہیں، چنانچہ کتاب کا اندراج مرزا کاظم علی کی ہی "تصانیف" کی توضیحی فہرس میں دیتے ہوتے انہوں نے لکھا ہے: "سنگھاسن بتیسی" اس کی اصل سنسکرت ہے جسے سندر کبیشور نے شاہ جہاں کے عہد میں برج بھاشا میں ترجمہ کیا تھا۔ گل کرسٹ کے ایما پر جوان نے ۱۸۰۱ء میں اسے اردو کا جامہ پہنایا، اس کے ترجمے میں للولال نے بھی ان کی مدد کی تھی۔ اس میں کل ۳۲ کہانیاں درج ہیں، یہ ۱۸۰۵ء میں ناگری لپی میں کلکتے سے شایع ہوئی جس کے سرورق پر جوان کے ساتھ للولال کا نام بھی شامل ہے" (ص ۱۲۸)۔ آخرالذکر اطلاع نئی اور اہم ہے اگرچہ حوالہ لکھنے سے رہ گیا ہے۔

للّولال جی کوی کی شراکت یا باہمی اعانت کا معاملہ

اس مباحثے کا اگلا رُخ یہی ہے کہ یہ کارنامہ تنہا کاظم علی جوان کی کاوش کا نہیں بلکہ للولال جی کوی کی معاونت سے انجام پایا گویا دونوں کے عملی اشتراک کا نتیجہ ہے اس جانب کچھ اشارات گزر چکے ہیں اور چند ایک پیش ہوا چاہتے ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ للولال جی کوی کی رفاقت اس کام میں کاظم علی جوان کو حکماً میسّر رہی۔ اس تعلق سے داستانی ادبیات کے اوّلین محقق پروفیسر گیان چند کے عالمانہ ملاحظات سے کتنی زاویے روشنی میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی تحقیقی تصنیف کے چھٹے باب "اردو کی سنسکرت الاصل کہانیاں: فورٹ ولیم کالج اور اس کے باہر" میں بہ صفحہ ۳۰۴/۳۰۵ "سنگھاسن بتیسی: کاظم علی جوان" کے عنوان سے ارشاد کیا ہے کہ "شاہ جہاں کے دربار میں ۱۶۳۱ء کے لگ بھگ سندر داس کوی نے "سنگھاسن بتیسی" کو سنسکرت سے برج میں ترجمہ کیا۔ اسی سے فورٹ ولیم کالج میں للولال جی کوی اور کاظم علی جوان نے ہندوستانی ترجمہ کیا۔ گل کرسٹ کی ۱۲ر جنوری ۱۸۰۳ء کی رپورٹ (بہ حوالہ عتیق صدیقی ص ۱۴۵) کے مطابق اس کتاب کے ۳۶ صفحے چھپ چکے تھے ـــــ ۱۸۰۵ء میں پوری کتاب ہندی رسم الخط میں شایع ہوئی"

اردو رسم الخط کی طبع اوّل کی تاریخ واضح نہیں۔" ازاں بعد یہ کہتے ہوئے کہ" اس کی چند کہانیوں کی تحقیق سے متعلق کچھ مشاہدات پیش کیے جاتے ہیں" پروفیسر جین نے دوسری کہانی سے لے کر چوبیسویں کہانی تک کا تقابل تحریر کیا ہے اور بہ صفحہ ۳۰۹ یہ ارشاد کیا ہے کہ" سنگھاسن بتیسی" ہندی اور اردو دونوں خطوں میں چھپی، زبان اور بیان ہر جگہ صاف سیدھے ہیں تصنع کا نام نہیں۔

کتاب کی حکایات پر فاضلانہ تبصروں میں ڈاکٹر گیان چند جین نے مترجمہ متن کو مرزا کاظم علی جوان سے منسوب کرنے کی توجیہہ متنی اساس پر کی ہے، اور اس تعلق سے دو فرمودات اہم ہیں: " داستان کے شروع میں راجا بھوج کے شہر اور محل کا بیان ہے، یہ کاظم علی جوان کا کارنامہ ہونا چاہیے کیوں کہ یہ قدیم زمانے کا ہونے کی بجائے اٹھارہویں صدی کا بازار اور اسلامی محل ہے" (ص۳۱۱)۔ اس مقام سے " بازار کی ایک جھلک" خلاصہ کی گئی ہے جس کے مابعد کے مشاہدے کی رو سے" مینا بازار، گدڑی، سقوں کا کٹورے بجانا، معشوقوں کے پیچھے عاشقوں کا پھرنا، یہ جوان کے عہد کی باتیں ہیں۔ رہا محل تو بالکل دلی یا لکھنؤ کے نواب کا معلوم ہوتا ہے، ہر چند اسلامی دور کی ہے۔ مترجم آنکھ موند کر زمانے کا کچھ بھی لحاظ کیے بغیر اپنی دھن میں لکھتا چلا گیا ہے"۔ ان تاثرات سے پروفیسر جین کے اس موقف کا اظہار ہوتا ہے کہ اردو سنگھاسن بتیسی" مرزا کاظم علی جوان کی یادگار رہے" تاہم عین انہی اقتباسات کے ارد گرد وہ شہادتیں موجود ہیں جن سے اس کے برعکس اسی نظریے کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ ترجمہ دراصل للو لال جی کوی کا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کے ان اجزا کو آگے اقتباس کیا جا رہا ہے۔

" بیتال پچیسی" کے ایک مرتب ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے" شری للو لال جی کوی" پر سید محمد و عتیق صدیقی صاحبان سے مستفاد احوال خلاصہ کیا۔ جس میں راوی ہیں کہ " سنگھاسن بتیسی" میں انہوں نے کاظم علی جوان اور " بیتال پچیسی" کے ترجمے میں انہوں نے مظہر علی ولا کی اعانت کی" (ص۱۵)۔ فاضل موصوف کی یہ اطلاع بغیر حوالہ و سند ہے اور بنا بریں وجہ حیرت نیز کم از کم سید محمد کے بیان اور موقف کے یکسر برخلاف۔ پروفیسر اسلم قریشی نے بہ طور مصحح" شکنتلا" خطبات دی تاسی اور تحقیقاتِ عتیق صدیقی

کے الگ الگ حوالے سے "کچھ مصنف کے بارے میں" معلومات جمع کرتے ہوتے دو جگہ علاحدہ علاحدہ فہرست سازی کی ہے۔ مرحوم اسکالر نے اوّل الذکر کی بنیاد پر مرزا کاظم علی کو للولال جی کوی کے ہمراہ "سنگھاسن بتیسی" کا مترجم اور ثانی الذکر کی سند پر "سنگھاسن بتیسی" کو صرف جوان کی ہی کتاب قرار دیا ہے۔" تاریخ ہندی و ہندوستانی ادب" مصنفہ دی تاسی طبع دوم پیرس ۱۸۷۰ ج ۲ ص ۹۲ تا ۹۴ سے ڈاکٹر محمد اسلم قریشی نے کاظم علی جوان کے تصنیفی و تالیفی کاموں کی فہرس کے چھٹے اور آخری نمبر کا ترجمہ یہ تحریر کیا ہے: "آخر میں للولال سے مل کر "سنگھاسن بتیسی" کا ترجمہ کیا "خرد افروز" پر نظر ثانی کی اور سودا کے کلام کا انتخاب کیا" قبل ازیں عتیق صدیقی صاحب کی تحقیق سے ماخوذ تاثر پروفیسر قریشی کے حوالے سے منقول ہو چکا ہے۔

جیسا کہ مذکور ہوا ہے ڈاکٹر شہناز انجم کے بیان کا ایک پہلو مرزا کاظم علی جوان کے "اردو سنگھاسن بتیسی" کا مترجم ہونے سے ہم رشتہ ہے تو دوسرا اس کارنامے میں للولال جی کوی کی رفاقت اور امداد کے خیال کو پختہ کرتا ہے اور اسی پر ڈاکٹر صاحبہ موصوفہ کو اصرار ہے۔ ڈاکٹر شہناز انجم نے اولاً یہ قرار دیا ہے کہ "فورٹ ولیم کالج کے داستانی سرمائے میں "سنگھاسن بتیسی" بھی کافی اہمیت رکھتی ہے" یہ ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے ایما پر ۱۸۰۵ء میں ترجمہ ہوئی۔ یہ داستان مرزا کاظم علی جوان اور للولال جی کی مشترکہ محنت کا ثمرہ ہے اور شاید اسی بنا پر اردو ہندی کی مشترکہ نثر کا نمونہ بھی ہے" (ص ۱۷۹)۔ لیکن جو ایڈیشن ان کے زیر حوالہ ہے جیسا کہ منقول ہوا وہ بہ طور مترجم صرف جوان سے ہی موسوم ہے اور پہلا نہ دوسرا بلکہ تیرھواں ہے۔ غالباً یہ نول کشور والوں کی اپنی ۱۳ ویں طباعت تھی کہ یہ ادارہ صرف ہر کتاب کے کسی ایڈیشن کو وقتاً فوقتاً شایع کرنے کا ماہر تھا جس کے علاوہ خاص اسی اردو "سنگھاسن بتیسی" کے کاظم علی جوان سے منسوب اور کسی ایڈیشن دوسروں نے طبع کیے۔ راقم کے نزدیک ڈاکٹر شہناز انجم کے اس موقف پر نظر ثانی کی ضرورت تھی کہ جب جوان کے اپنے نام سے مطبوعہ متن ان کے سامنے ہے تو ترجمہ دونوں اسکالروں کا ملا جلا کارنامہ کیوں کر قرار پاتے گا چنانچہ صاحبہ موصوفہ سے رجوع کیا تو انھوں نے اس اصرار پر اکتفا فرمایا کہ "سنگھاسن بتیسی سے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سلسلے میں یہی تحریر کر سکتی ہوں کہ میں نے بلا تردد "سنگھاسن بتیسی" کو کاظم علی جوان سے منسوب

نہیں کیا ہے۔ براہ مہربانی آپ "ادبی نثر کا ارتقا" کے صفحہ نمبر ۱۰۹ پر "سنگھاسن بتیسی" کے عنوان کے تحت یہ جملہ دوبارہ ملاحظہ کرلیں: "یہ داستان مرزا کاظم علی جوان اور للولال جی کی مشترکہ محنت کا ثمرہ ہے" تو آپ کا اعتراض ختم ہوسکتا ہے" (مکرمت نامہ مورخہ دہلی ۱۵/۲/۹۹ء)

للولال جی کوی کی امداد و رفاقت کے خیال کی یہ تفصیل دو نئے پرانے اشارات پر تمام ہوتی ہے جن میں ان کے اردو ترجمہ "سنگھاسن بتیسی" کے فارسی سے مترجمہ ہونے کا اضافی نظریہ موجود ہے اور اسی تصور کی بنا پر یہ اس مباحثے کے اخیر میں اقتباس کیے جا رہے ہیں۔ ڈھاکہ کے حکیم حبیب الرحمٰن کے تذکرہ "ثلاثۂ غسالہ" کا انکشاف کرتے ہوئے پروفیسر ام سلمیٰ نے حکیم صاحب کے ذخیرے میں محفوظ اردو "سنگھاسن بتیسی" کا بھی ذکر ایک تعارف میں کیا تھا جس کی اصل تفصیل عطا کرنے کی گزارش پر فاضل ممدوحہ نے مخطوطہ "ثلاثۂ غسالہ" کے صفحہ ۲۶۷ سے یہ کیفیت اپنے تلطف نامے مورخہ ڈھاکہ ۱۲/۹/۹۹ء میں تحریر فرمائی ہے: "سنگھاسن بتیسی: زبان اردو۔ اصل قصہ سنسکرت میں تھا جس کے فارسی ترجمے سے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں علی جواد دہلوی اور سری لالو جی گجراتی ایک ہندو اور مسلمان نے مل کر ۱۸۰۱ء میں یہ اردو ترجمہ کیا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان اس کی آدھی اردو اور آدھی ہندی ہے۔ اس زمانے سے اب تک خدا جانے کتنی مرتبہ چھپی۔ صفحہ ۱۰۴ مطبوعہ مختلف و متعدد پریس"۔

اسی طرح دکھنی "سنگھاسن بتیسی" کے فاضل مرتب افسر صدیقی امروہوی مرحوم نے عین اسی غلط فہمی کی بنا پر اردو "سنگھاسن بتیسی" کا ماخذ کوئی فارسی ترجمہ باور کیا۔ البتہ اس کو دونوں کا قلمی اشتراک انہوں نے بھی تسلیم کیا: "یہ ہندوؤں کی دیومالائی کہانی ہے جسے چتر بھوج داس بھٹ خلف سروپ چند نے ۱۶۰۵ء میں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا اور اسی فارسی ترجمے کو للو لال کوی اور مرزا کاظم علی جوان دہلوی نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے زمانے میں اردو میں منتقل کیا" (ص ۳) ظاہر اُس اطلاع کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں معلوم ہوتی ہے کہ اردو "سنگھاسن بتیسی" کا حقیقی ماخذ بھاکا کا نہیں فارسی کا ترجمہ تھا۔ زیادہ تعجب "ثلاثۂ غسالہ" کے تذکرہ نگار پر ہے جن کے مجموعے میں اردو "سنگھاسن بتیسی" موجود تھی جس میں کسی مقام پر بھی فارسی ذریعے کا کوئی مذکور نہیں پایا جاتا۔

للولال جی کوی کا اردو ترجمہ "سنگھاسن بتیسی"

قبل اس کے کہ سرخیِ ہٰذا کے دوسرے بنیادی ماخذ کی مدد سے حتمی معروضات پیش ہوں پروفیسر گیان چند کے بیان فرمائے ہوئے بعض نکات کا فیضان سطور ذیل میں منتقل کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔ یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ڈاکٹر گیان چند جین کے ان مبصرانہ کلمات کے دوران جن میں اردو "سنگھاسن بتیسی" کو مرزا کاظم علی جوان کا کارنامہ قرار دیا گیا ہے ایسے چند زاویئے بھی آشکارا ہوتے ہیں جنہیں اردو "سنگھاسن بتیسی" کے ترجمۂ للولال جی کوی ہونے کے سلسلے میں بہ طور برہان قاطع پیش کیا جاسکتا ہے۔ راقم کے اپنے طالب علمانہ نقطۂ نگہ سے بزرگ ممدوح کے فرمودات میں وہ سب مشاہدے اس تعلق سے انتہائی مفید اور بے حد مثبت ہیں جو لسانیاتی تجزیے کی ذیل میں آتے ہیں۔ پروفیسر گیان چند کے ملاحظات میں سے اس خصوص میں دو مواقع کی گفتگو ہی اس امر کا بہ خوبی اثبات کرتی ہیں کہ اردو "سنگھاسن بتیسی" کا ترجمہ للولال جی کوی کا کارنامہ رہا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین کا ایک مرحلے پر یہ تاثر ہے کہ "بعض مقامات پر زبان ایسی ہے جسے ہندوستانی کہا جاسکتا ہے لیکن ان حصوں کے علاوہ بھاشا کے الفاظ کی کثرت ہے جن میں سے بعض تو اردو میں نبھ جاتے ہیں" (ص ۳۰۹/۳۱)۔ اس اجمال کی معنی نیز تفصیل سے قطع نظر جو زیب نگہ ہوا چاہتی ہیں۔ یہ فاضلانہ اشارہ خود ہی للولال جی کوی کی بہ طور اردو مترجم "سنگھاسن بتیسی" میں بالادستی پر ایک مثبت تبصرہ ہے۔ کالج کی لائق فائق شخصیتوں اور ان کی یادگار مقبول عام و خاص ادبیات پر اب تک کے محققانہ و ناقدانہ کارناموں میں متعلقہ ادبا کی ہمہ گیر زبان دانی اور مہارت تامہ پر دو رائیں کبھی سامنے نہیں آئیں۔ یہ بے حد اور غیر معمولی اہم پہلو آج تک متنازعہ کیا محض اختلافی بھی نہیں رہا بلکہ ہر قسم کے شکوک اور اظہار اشتباہ سے بالاتر ہی رہا۔ للولال جی کوی کے رفقائے کالج سے لے کر ہمارے اپنے ثقہ و معتبر معاصرین تک کے اظہارات کا ماحصل یہی ہے کہ کالج کے اسکالروں میں سے صرف للولال جی کوی ہی بھاکا کے عالم فاضل اور مسلم الثبوت ماہر زبان و ادب تھے۔ اردو "سنگھاسن بتیسی" برج برج کا

لسانی و ادبی اثر للولال جی کوی کے ہی قلمی تصرفات کا راست و موثر حاصل ہے کیوں کہ للولال جی کوی ہی "مادھونل اور کام کندلا" نیز "شکنتلا" اور "بیتال پچیسی" کی طرح "اردو سنگھاسن بتیسی" کے بھی اصل مترجم تھے نہ کہ معاون۔

عرض کردہ اعتبارات سے پروفیسر گیان چند کے منقولہ مشاہدے کی تفصیل دعوتِ غور و فکر دے رہی ہے کہ "اردو سنگھاسن بتیسی" کے زیرِ جائزہ ترجمے میں 'بھاشا کے الفاظ کی کثرت ہے جن میں سے بعض تو اردو میں نبھ جاتے ہیں جیسے نیاو چتر سگڑ شبھ' نیوتا' راج نیت' ریت' جتن' ترت' استھان' دیا لابھ وغیرہ۔ اور بعض میل نہیں کھاتے مثلاً: پُرش' مکت' اودے' دھن بھاگ' برتانت' ادھار' مدھو کر وغیرہ (ص ۳۱۶/۳۹) ۔ اس کے متصل پروفیسر جین کی رائے کا اگلا حصہ یہ ہے: "عام طور پر ہندی الفاظ کی زیادتی ہے اور یہ کتاب اردو کی نسبت ہندی رسم الخط میں زیادہ صحیح پڑھی جاتی ہے۔ ہندی انشا پردازی کے اچھے نمونے ملتے ہیں" (ص ۳۱۶)۔ ان سب مواقع پر ڈاکٹر گیان چند جین نے جو کلمات اور فقرے اقتباس کیے ہیں وہ روز روشن کی طرح اسی امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ یہ عبارتیں للولال جی کوی جیسے مستند ادیب کے تخلیقی ذوق کا نگار خانہ ہیں۔ قدم قدم پر احساس ہوتا ہے کہ بہ قول پروفیسر جین "بھاشا کا مٹھاس موجود ہے' ہر چیز کا سماں نظر کے سامنے آجاتا ہے۔" اور اس سندر سجل نگارش کی کارفرمائی مناظرِ قدرت سے لے کر حکایات کے بیان اور سندریوں کے سراپے سے لے کر ان کی بول چال تک میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ ڈاکٹر گیان چند جین نے کاظم علی جوان کے جس قلمی عمل دخل کی طرف اشارے فرمائے ہیں۔ اس کی حیثیت للولال جی کوی کے عطیے کے بالمقابل ضمنی بنتی ہے نہ کہ اساسی۔ ترجمے کا بنیادی عمل صرف اور صرف للولال جی کوی کی زبان دانی اور انشا پردازی کا رہین منت ہے اور ثانی الذکر کے نقوش پروفیسر گیان چند جین کے مبصرانہ کلمات سے جب کہ اوّل الذکر کے آثار تمام تر اطلاعات سے اوراقِ ہٰذا میں مرتسم ہو چکے ہیں۔

"اردو کی نثری داستانیں" کے برگزیدہ محقق کی طرح ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا بھی تاثر اس امر کا گواہ ہے کہ "اردو سنگھاسن بتیسی" کا اسلوب سادہ اور آسان ہے لیکن یہ ہندی سے متاثر ہے۔ اس میں برج بھاشا کے الفاظ کثرت سے مستعمل ہیں لیکن ان الفاظ کے

استعمال میں نفاست اور خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ یہ الفاظ ناگوار اور جمالیاتی احساس پر گراں نہیں گزرتے۔ موضوع کے لحاظ سے "سنگھاسن بتیسی" کا انداز بیان موزوں اور مناسب ہے۔ الفاظ کی نشست برمحل ہے، جملے آہنگ اور ترنم سے پر ہیں۔ "سنگھاسن بتیسی" میں ہندی انشاپردازی کے بڑے خوب صورت نمونے ملتے ہیں ان میں تصنع اور آورد کا شائبہ تک نہیں کیا۔ منظر نگاری کیا واقعہ نگاری حسن بیان کے ہندی لب ولہجہ نے ایک دوسرا ہی سماں پیدا کر دیا ہے۔" (ص ۲۴) ظاہر ہے کہ انشائے ہندی کی متصرفانہ کاوشیں اپنے مصنف کی نشان دہی کر رہی ہیں اور ہزار کوشش کے باوجود مرزا کاظم علی جوان کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا ہے۔

"بیتال پچیسی" اور "سنگھاسن بتیسی" کے تعامل کے طور پر ڈاکٹر گیان چند جین کا یہ ارشاد نتیجہ خیز ہے کہ "ان کتابوں کی اردو میں مستقل حیثیت ہوتی اگر ان کی زبان اس قدر ہندی آمیز نہ ہوتی۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی فضا ٹھیٹ اردو کی تاب نہیں لا سکتی کیوں کہ ان میں سنسکرت عہد کی تہذیب کا بیان ہے جس کے لیے آسان زبان ہی زیادہ مناسب ہے جس میں نہ زیادہ عربی فارسی ہو نہ اجنبی سنسکرت۔ لیکن یہ ہوتا تو کس طرح ہوتا" یہ تو اُردو ہندی دونوں کی مشترک جاگیر ہیں" (ص ۳۷/۲)۔ اردو "سنگھاسن بتیسی" کے خاص حوالے سے دیکھنے پر بہ آسانی محسوس ہوتا ہے کہ اس ترجمے کی "اردو میں مستقل حیثیت" میں اشتباہ کا مسئلہ ہو یا دونوں کتابوں کی بہ یک وقت "اردو اور ہندی دونوں کی مشترک جاگیر" ہونے کا معاملہ، دونوں خیالات زبان حال سے اسی امر کا کھلا ثبوت ہیں کہ للولال جی کوی کے بہ طور مترجم غلبہ و تصرف کے بغیر یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا تھا۔ درحقیقت اصل مترجم یعنی للولال جی کوی کی اس حیثیت سے اغماض کا صریحی نقصان ہے کہ یہ غلط فہمی راہ پا رہی ہے کہ ان کتابوں کی اردو میں مستقل حیثیت ہوتی۔ اگر ان کی زبان اس قدر ہندی آمیز نہ ہوتی۔" اسی تصویر کا دوسرا پہلو یا اس سکے کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ اگر للولال جی کوی بنیادی طور پر بھاکا کے متن کے حس سے مرزا کاظم علی جوان اور مظہر علی خاں وِلا وغیرہم قطعاً اور سراسر نابلدِ محض تھے اردو "سنگھاسن بتیسی" کے اصل و حقیقی مترجم نہ ہوتے تو کتاب پر ہندی زبان کا تسلط اور اسلوب و لغات کی بھاری بھرکم اثر اندازی اور اسی کے خصوصی وسیلے سے ان سبھی کتب

اردو ہندی دونوں کی مشترک جاگیر" ہونے کا کیا امکان یا سوال ہوتا۔ ان کتابوں کی "اردو میں مستقل حیثیت" کو ان کی زبان کو ہندی آمیز ہونے سے مشروط کر کے مشکوک و مشتبہ یا سوالیہ نشان بنا دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ درمیان سے للولال جی کوی کی اہم ترین کڑی کو چھوڑا جا رہا ہے۔

عرض کرنے کا منشا۔ اسی قدر ہے کہ اردو "سنگھاسن بتیسی" کے خواہ کتنی ہی تعداد میں نئے پرانے ایڈیشن کاظم علی جوان سے منسوب ہوں اور للولال جی کوی کے نام سے اس کے چاہے کتنے ہی کم ایڈیشن نکلے ہوں، للولال جی کوی کو اردو "سنگھاسن بتیسی" کا مترجم تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے، صرف اسی حالت میں یہ امور طے شدہ صورت میں عیاں ہو سکیں گے کہ (۱) اردو "سنگھاسن بتیسی" کی زبان اس قدر ہندی آمیز ہوتے ہوئے بھی اس کی "اردو میں مستقل حیثیت" ہوتی ہے کیوں کہ یہ اسلوب اور ذخیرۂ لفظیات ہی للولال جی کوی کے اردو "سنگھاسن بتیسی" کا حقیقی و اصل مترجم ہونے کے شواہد فراہم کر رہا ہے۔

(۲) اردو "سنگھاسن بتیسی" یکساں طور پر" اردو اور ہندی دونوں کی مشترک جاگیر" ہونے کا صاف مطلب یہی ہے کہ برج "سنگھاسن بتیسی" کو للولال جی کوی نے اپنے مخصوص و منفرد اسلوب نگارش میں اردو میں لکھوا کر ہی ایسی زبردست دو رنگی عطا کر دی کہ آج اس کی یہ وسیع و عظیم حیثیت شناخت کر لی گئی ہے، اور یہ دوسرا نکتہ بھی اس امر کا ضامن ہے کہ اردو "سنگھاسن بتیسی" دراصل اور حقیقتاً للولال جی کوی کی مترجمہ ہے۔

پروفیسر گیان چند جین نے "سنگھاسن بتیسی" میں قدیم ہندوستان کے تمدنی ماحول میں مرزا کاظم علی جوان کی دخل اندازی کے بے طور اضافی اور مصنوعی حصوں کو نشان زد فرمایا تھا، ڈاکٹر عبیدہ بیگم اس نکتہ کی موید ہیں: "سنگھاسن بتیسی" کے مختلف بیانات کی خوبی یہ ہے کہ ان میں تاثیر ہے اور یہ واقعات کی صحیح تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔ ہاں داستان کے ابتدائی حصوں میں راجہ بھوج کے شہر اور محل کے بیانات قصے کی ہندوستانی فضا سے مطابقت نہیں رکھتے، انہیں پڑھ کر اسلامی عہد کے محل اور کوچہ و بازار کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ خال خال عربی کے الفاظ بھی مستعمل ہیں اور ہندی الفاظ اور لب و لہجہ کی فضا میں یہ وزن دار معلوم دیتے ہیں" (ص ۲۹۳)۔ عبیدہ بیگم صاحبہ

کے یہ تائیدی نکات بھی بہ خوبی مظہر ہیں کہ ترجمے کے کام میں مرزا کاظم علی کا عمل دخل کس درجہ محدود و مختصر تھا اور غیر متعلق سے اضافوں کے باعث یہ حصہ اثر آفرینی سے کتنا محروم رہ گیا۔

برسبیل تذکرۂ مورخین ادبیات پروفیسر اعجاز حسین اور مولانا حامد حسن قادری نیز "نگار" کے "ہندی شاعری نمبر" کے ایک مقالہ نگار احتشام رضوی کے بھی اقوال یہاں پیش ہیں جن کا تاثر یہ ہے کہ "اردو سنگھاسن بتیسی" للولال جی کوی کا کارنامہ ہے آخرالذکر کے الفاظ ہیں کہ "شاہ جہاں کے دربار کا ملک الشعرا۔ یا کوی رائے سندر تھا جس کی غیر فانی تصنیف "سنگھاسن بتیسی" سے اردو داں طبقہ بھی واقف ہے کیوں کہ اس کا اردو ترجمہ للولال جی نے انیسویں صدی کے ابتدا۔ میں کر دیا تھا۔" (ص۹۱) ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے بھی اردو میں "سنگھاسن بتیسی" کو للولال جی کوی کی مستقل تصنیف قرار دیا ہے، پروفیسر اعجاز حسین کا للولال جی کوی پر اجمالی سا تذکرہ یہ ہے: یہ گجراتی برہمن تھے، اوائل عمر میں شمالی ہند آ گئے تھے مگر اردو کے ادیب بھی تھے۔ خوش قسمتی سے اس کالج کے منشیوں میں کام کرتے تھے۔ ان کا بڑا کام یہ تھا کہ ہندی کتابوں کے ترجمے کرنے میں اردو والوں کو مدد دیں اور ہندی کی کتابیں بھی لکھیں۔ ان کی ایک مستقل تصنیف "سنگھاسن بتیسی" اردو میں بھی ہے۔" پروفیسر حامد حسن قادری نے ایک مقام پر یہ لکھتے ہوئے کہ "جوان نے للولال کو "سنگھاسن بتیسی" لکھنے میں مدد دی" (ص۱۳۲) یہ بھی تحریر کیا کہ "سنگھاسن بتیسی" للولال جی کوی کی اردو تصنیف ہے۔ چنان چہ اس کتاب پر مولانا حامد حسن قادری کا تبصرہ یہ ہے: "ایک کتاب "سنگھاسن بتیسی" للولال نے اردو میں بھی لکھا ہے" اس میں ہندی کے الفاظ بھی بہ کثرت ہیں۔ عربی فارسی کے الفاظ بھی ہیں اور طرز ادا اور اسلوبِ بیان بھی اردو کے مطابق ہے۔ یہ کتاب اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں شایع ہوئی، بار بار چھپی۔" مستقل مطبوعات کے علاوہ پروفیسر سید محمد کی اوّلین اور پروفیسر وقار عظیم کی متعاقب کتب متعلقہ فورٹ ولیم کالج نیز ڈاکٹر سہیل بخاری کی داستانی تحقیق سے وہ سب اظہارات سطور ذیل میں منقول ہیں جن سے "اردو سنگھاسن بتیسی" کے للولال جی کوی کے مترجمہ ہونے کا نظریہ قوی و مستحکم ہوتا ہے اور جن کے بعد کسی نوع کی تشکیک کا محل نہ ہوگا۔

للولال جی کوی کے حق میں محکم وحتمی آراء

پروفیسر سید محمد نے کاظم علی جوان کی تین منظوم و منثور کتابوں موسومہ "شکنتلا ناٹک" نیز "بارہ ماسہ" اور "تاریخ فرشتہ" کی تفصیل کے بعد جو معلومات آخری سطروں میں اضافہ کی ہیں ان میں سے پہلی ہی اطلاع یہ ہے کہ "۱۸۰۵ء میں جوان نے سری للولال کوی کو سندر کبیشور کی کتاب "سنگھاسن بتیسی" کے ترجمے میں مدد دی۔ للولال کوی بھی فورٹ ولیم کالج میں برج بھاشا کے مترجم تھے، ان کا حال ہم نے علاحدہ عنوان سے لکھا ہے" (ص ۲۰۰)۔ علاحدہ عنوان سے للولال جی کوی کے اپنے احوال کے آخر میں پروفیسر سید محمد نے ان کی اردو "سنگھاسن بتیسی" کا تذکرہ اور اقتباس کیا ہے جس سے اوراق ہٰذا کے نظریے کو پوری طرح تقویت حاصل ہوتی ہے: "سنگھاسن بتیسی"، "پریم ساگر"، اور "راج نیتی" کی طرح للولال کا ایک مشہور کارنامہ "سنگھاسن بتیسی" بھی ہے، اس کی بنیاد بھی سنسکرت کے کسی قدیم قصے پر رکھی گئی ہے۔ للولال نے ہندی میں اس کا بہ تغیر الفاظ و تراکیب صاف کر کے دیوناگری خط میں شایع کرایا تھا۔ اس کی مقبولیت اس قدر زیادہ ہوئی کہ اردو رسم الخط میں بھی یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے۔ اردو رسم الخط کا ایک نسخہ ہمیں ملا ہے، اس سے ایک چھوٹی سی حکایت نقل کی جاتی ہے۔ یہ اصل ہندی عبارت ہے، صرف رسم الخط بدل دیا گیا ہے"۔ (ص ۲۶۸/۲۶۷)۔

ظاہر ہے کہ ہندی ترجمے یا ناگری ایڈیشن کے لیے جو سراسر للولال جی کوی کا ہی تیار کردہ تھا انہیں کسی مددگار کی کوئی حاجت نہیں تھی بلکہ ان کے لکھوانے یا املا کرانے کے لیے اردو خط میں ضبط تحریر کرنے کی حد تک للولال جی کوی کو بہ قول خود "پارسی لکھنے والے" معاون کی ضرورت تھی جیسے کہ اردو "سنگھاسن بتیسی" کے علاوہ "شکنتلا" نیز "مادھونل اور کام کندلا" اور "بیتال پچیسی" کے بھی ترجموں کے سلسلے میں ہوا۔ پروفیسر سید محمد کے

۱۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین: "مختصر تاریخ ادب اردو"، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ص ۲۹۴/۲۹۳

۲۔ پروفیسر حامد حسین قادری: "داستان تاریخ اردو"، طبع اوّل ۱۹۳۸ آگرہ ص ۱۱۶

منقولہ بالا تاثر کے معًا بعد للولال جی کوی کی اُردو "سنگھاسن بتیسی" کے علاوہ کا متن ہے جس کے علاوہ کوئی اور ایسا حوالہ نہیں ہے جہاں کے زیر حوالہ اس اردو ترجمے کا کوئی تعلق مرزا کاظم علی جوان سے ثابت یا کم از کم ظاہر ہی کرتا ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ اتنے اہم اندراج کو اس ایڈیشن کی تعارفی سطروں میں تذکرہ نگار ممدوح نظر انداز کر دیتے۔

للولال جی کوی پر مرحوم پروفیسر وقار عظیم کی رائے تمام محققین کی کاوشوں کے نتائج سے یکسر ہی مختلف بلکہ برعکس واقع ہوئی ہے، وہ انہیں صرف ہندی داں اسکالر قرار دیتے ہیں اور اردو کا مصنف تسلیم نہیں کرتے۔ بہ ایں ہمہ بے داد سید وقار عظیم نے اپنے جائزے میں اردو "سنگھاسن بتیسی" سے ایک اقتباس "للولال کوی" سے معنون باب میں ہی پیش فرمایا ہے اور اس انتخاب سے مترشح ہے کہ ان کے ملاحظے میں موجود اردو "سنگھاسن بتیسی" کے اس ایڈیشن پر للولال جی کوی کے علاوہ اور کسی کا نام بہ طور مترجم شائع نہیں ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب مغفور کے اپنے تعارف کے الفاظ یہ ہیں: "للولال کوی فورٹ ولیم کالج کے ان اہل قلم میں سے ہیں جنھوں نے خود اردو میں کوئی تصنیف یا تالیف نہیں کی لیکن کالج کے ان اہل قلم کو جنھوں نے سنسکرت اور ہندی کی کتابیں اردو میں منتقل کیں، ان کے کام میں بہت مدد دی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندی میں جو کتابیں لکھیں ان میں سے "سنگھاسن بتیسی" اتنی مقبول ہوئی کہ اسے فارسی رسم الخط میں منتقل کر کے چھاپا گیا اور وہ اب بھی اسی طرح چھپتی ہے جیسے اردو کی دوسری پسندیدہ کتابیں۔ "سنگھاسن بتیسی" کی اصل بھی سنسکرت ہے۔" (۳۳)

گویا سید وقار عظیم بہ ذات خود اس امر کے بھی قایل نہیں کہ مرزا کاظم علی جوان نے للو لال جی کوی کے املا کروانے پر برج متن کا ترجمہ اردو خط میں قلم بند کیا بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ اولاً خود للولال جی کوی نے ہندی ترجمہ تیار اور مکمل کیا جس کی اشاعت و مقبولیت کے بعد ہی اس ہندی متن کو اردو قالب دیا گیا۔ تاہم اگلے ہی صفحے پر کچھ اور بھی اظہارات ہیں جو اس ابتدائی بیان سے مختلف ہیں۔

"للولال کوی" کی تذکرہ نگاری میں دوسرے صفحے پر سید وقار عظیم نے لکھا ہے "سنگھاسن بتیسی" پہلے سنسکرت میں تھی۔ شاہ جہاں کے درباری شاعر سندر داس کوی نے ۱۶۳۱ء کے آس پاس اس کا ترجمہ برج بھاشا میں کیا اور اسے للولال جی اور

کاظم علی جوان نے ۱۸۰۴ء میں اٹھارہویں صدی کی ہندی میں منتقل کیا اور یہ قصّہ ۱۸۰۵ء میں فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں چھپا" (ص۱۳۲) ممکن ہے یہ الفاظ بعد کا اضافہ ہوں جن کی مناسبت سے ابتدائی فقروں میں ضروری تبدیلی کا خیال نہ رہا کیوں کہ دونوں بیانات میں داخلی تضاد موجود ہے۔ قبل ازیں مرزا کاظم علی جوان" کے باب کے آخر میں پروفیسر وقار عظیم نے ارشاد کیا کہ "۱۸۰۵ء میں جوان نے للولال کوی کو "سنگھاسن بتیسی" کی ترتیب و ترجمہ میں بھی مدد دی تھی"۔ (ص۱۲۶) ان الفاظ پر مولوی سید محمد کے اس بیان کی چھاپ دکھائی دے رہی ہے کہ ۱۸۰۵ء میں جوان نے سری للولال کوی کو سندر کبیشور کی کتاب "سنگاسن بتیسی کے ترجمے میں مدد دی" (ص۲۰)۔

اردو "سنگھاسن بتیسی" کے اصلاً للولال جی کوی کے ہی مترجمہ ہونے کے حق میں ڈاکٹر سہیل بخاری کی تحقیقی تجزیہ نگاری کا فیضان یہاں بہ طور حتمی استناد پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے یہ گراں مایہ و بیش بہا تاثر ڈاکٹر سہیل بخاری نے داستانی ادبیات کی جستجو و تحقیق کے دوران للولال جی کوی کی "اردو سنگھاسن بتیسی" کو ملاحظہ کر کے ہی قایم اور تحریر فرمایا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی وقیع و موقر رائے سے "سنگھاسن بتیسی" کے اس زیر بحث اردو ترجمے سے للولال جی کوی کا تعلق بالکل الم نشرح ہو جاتا ہے اور اس بابت کلام کی گنجایش ہی نہیں رہتی ہے کہ للولال جی کوی اردو "سنگھاسن بتیسی" کے حقیقی مترجم تھے اور اس ضمن میں مرزا کاظم علی جوان کو للولال جی کوی کے صرف معاون و مددگار کی سی حیثیت حاصل تھی۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کے فیصلہ کن الفاظ کی رو سے: "سنگھاسن بتیسی" للو لال جی نے ہندی کی کتنی ہی کتابیں لکھی ہیں جن میں "پریم ساگر" سب سے زیادہ مشہور ہے جو چتر بھوج مشر کی برج بھاشا سے کھڑی بولی میں ترجمہ ہوئی اور کالج کی طرف سے ۱۸۱۰ء میں چھپی۔ انہوں نے ہندی کی کتابوں کا اردو ترجمہ کرانے میں کالج کے انشاء پردازوں کو بہت مدد دی ہے۔ اردو زبان میں بھی ان کی ایک کتاب "سنگھاسن بتیسی" ان سے یادگار ہے۔ اس کی بنیاد سنسکرت کے ایک قصے پر رکھی گئی ہے۔ ۱۶۳۱ء میں عہد شاہ جہانی میں سندر داس کوی نے اس قصے کو سنسکرت سے برج بھاشا میں منتقل کیا تھا۔ برج بھاشا کے نسخے سے للولال جی اور کاظم علی جوان نے مل کر ۱۸۰۴ء

میں اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۵ء میں اردو اور ہندی دونوں لپیوں میں چھاپا گیا۔ اس میں عربی فارسی کے کم اور ہندی کے الفاظ زیادہ استعمال کیے گئے ہیں اور یہ للو لال جی کوی کا فیضان ہے جیسا کہ اس سے قبل کے اردو ترجموں میں بھی ہوا ہے۔" (صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۵)۔

راقم للولال جی کوی کی اردو "سنگھاسن بتیسی" پر جاریہ مباحثے کے نکتہ اختتامیہ کے بہ طور مرزا کاظم علی جوان کے اپنے "سبب تالیف" کے الفاظ پر ناظرین کی سنجیدہ توجہ منعطف کرانا چاہتا ہے۔ جوان نے اپنے تیار کردہ یا بنظرِ ثانی شدہ علاحدہ متن کے متعلق ہرگز یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انھوں نے خود سندر کبیشور کے برج متن سے "ترجمہ" کیا بلکہ صرف ایک محدود سا ادعا ان کا ہے کہ انھوں نے "سنگھاسن بتیسی" کی یہ کتاب "محاورۂ خاص و عام میں اہلِ ہند کے لیے لکھی" جس کا کل ملا کر ایک ہی مطلب اخذ کرنا ممکن ہے یعنی یہی کہ للولال جی کوی کے ترجمہ املا کروانے کے بعد انھوں نے اپنے قلم بند کیے ہوئے اسی ترجمے کو اپنے طور پر علاحدہ سے ایڈٹ کیا جس کی جانب سید جمیل نقوی کے اشارات پیش ہو چکے ہیں اور جس کے اثرات کی پروفیسر گیان چند نے نشان دہی بھی کی۔ شعبے کے اردو داں افاضل اگر بھاکا اور ناگری تحریر سے بہ خوبی واقف ہوتے تو ان "پارسی لکھنے والوں" کو للولال جی کوی سے سن سن کر اردو میں ترجمہ لکھتے جانے کی چنداں ضرورت نہ لاحق ہوتی۔ اس کے برعکس للولال جی کوی کے بھاشا سے اردو میں املا کروانے کے عمل کے ہر طرح کے اور کثیر ثبوت اس اردو "سنگھاسن بتیسی" کے علاوہ "بیتال پچیسی" نیز "مادھونل کام کندلا" اور "شکنتلا" کے بھی بارے میں موجود ہیں جو واضح اور قطعی ہیں۔ "سنگھاسن بتیسی" میں مرزا کاظم علی کے حصے کے تعلق سے "شکنتلا" میں ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا یہ بیان بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ "اس ترجمے میں للو لال جی کوی بھی جوان کے شریک تھے۔ للوجی کے ذمے برج بھاشا کے دوہوں کو پڑھ کر جوان کو سمجھانا تھا، جوان اسے سمجھ کر اپنی زبان میں لکھا کرتے تھے" (صفحہ ۲۴۹)۔ اس خصوص میں پروفیسر عبادت بریلوی سے بھی سند پیش کی جا چکی ہے۔

غالباً للولال جی کوی کے مترجمہ اردو "سنگھاسن بتیسی" پر اس سلسلۂ بحث کو کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں ہے تاہم اختلافِ خیال ایک قدرتی امر ہے

اور تحقیق مزید اسی کا لازمی نتیجہ۔ البتہ یہ حقیقت ہمیشہ ہی ذہن نشین رکھنی ہو گی کہ فورٹ ولیم کالج میں کوئی اردو داں اسکالر تنہا اور اپنے طور پر بحاشا زبان اور ادب سے ترجمے کی غرض سے کجا محض مطالعے کی حد تک بھی اکتساب کی استعداد نہیں رکھتا تھا۔ یہ امر واقعہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اس عقدے کو حل کرنے کی کلید یہی ہے وگرنہ یہ گتھی سلجھ نہیں سکے گی۔

"سنگھاسن بتیسی" جائزہ نگاری

"سنگھاسن بتیسی" پر ادبی تبصرے

ہندوستانی تاریخ کے کلاسیکی ادوار کے معاشرے کو ان حکایات کے وسیلے سے نئی زندگی بخشنے اور سنسکرت ادب میں ان سماجی جھلکیوں کو محفوظ کر دینے کی جو شعوری کوشش کی گئی ہے اس نے محققین کی توجہات اپنی جانب بجا طور پر مرکوز کرائی ہیں۔ پند و موعظت کا خشک کام اصل داستان نگار نے شگفتہ و بلیغ اسلوب سے لیا جو بعد کے بھی ناقلین نے قدرتاً اپنایا۔ اس طرح ازمنۂ قدیم کا سماج ان کہانیوں میں صرف منتقل ہی نہیں بلکہ محفوظ بھی ہو گیا اور روایتی اخلاقیات کے سنجیدہ و متین نکات شگفتگی کے ساتھ ایک موثر طریقے سے ارکانِ حکومت سے لے کر قارئین تک کے استفادے میں آسکے۔ پروفیسر گیان چند "سنگھاسن بتیسی" کی قدامت و تاریخیت کے اس بڑے اہم پہلو یعنی معاشرتی منظر نگاری اور راوی کے مشاہدات کی باریک بینی کی قدر و قیمت کی طرف اختصار سے اشارہ کناں ہیں: "اس کتاب میں قدیم ہندو معاشرت کے مرقعے ہیں۔ وہ معاشرت نہیں جو تاریخ میں ہندو راجاؤں کے عہد میں پیش کی جاتی رہی ہے بلکہ اس سے بھی قدیم جو مذہبی کتابوں اور سنسکرت ادب میں ملتی ہے۔ محل، جلسے، ملبوسات، انتظام سلطنت، رسوم، توہمات، مندر وغیرہ مختصر طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں" (ملـ ۲۰۹)۔

اس جھلک کی جو کچھ تفصیل ہم دست ہے اس سے ظاہر ہے کہ اصل مصنف نے بظاہر وقتی ضرورت کے ماتحت لیکن بڑی بصیرت افروز دور بینی کے ساتھ یہ کہانیاں اس طرح حکایت کی ہیں کہ اس کی پیش بینی کا فائدہ بہ یک وقت ادبی اور سماجی تاریخ کے دل کش تمدنی ریکارڈ یا مسالے کی صورت میں پشت با پشت بعد ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ بادی النظر میں ان کا مقصد اولین کالی داس کے سرپرست بکرم اجیت یا وکرم آدتیہ یا بکرما جیت کی شخصی سیرت نگاری تک محدود ہے لیکن یہ حیثیت راجا در بہ طور

ایک آدمی اس کی حکمت اور مردانگی دونوں کے جوہر کے واقعاتی ثبوت ایک ایک کر کے سامنے لانے کے دوران وہ راجا وکرم کے عہد کے سماج کا ایک رنگین شیش محل تعمیر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح سے کہانیوں کا خالق ادب میں ویر وکرم کو مرکزی کردار یا ہیرو کے بہ طور پیش کرنے والی "بیتال پچیسی" کے اصل مصنف کی طرح بیر وکرم کے دور کے ایسے نقوش مرتسم کرتا ہے جو معاشرتی تاریخ کی گویا ایک قدر بن جاتے ہیں۔ اس سے شاید ہی انکار کیا جا سکے گا کہ کالی داس کے بعد "سنگھاسن بتیسی" کے کہانی کار نے ویر بکرم کے نام اور کام کو زندہ رکھنے اور دوام بخشنے کا وہ کارنامہ سرانجام دیا جو روایتی تواریخ نویسی کے دائرے سے باہر سماجی و ادبی تاریخ کی اس صورت گری کے طور پر جریدۂ عالم پر ثبت ہو گیا۔

پروفیسر گیان چند کا اردو "سنگھاسن بتیسی" پر ایک تاثر یہ ہے کہ "یہ ان چند قصوں میں سے ہے جو سنسکرت الاصل ہیں اور فارسی کے دوش پر ہاتھ رکھ کر نہیں برج بھاشا کی انگلی پکڑ کر ہم تک آتے ہیں اور راہی شکل میں آتے ہیں" (ص ۳۱۲)۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم اس خیال کو کہانیوں کی سماجی قدر کی بنیاد کے طور پر ہندوستانی معاشرے کی تاریخ قدامت سے ہم رشتہ قرار دیتی ہیں: "چوں کہ "سنگھاسن بتیسی" فارسی کے بجائے برج بھاشا سے اردو میں آئی ہے اس لیے اس میں ہندی معاشرت اور تہذیب و تمدن کے نقوش بڑے گہرے ہیں۔ اوّل تو بنیادی قصہ ہی ہندوستانی سرزمین سے ماخوذ ہیں، دوم فارسی سے ترجمہ نہ ہونے کی بنا پر اس کے ہندوستانی خدوخال مسخ نہیں ہوتے۔ "سنگھاسن بتیسی" کی ضمنی کہانیاں ہندو معاشرت رسوم و عقاید کے بے حد نادر مرقعے پیش کرتی ہیں، یہ مرقعے ہماری ہزار سالہ تہذیب و تمدن کے نقوش ہیں" (ص ۲۶۱)۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم صاحبہ نے متصل سطور میں ذیلی افسانوں کی خصوصیات کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ بھی فاضلانہ تبصرہ کیا ہے کہ "سنگھاسن بتیسی" کی ضمنی کہانیاں حکایتوں یا مختصر داستانوں کے دیگر مجموعوں سے قدرے مختلف ہیں۔ یہ ضمنی کہانیاں اپنی ساخت اور خدوخال میں مکمل اور آزاد نہیں ہیں، یہ صرف راجا بکرماجیت کی کسی ایک خوبی کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کہانیوں میں بعض کہانیاں بے حد مختصر ہیں، بعض رومانی کہانیوں کی نمایندگی کرتی ہیں۔ یہ کہانیاں ہندو اساطیر سے بھی متاثر ہیں، ان میں فوق فطرت عناصر کی کارفرمائی بھی ملتی ہے۔ سنسکرت کے قدیم قصوں کی طرح "سنگھاسن بتیسی" کی ضمنی کہانیوں

میں بھی عورتوں کی بے راہ روی بیان کی گئی ہے۔ اکیسویں کہانی میں فنونِ لطیفہ کی باریکیوں اور نزاکتوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان سب سے قطع نظر ان ضمنی کہانیوں میں اخلاقی درس اور تجربات و مشاہدات کا ایک جہان پوشیدہ ہے" (ص ۲۶۱) گویا "سنگھاسن بتیسی" کا بنیادی جوہر قدیم ہند کی دانش کا مجموعۂ زیبا ہے جس کے جلو میں پراچین سنسکرتی یا تہذیب رفتہ کی جابجا مصوّری کا حق ادا کر دیا گیا ہے اور جزئیات نگاری کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا گیا ہے۔

"سنگھاسن بتیسی" کا "بیتال پچیسی" کے ساتھ تقابل بھی توجہ طلب ہے اور مختصراً سہی اس پر بھی مختلف خیالات محلِ اکتساب ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اس جانب اشارہ فرمایا ہے کہ "کتاب پر ہندو دیومالا اور قدیم ہندو معاشرت و تہذیب کا "بیتال پچیسی" سے کچھ زیادہ ہی اثر ہے" (ص ۱۳۵) جب کہ پروفیسر وقار عظیم کی رائے بھی مماثل سی ہے: "اس مجموعے کی کہانیوں کی فضا۔ اور ماحول اور پس منظر بھی "بیتال پچیسی" کی کہانیوں کی طرح خالص ہندوستانی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے تخیل فکر اور اسلوب کے لحاظ سے یہ مجموعہ "بیتال پچیسی" سے کم تر درجے کا ہے" (ص ۱۳۴)۔ پروفیسر گیان چند نے اسی نقطۂ نظر کا اظہار خاصا قبل کیا ہے کہ "سنگھاسن بتیسی" "بیتال پچیسی" سے کم رتبہ سمجھی جاتی ہے، اس کی کہانیاں "بیتال پچیسی" کے مقابلے کی نہیں۔ اردو افسانوں میں اس کی اہمیت نہیں لیکن اس کا جائزہ لینا اس لیے ضروری تھا کہ یہ ان چند قصوں میں سے ہے جو سنسکرت الاصل ہیں" (ص ۳۱۲)۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم اس خیال سے پوری طرح متفق ہیں اور ڈاکٹر گیان چند جین کے اسی تاثر کو (بہ صفحہ ۲۶۳) اقتباس کر کے وہ پروفیسر جین کے تبصرے کو "بے حد جامع رائے" قرار دیتی ہیں۔

محسوس یہ ہوتا ہے کہ "سنگھاسن بتیسی" کو خاص کر "بیتال پچیسی" کے بالمقابل کسی بھی لحاظ سے کم تر و کم رتبہ گردانے میں "سنگھاسن بتیسی" سے کچھ نہ کچھ ناانصافی یا زیادتی یقیناً ہو گئی ہے اور اس باب میں کتاب کے مندرجات اور قبولِ عام ایسے عوامل سے صرفِ نگہ کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا گیا ہے۔ ایک تو "سنگھاسن بتیسی" میں جیسا کہ ان کتابوں کے عنوانات مظہر ہیں کہانیوں کی تعداد زیادہ ہے اور اگر اس نکتے کو نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ حکایات کا کم یا زاید ہونا برتری یا کم تری کی کوئی وجہ نہیں تب بھی "سنگھاسن

بتیسی" کی چند خصوصیات کا اعتبار تو کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہی کہ اس کتاب کی کہانیاں خوف یا دہشت کی فضا میں لپٹی ہوئی نہیں ہیں جو "بیتال پچیسی" کو غیر دل چسپ بنا دیتی ہیں۔" بیتال پچیسی کے واقعات میں حرکت اور عمل کی کمی ہے جب کہ "سنگھاسن بتیسی" مہم جو یانہ کارگزاریوں کی داستان طرازی کا مجموعہ ہے۔ پر جوش واردات اور مہمات جس مہارت اور خوب صورتی سے "سنگھاسن بتیسی" میں جمع کر دی گئی ہیں وہ اس کو پر اسرار عجمی رنگ کی داستانوں سے قرابت قریبہ مہیا کر دیتا ہے۔ ابتدائی نکتے یعنی تاریخیت کی روشنی میں پرکھنے پر "سنگھاسن بتیسی" کی تہذیبی قدر بہت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جو اس کو ایسے اور ہندوستانی مجموعہ خاص کر "بیتال پچیسی" سے ممتاز و برتر کرنے کے لیے بہت کافی ہے۔ موجودہ دور میں اگر یہ یک وقت دونوں ہی قصوں کی فلمیں بنائی جائیں خواہ سنیما گھر کی یا ویڈیو والی تو تمدنی جھانکیوں اور مہماتی انداز کے علاوہ عشق و محبت کی رنگینی اور کہانیوں کی دوسری خوب صورتیوں کی بنا پر "بیتال پچیسی" کے مقابلے میں کہیں زیادہ کام یابی و مقبولیت "سنگھاسن بتیسی" کو حاصل ہو سکے گی۔ تہذیب رفتہ کی دل کش عکاسی اور تمدن پارینہ کی منظر کشی کے باوجود "سنگھاسن بتیسی کو نسبتاً کم درجہ و کم تر قرار دینے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ یہ امر نا قابلِ فہم ہے۔ الغرض یہ خیال کہ "مجموعی حیثیت سے تخیل فکر اور اسلوب کے لحاظ سے "سنگھاسن بتیسی" کو کم رتبہ و کم عیار گردانا جائے کسی طور قابلِ قبول نہیں مانا جا سکتا کیوں کہ "سنگھاسن بتیسی" کے نفسِ موضوع اور مشمولات کو "بیتال پچیسی" پر کئی ایک زاویوں سے تفوق و امتیاز حاصل ہے۔

"سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" کے باہمی مقابلہ و مقایسہ کے دو اہم رخ ہند قدیم کی تمدنی تاریخیت اور ہندو صنمیات کی مشترک اقدار سے متعلق ہیں۔ تمدنِ ہند کی قدیمی تاریخیت کے حوالے سے پروفیسر گیان چند نے ثانی الذکر کتاب کے جائزے میں ارشاد کیا ہے: "اردو میں ہندو تہذیب کے نقشے بہت کم ہیں۔ "بیتال پچیسی" اور "سنگھاسن بتیسی" جیسی کتابیں شوکتِ پارینہ کی ایک جھلک دکھاتی ہیں۔ ان سے ہند قدیم کی شادابی کا حال معلوم ہوتا ہے" (تمہ ۲)۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہوگا کہ تہذیبی شوکت و حشمت کے مظاہر کے بیان میں "سنگھاسن بتیسی" کو بلاشبہ فوقیت حاصل ہے اور اس میں

جزئیات نگاری کے اہتمام کے باعث قدیم ہند کی شوکتِ رفتہ کی جھانکیاں زیادہ خوبصورتی و دل کشی کے عناصر کا مجموعہ بن گئی ہیں۔ ملبوسات سے لے کر تعمیرات تک کے کروفر نیز فنون لطیفہ اور علوم و ہنر کے بیانات کو اس کتاب کی متصل و مسلسل کہانیوں میں تفصیلی طور پر خصوصی مہارت اور رنگینی سے جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ تہذیبی سطح پر ازمنۂ رفتہ کی شان و شوکت کا ایک مجموعۂ جمیل و زیبا تیار کرنے میں خوب خوب ممد و معاون ہوا ہے۔ یہ ادبی تقابل ہندو مایتھالوجی کے خاص حوالے کے بغیر کبھی مکمل نہیں سمجھا جاسکتا جس کی جانب پروفیسر گیان چند کے علاوہ ڈاکٹر شہناز انجم نے اپنے مفید علمی جائزوں میں خاصے قیمتی اشارے کیے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند جینؔ "سنگھاسن بتیسی" پر ہندو علم الاصنام کی اثراندازیوں کو نسبتاً زیادہ خیال فرماتے ہیں: "ان کہانیوں میں دیومالا کا گہرا اثر ہے"۔ "بیتال پچیسی" سے زیادہ پاتال، اندر لوک، اندر، سمندر دیوتا، چاند دیوتا، شیو، شیش ناگ، جم کے دوت، دیوی، گندھرو، یہ سب باربار رونما ہوتے ہیں۔ کنکالن، دیت، بیتال وغیرہ فوق فطری مخلوقات ہیں۔ دیوتاؤں جوگیوں اور بیتالوں سے جابہ جا کراماتی تحفے ملتے ہیں۔ مثلاً ایسی تھیلی کہ اس میں سے کھانے کی جو چیز چاہو نکال لو، ایسی چھڑی جسے لینے والا سب کو دیکھے اور کوئی اسے نہ دیکھے، ایسا لعل جس سے جتنی دولت چاہو مل جائے۔ بکرم کو ایسے متعدد تحفے ملتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ فراخ دلی سے کسی نہ کسی حاجت مند کو دان دے دیتا ہے" (۳۰)۔ یہاں مثلاً ہاتھ کی چھڑی ہند ایرانی داستانوں کی اس ٹوپی کے تخیل سے مشابہت ہے جس کو پہننے والا خود دوسروں سے روپوش ہو کر محفوظ رہتا ہے اور ساری دنیا میں بلاخوف و خطر گشت کرتا ہے۔ اس زاویے ہندی الاصل کہانیوں کا مشہور و معروف عرب ایرانی داستانوں سے مفصل تقابل ایک دل چسپ اور اہم پہلو بن سکتا ہے۔

" سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" کے تقابلی مطالعے کی ایک اور جہت کو ڈاکٹر شہناز انجم روشن ترکرتی ہیں جس سے اس تاثر کو تقویت ملتی ہے کہ "سنگھاسن بتیسی" کو ثانی الذکر کی نسبت سے کم درجہ باور کرنا نہ تو کسی طور قرین انصاف ہوگا اور نہ ہی کسی رُخ سے قرین واقعہ۔ صاحبہ موصوفہ کا یہ فرمودہ وقیع اور بہت بڑی حد تک منصفانہ ہے کہ "سنگھاسن بتیسی" اردو کے کلاسیکی ادب میں اہم درجہ رکھتی ہے۔ گرچہ یہ خالص

اردو کی تصنیف نہیں ہے۔ اس میں بھی ہندی و سنسکرت الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ اس کا ماخذ بھی سنسکرت الاصل کہانیاں ہیں اور اس میں بھی قدیم ہندو معاشرت اور تہذیب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مگر "بیتال پچیسی" کی طرح یہ بھی ہندی اور اردو نثر کی مشترکہ ادبی روایت کا عمدہ نمونہ ہے جو سنسکرت و برج بھاشا کے توسط سے اردو میں آیا" (ص ۱۷۹)۔ ڈاکٹر شہناز انجم نے اپنا تجزیہ جن الفاظ پر ختم کیا ہے وہ اردو "سنگھاسن بتیسی" کا ادبی رتبہ و مقام قرار واقعی طور پر متعین کرتے ہیں اور ان کے مطابق کتاب کی "عبارت میں بیان کی چستی اور روانی پورے طور پر شادابی اور لطافت کو سمیٹے ہوتے ہے۔ یہ بے ساختگی شیرینی اور تشبیہات کی یہ ندرت اردو انشار پردازی کا کمال ہے جو یہاں خالص ہندوستانی رنگ میں نمایاں ہو رہا ہے۔ ان ہی تمام باتوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "سنگھاسن بتیسی" بھی ہندی کی میراث سمجھی جاتے مگر اردو کی ادبی روایت سے بھی اس کا رشتہ مستحکم ہے" (ص ۱۸۱/۱۸۲)
یہ بیان اس نوع کی آرا کی محکم انداز میں تردید کے لیے کافی و شافی ہے کہ "خدانخواستہ "سنگھاسن بتیسی" کا ادبی رتبہ کسی طور کمتر واقع ہوا ہے۔ اس بارے میں تشکیک و اشتباہ کا تاثر "سنگھاسن بتیسی" کی تفصیلات و جزئیات کے ظاہرانہ جائزے تک سے عاری معلوم ہوتا ہے اور بھرپور تجزیے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

اردو "سنگھاسن بتیسی" میں بہ قول پروفیسر گیان چند جو "بھاشا کا مٹھاس موجود ہے" وہ کسی قدر اس امر کی روشن دلیل ہے کہ یہ کتاب دراصل للولال جی کوی کی مترجمہ ہے اس بارے میں عرض کیا جا چکا ہے۔ بھاشا کی مٹھاس کے پہلو بہ پہلو اس کی سادگی و پرکاری سے بھی کتاب معمور و متصف ہے جس کی طرف پروفیسر جین کے ملاحظات عمدہ اشاروں سے مملو ہیں: "بھاشا کا مٹھاس موجود ہے ہر چیز کا سماں نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ کوئلوں کے کوکنے کی آواز آرہی ہے ہوا کے نرم نرم جھونکے محسوس ہو رہے ہیں۔ سب پھول پرندے ہمارے جانے پہچانے ہیں' ہر چیز ہندوستانی ہے یہاں نہ کوئی صناعی ہے نہ معنی بندی مگر پھر بھی بیان موثر ہے۔ اس کے مقابلے میں "فسانہ عجائب" کے باغ کا طلسم یاد کیجیے۔" "سنگھاسن بتیسی" میں حسینوں کا سراپا بھی اسی طرز میں ہے۔ (اقتباس) ہرن کی آنکھیں' چیتے کی کمر' ہنس کی چال' ان کی کیا

تعریف ہو۔ اسی رنگ میں ہر ایک برہ کے مارے یوگی کا حالِ زار بھی دیکھیے (اقتباس) یہاں ہجر کے بیان میں کوئی لطیفے کوئی اعجوبے نہیں بیان کیے گئے، پھر بھی ایک جھلسی ہوئی شکل آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ان بیانات میں لکھنے والوں نے زورِ طبیعت کی نمود نہیں کی پھر بھی تاثیر سے بھرپور ہیں۔ یہی ادب کا مقصد ہے" (ص ۳۱۱)۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے آخری وقیع و موقر کلمات کو رہ نما کرتے ہوئے عرض کیا جاسکتا ہے کہ اردو "سنگھاسن بتیسی" کے خالق نے ادب کے اعلا مقاصد کی ہی خاطر اپنی روشنی طبع کا فیضان اس ترجمے کے قالب میں منتقل کیا اور بہر اعتبار اس کو ایک اونچے مرتبے کی نگارش بنانے میں وہ یقینی طور پر کامیاب رہے۔

فنِ افسانہ کے لحاظ سے اردو "سنگھاسن بتیسی" کی حکایات کا کیا مقام ہے پروفیسر گیان چند نے اس پر مختصر یہ رائے دی ہے کہ "سنگھاسن بتیسی" میں پتلیاں جو قصے سناتی ہیں وہ فنی اعتبار سے مکمل افسانے نہیں۔ ان سب کا مقصد بکرم کی سخاوت یا شجاعت یا کسی اور وصف کا راگ گانا ہے۔ بعض بعض کہانیاں جو زیادہ مختصر ہیں محض واقعہ نگاری ہو کر رہ جاتی ہیں" (ص ۳۰) جیسا کہ پہلے اقتباس ہوا ہے ڈاکٹر عبیدہ بیگم بھی پروفیسر جین کی ہم خیال ہیں۔ شاید یہ اشتباہ اس زمانے کے فن کو عہدِ موجود کے سانچے یا پیمانے سے جانچنے پرکھنے کی بنا پر ہوا ہے ورنہ دورِ حاضر کی اصطلاحات کے اطلاق کا اگر سوال ہے تو پھر ان کہانیوں کو اس زمانے کے افسانے ہی کہا جائے گا۔ رہا یہ سوال کہ آیا ان دنوں کے یہ افسانے جو ایک داستان کی لڑی میں پروئے ہوتے ہیں بہ لحاظِ فن "مکمل یا بھرپور" ہیں یا نہیں تو اس لحاظ سے خود آج کی لاتعداد نہیں تو کم از کم متعدد کہانیوں پر بھی یہ شک کیا جاتا ہے کہ وہ "مکمل" افسانے بھی ہیں یا نہیں؟ اس حقیر سے جملہ معترضہ کے قطع نظر یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے کہ خود فورٹ ولیم کالج میں تخلیق ہونے والے فکشن کے معیارات کی رو سے "سنگھاسن بتیسی" کے افسانے مکمل افسانے ہی ہیں۔ اگر ان میں سے ہر ایک کو مجرداً اور فرداً فرداً دیکھا جائے۔ چناں چہ ان دنوں کی ادبی و اظہاری سطحوں سے اردو "سنگھاسن بتیسی" میں کوئی ایسی عدم مطابقت یا پھر عدم موافقت نہیں پائی جاتی ہے کہ ان کو ان کے معاصر تخلیقی پس منظر میں نامکمل یا غیر فنی باور کیا جاسکے۔

اس خصوص میں ڈاکٹر شہناز انجم نے اپنے مفصل تاثر میں داستانی ادبیات میں "سنگھاسن بتیسی" کی قیمت اور وقعت متعین کرتے ہوتے جو اظہار کیا ہے اس سے بہ مشکل ہی اختلاف ہوگا کہ "ان کہانیوں پر بھی ہندو دیومالا اور ہندی لوک کتھاؤں کا اثر پایا جاتا ہے۔ تمام کہانیاں پند و نصائح کے رموز سے بھری ہوئی ہیں لیکن دیگر داستانی لوازم مثلاً تحیر تجسس اور مافوق الفطرت واقعات بھی ہیں اور طرز بیان کے اعتبار سے انشاء پردازی کے اچھے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ادبی اعتبار سے "سنگھاسن بتیسی" کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس کی نثر سیدھی سادی ہونے کے علاوہ شگفتہ اور لطیف بھی ہے۔ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کی خوب صورت آمیزش بھی ہے اور زبان و بیان کے نئے تجربے بھی موجود ہیں۔ یہ نثر صرف دل کو انبساط اور خوشی ہی مہیا نہیں کرتی بلکہ ذہن کو بھی دعوتِ فکر دیتی ہے اور عقل و فراست کے رموز بھی سمجھاتی ہے۔ داستانی لحاظ سے اس میں قصہ کہانی والی دل چسپی اور تحیر و تجسس موجود ہے۔ عام فہم اور لطیف تشبیہات اور ہلکے پھلکے استعارے بھی ملتے ہیں۔ جملوں میں طوالت اور پیچیدگی کی جگہ اختصار اور سادگی ہے۔ یہاں منظر نگاری کے بھی اچھے نمونے ملتے ہیں اور تہذیب و معاشرت سے اس نثر کا رشتہ جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ تخیل کی بلندی کے ساتھ واقعات کی سچی کیفیات اس نثر کو جان دار اور پرکشش بناتی ہیں"۔ (صفحہ ۱۹۰/۱۹۱)۔ اس سے آگے ڈاکٹر شہناز انجم نے اپنی تجزیہ نگاری میں اضافے کیے ہیں:

"عبارت میں بے جا ثقل اور بوجھل پن نہیں ہے البتہ مقفیٰ نثر کا انداز جھلکتا ہے مگر روانی اور ٹھہراؤ کا بھی خوب صورت امتزاج ہے۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس نثر میں "بیتال پچیسی" جیسا تاثر اور روانی نہیں ہے۔ زبان بھی اس کے مقابلے میں زیادہ ہندی آمیز ہے مگر یہ زبان ہندوستانی یعنی اردو ہی ہے۔ اس میں استعمال ہونے والی زبان سے اردو نثر کے ذخیرۂ الفاظ میں بھی اضافہ ہوا ہے اور اسلوب میں گھلاوٹ اور سادگی کی روایت کو بھی بڑھاوا ملا ہے۔ اس قصے کی فضا۔ اگرچہ زمانہ قدیم کے ہندوستان کی فضا ہے مگر قاری وہاں خود کو تنہا نہیں پاتا۔ ماحول اور کہانیوں کے کردار سب اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ طرز بیان میں شگفتگی اور حلاوت ہے۔ تشبیہات لطیف اور خوب صورت ہیں (صفحہ ۱۹۱)۔

"سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" کے بھی ہیرو کے متعلق یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ اپنی اصل لغوی ترکیب میں یہ نام "وکرماجیت" یا "بکرماجیت" نہیں ہے جیسا کہ اردو کی لکھائی میں عرصے سے رائج چلا آرہا ہے۔ ایک تو ہمارے یہاں برصغیر کی ایک دوسرے سے ملتی جلتی زبانوں میں "بے" اور "واو" کی آوازوں کا تبادل اتنا عام اور اس کی مثالیں اتنی کثیر ہیں کہ اب شاید ہی اس کی کوئی اہمیت باقی رہ گئی ہو کہ کون سے نام یا لفظ کو "بے" سے بولنا لکھنا چاہیے۔ اور کس لفظ یا نام کو "واو" سے ادا کرنا چاہیے۔ واو اور بے کے تبادل سے بہ یک وقت دونوں روپوں، بہروپوں کے استعمالات اس قدر بہ کثرت ہیں کہ یہاں ان کی مثالوں کا احاطہ ممکن ہی نہیں ہے، صرف اس جائزے میں یہ تین نام بے اور واو کے ادلتے بدلتے املا کے ساتھ درج ہوتے ہیں: بکرم وکرم نیز بیرو بیا اور بلاس ولاس۔ دوسرے یہ کہ راجا کے نام وکرماجیت یا بکرماجیت کا آخری جزو "اجیت" یعنی جسے کوئی جیت نہ سکے (نفی کا عام سابقہ = ا+جیت) اس کا تاریخی خطاب یا لقب ہے اور اس طرح یہ نام اپنی اصل صورت میں "وکرم اجیت" اور یا "بکرم اجیت" ہے جو ادغام کے لسانی عمل سے گزر کر "بکرماجیت" اور "وکرماجیت" ہو چکا ہے۔ یہاں اس اشارے سے یہ ہرگز مقصود نہیں ہے کہ لسانی ادغام کے عام عمل سے صرف نگہ کر کے دونوں اجزاء کو الگ الگ وکرم جیت اور یا بکرم اجیت لکھا یا ادا کیا جائے تاکہ اصل سے قریب تر ہو کیوں کہ اصل تک اگر پہنچنا ہی ہو تو بکرم آدتیہ اور وکرم آدتیہ کو جیسا کہ ادا کرنا ہوگا جو خواہ کتنا ہی حقیقت سے نزدیک کیوں نہ ہو اردو میں زیادہ اجنبی اور غیر مانوس ہو جائے گا۔ ہمارے یہاں ایک عجیب و غریب سی روایت ہے کہ کچھ لوگ بعض عربی ناموں اور الفاظ کو اردو کے مقبولِ عام رواج کے برعکس عربی قاعدے کی رو سے ادا کرنے کا بالاصرار مطالبہ کرتے ہیں اور زبانوں کے آفاقی قاعدے کے ماتحت ان کے مروجہ اردو تلفظ کو رد کر کے خالصتاً عربی تلفظ کو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی دو عام مثالیں بیت المقدس اور اخوان المسلمین کے الفاظ ہیں جن کو مسلِمین کے بجائے مسلمون اور مقدس کے بجائے "مَق دِس" کہنے کے لیے اصرار کیا جاتا ہے جس کا مطالبہ کرنے والے یہ نکتہ فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ اردو میں مقدس کے سیدھے سادے اور مقبولِ عام و خاص لفظ کو "مَق دِس" کہنا کتنا مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ اردو میں عرصۂ دراز سے رائج و مشہور تلفظ کی

مناسبت سے وکرماجیت اور بکرماجیت نیز شکنتلا اور بنارس بولنا اور لکھنا ہی درست اور ضروری ہے نہ کہ بکرم اجیت اور وکرم اجیت نیز سکنتلا اور وارانسی جو خواہ اپنی اصل کے مطابق اور قریب ہوں۔

آخر میں پروفیسر گیان چند جین کے وہ مختصر مفید ملاحظات اقتباس کیے جاتے ہیں جو متفرق مقامات سے مستفاد ہیں اور جن میں "سنگھاسن بتیسی" کے مختلف انفرادی اور تقابلی قسم کے زاویے روشن تر ہوتے ہیں۔ ایک ابتدائی موقع پر ہندوستانی افسانوں کی تاریخی ترتیب سے بحث کے دوران ص۱۴ سے لکھا ہے: "بارہویں صدی تک "شک سپتتی" لکھی جا چکی تھی، یہ "توتا کہانی" کی اصل ہے لیکن سنسکرت میں اس کتاب کی اہمیت نہیں۔ بارہویں اور چودہویں صدی کے درمیان "بیتال پچیسی" مرتب ہوئی لیکن اس سے پہلے یہ شیمیندرا اور سوم دیو (مصنف "کتھا سرت ساگر") کی کتابوں میں بھی شامل تھی تیرہویں صدی میں یا اس کے بعد "سنگھاسن بتیسی" تصنیف ہوئی۔ ان سب کتابوں میں مختلف کہانیوں کو ایک بنیادی کہانی کے ذریعے منسلک کر دیا گیا ہے۔ بعض کہانیوں میں قصہ میں سے شاخسانہ نکال کر ضمنی کہانی شروع کر دی جاتی ہے۔ قصہ در قصہ کی تکنیک خالص ہندوستانی ہے۔ جن داستانوں میں یہ پائی جاتی ہے ان کا مولد ہندوستان مان لینا چاہیے۔" داستانی ادب کے لازم و ملزوم اجزاء پر نظر کرتے ہوئے ایک پہلو مافوق فطری عناصر یا قوتوں کا بھی سامنے آتا ہے: "مختصر داستانوں کے مجموعوں میں "توتا کہانی" "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" ممتاز ہیں ان سب میں کہیں نہ کہیں فوقِ فطرت کی کارفرمائی ملتی ہے جس سے غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہ جزو لاینفک ہی داستان کا امتیازی رنگ ہے۔ لیکن جیسا کہ پیچھے واضح کیا گیا فوقِ فطرت عنصر داستان کی جبلت کا جزو نہیں (ص۵۲)۔ ضمنی انواع میں "سنگھاسن بتیسی" کا شمار رومانوں میں کیا ہے: "حکایت کے بہترین نمونے "کلیلہ و دمنہ" میں اور "توتا کہانی" کی جس کہانیوں میں ہیں رومانی کہانیوں کی نمایندگی "سنگھاسن بتیسی" "بیتال پچیسی" اور "توتا کہانی" کی بیش تر کہانیوں سے ہوتی ہے۔ داستان کے سب سے اچھے نمونے "باغ و بہار" اور "داستان امیر حمزہ" ہیں" (ص۵۵)۔ اس کی توجیہہ ص۵ پر ملتی ہے: "اصل دل چسپی کی حامل ضمنی کہانیاں ہوتی ہیں، اس قسم کو ہم نے رومانی کہانیوں کا مجموعہ کہا ہے — "سنگھاسن بتیسی"

میں بتیس پتلیاں ایک ایک کہانی سناتی ہیں۔ ان کا پلاٹ محض ابتداء اور خاتمے کا بنیادی قصہ ہے جو پانچ چھ صفحوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ درمیانی کہانیاں محض ضمنی کہانیاں ہیں"۔

سنسکرت الاصل داستانی سلسلوں پر قدیم ہندوستانی معاشرہ و تمدن کے اثرات کی نشان دہی میں چند سطور: "چند افسانے سنسکرت سے بھی ترجمہ ہوتے ہیں۔ "سنگھاسن بتیسی" "بیتال پچیسی" "مادھونل" "شکنتلا" ان میں قدیم ہند کے جلوے باقی ہیں۔ "طوطا کہانی" اور "کلیلہ و دمنہ" کی اصل بھی سنسکرت ہے۔ لیکن چوں کہ یہ فارسی کے واسطے سے آئی ہیں اس لیے ان کا سنسکرت رنگ اڑ گیا۔ انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" میں بھی ہندو تہذیب کی جھلک ملتی ہے"۔ "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" میں مختصر کہانیاں ہیں جن میں معاشرت کے بیان کی گنجایش نہیں لیکن پھر بھی ان کا ماحول ہزار ڈیڑھ ہزار برس پہلے کا ہے۔ راجا برہمن دیوتا یوگی، ہَوَن داں اندر پاتال بکش بکشنی وغیرہ ہندو معاشرت کے عناصر ہیں" (ص ۹۲)۔ الف لیلوی داستان اور ہندوستانی قصوں کی ایک تکنیکی مماثلت کا حوالہ: "الف لیلہ کی تکنیک یعنی قصہ گوئی کے ذریعے کسی کام کو ٹالنے کے لیے وقت گزاری کرنا ہندوستانی "شک سپ تتی" اور "سنگھاسن بتیسی" اور "سند باد اور سات وزیر" میں بروئے کار لائی گئی" (ص ۲۳۶)۔ "سلسلۂ الف لیلہ" کی کہانیوں کے مماثلات کے بیان میں" "مزدور بغداد اور تین عورتیں" کے ایک قصے کی منگولی ترجمے سے مشابہت کا ذکر بہ صفحہ ۴۴۴ کیا ہے۔

"سنگھاسن بتیسی" وغیرہ کے سماج اور ہند ایرانی یا عربی اصل کے داستانی معاشرے پر ان الفاظ میں پروفیسر جین نے ایک نظر ڈالی ہے: "سنگھاسن بتیسی" "بیتال پچیسی" "رانی کیتکی کی کہانی" وغیرہ میں قدیم ہندوستان اپنے راجاؤں اور جوگیوں، راج کماریوں اور باندیوں کو جلو میں لیے موجود ہے تو الف لیلہ کی کہانیوں میں شب رو خلیفہ ہارون الرشید کا بغداد بصرہ اور موصل دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں" (ص ۶۶۲)۔ آخری ادبی تاثر: "سنگھاسن بتیسی" "بیتال پچیسی" اور "رانی کیتکی کی کہانی" کی طرح قصہ مہر افروز و دلبر بھی ایسی اردو داستان ہے جس کی زبان اردو اور ہندی عطر کا مجموعہ ہے"۔ (شمالی ہند کی سب سے قدیم داستان۔ قصہ مہر افروز و دلبر ص ۲۸)۔

عنوان ہٰذا کے اختتامیہ کے بہ طور "سنگھاسن بتیسی" کے داستانی عوامل کی طرف اشارہ کناں رام لعل نابھوی کے مبصرانہ الفاظ پیش ہیں جن میں ان کہانیوں کے چند اجزا کو بھی سمو دیا گیا ہے: "اس کتاب میں قدیم ہندو معاشرت اور تہذیب و تمدن کی جھلکیاں ہیں، ہندو دیو مالا اور کتھاؤں کا ذکر ہے، پند و نصائح ہیں۔ کسی چیز کو حاصل کرنے سے پہلے اس کے لیے حق دار بننے کی صلاحیت پیدا کرنے کی بات ہے۔ وہ سب داستانی لوازم ہیں جو داستانوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یہاں پتلیاں بولتی ہیں۔ ایک برہمن راجا کے لیے پھل لاتا ہے جس کے کھلانے سے کھانے والا امر ہو جاتا ہے۔ نگر میں سونے کا مینہ برستا ہے۔ ایک سدھ ایک پھول مالا راجا کو دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے پاس ہوتے ہوئے راجا سب کو دیکھ سکتا ہے اور اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ تال بیتال راجا کے بلانے پر ایک سیکنڈ میں پہنچ جاتے ہیں اور راجا جہاں جانا چاہتا ہے وہاں اڑا کر راجا کو پہنچا دیتے ہیں۔ کنول کے پھول سے ہر روز ایک قیمتی لعل نکلتا ہے۔ فرضی حکمت کا گھوڑا بنا کر لاتا ہے اور گن یہ بتاتا ہے کہ یہ نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے اور جہاں چاہو لے جاتا ہے۔ سدھ بندریا پر چلو پانی ڈالتا ہے اور اسے خوب صورت استری بنا دیتا ہے، پھر جب چاہتا ہے اسے بندریا بنا دیتا ہے۔ مردہ جاگ پڑتا ہے۔ درخت پر تپسی پاؤں میں زنجیر باندھے الٹا لٹکتا ہے۔ عورت اپنے خاوند کو قتل کر کے ستی ہونے کے لیے تیار ہو جاتی ہے"۔ صـ٦

متذکرہ عناصر اور انہی انواع و اقسام کے اجزائے قصہ کا "سنگھاسن بتیسی" میں اجتماع اس کی دل چسپیوں میں بیش از بیش اضافوں کا محرک ہوتا ہے اور ان لوازمات کی موجودگی "سنگھاسن بتیسی" کو مثلاً "بیتال پچیسی" کا کم از کم ہم پلّہ قرار دینے کے لیے بہت کافی ہے۔ رام لعل نابھوی کے نتیجہ خیز تجزیے کی رو سے: "غرض کہ اس قسم کے قصّے اور کہانیاں ہیں جن میں تحیّر ہے، تجسس ہے، عقل سلیم باور نہیں کرتی کہ یہ قصّے کہانیاں صحیح ہیں، لیکن بے ساختگی اور دل چسپی کا یہ عالم ہے کتاب ہاتھ میں لے کر ختم کرتے ہی بنتی ہے۔ انداز بیان نہایت سلیس، رواں اور شگفتہ ہے۔ نثر میں طوالت نہیں اختصار اور جامعیت ہے۔ مناظر کی جان دار اور بھرپور عکاسی ہے۔ تشبیہات لطیف، بامعنی اور خوب صورت ہیں" (صـ٦) جو کتاب اتنی دل بستگی کے عوامل و لوازم کا مجموعہ ہے ظاہر ہے کہ وہ کیوں

کرۃ بیتال پچیسی“ سے کم رتبہ وکم عیار فرض کی جاسکتی ہے؟ طرفہ تماشا ہے کہ جن کتابوں کے موضوعات کی بھرپور مناسبت سے سنجیدہ ومبسوط تقابلی جائزے کی ضرورت تھی ان ہی میں ”سنگھاسن بتیسی“ کی خصوصیات کو صرف نظر کرکے اس کو غیر معیاری باور کرلیا گیا۔

”سنگھاسن بتیسی“ کے تراجم کی فہرست سازی

مختلف زبانوں میں ان کہانیوں کی منتقلی اور مترجمہ متون سے مزید تراجم کی بھی تفصیلات کی گرد آوری ایک باقاعدہ اور مستقلاً علاحدہ نوعیت کی ریسرچ ہے جو زیر نظر تصویر کے اپنے مقاصد اور دائرہ تحریر سے الگ واقع ہوئی ہے۔ اتفاقاً خود اردو ”سنگھاسن بتیسی“ سے ترجموں کا کوئی علم نہیں ہوسکا ہے البتہ سنسکرت سے بالراست وبالواسطہ تراجم پر مفید مختصر اطلاعات نذر ہیں۔ اس نوع کی فہرست سازی اولاً پروفیسر گیان چند نے دوسری زیر تحقیق کتب کے ہم راہ کی ہے جس کے علاوہ بھی چند اور ترجموں کا معلوم ہوسکا ہے جب کہ پروفیسر جین کی تصنیف کے مندرجات میں سے کچھ کی تفصیل بھی ملی ہے۔ ”سنگھاسن بتیسی“ کی سنسکرت اصل پر مفصل معلومات کا فقدان ہے۔ البتہ یہ ایک بڑا سلسلہ تراجم ہے جس کی اپنی شجریاتی فہرس پر باضابطہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس طرح کے کام کے کئی نمونے سامنے آچکے ہیں جن میں تحریر و ترجمہ کے سلسلے کی زیادہ سے زیادہ کتابوں کی چھان بین پر مبنی شجرہ سازی سے لے کر توضیحی فہرس نویسی تک شامل ہیں۔ مترجمہ کتب کی شجرہ نویسی اور وضاحتی فہرست سازی دونوں ہی کاموں کو اپنی دل چسپی اور واقفیت کی زبانوں سے لے کر عالمی ادبیات تک توسیع دی جاتی ہے جیسا کہ ”دوکی کا فلسفۂ اخلاق“ مطبوعہ ۱۸۸۸ء میں جوزف جیکبس کے ترتیب دادہ شجرۂ تراجم ”پنچ تنتر“ اور پروفیسر ایڈگرٹن کے مرتبہ ”پنچ تنتر“ کے ہی عالم گیر ترجموں کے بھی شجرے (مندرجہ این ایم پینزر کی ”اوشین آف اسٹوری“ جلد ۵ متعلقہ ”کتھا سرت ساگر“ ۱۹۲۵ء) سے مظہر ہے۔

ہمارے یہاں داستانی تفتیش وتفحص سے ان کی دل بستگی رکھنے والے اسکالروں میں سے خصوصاً ڈاکٹر گیان چند جین نے اس جانب توجہات منعطف فرمائیں تاہم دائرہ کار

کو شلاً "سنگھاسن بتیسی" وغیرہ کے سلسلے کی فہرس پر مرتکز رکھا۔ دراصل زیادہ اطلاعوں کا جمع اور پیش کرنا "اردو کی نثری داستانیں" کی بنیادی ضروریات اور ضخامت کی موجودہ حدود سے بہت زیادہ بڑھ جاتا اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی تحقیقی منصوبہ خواہ کتنا وسیع و عریض کیوں نہ ہو بے حد حساب معلومات اور غیر معمولی حجم کا متحمل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے زیر جستجو داستانی سلسلہ ہائے تراجم پر ضروری اطلاعات کا ایک بڑا ذخیرہ مرتب فرما دیا۔ "سنگھاسن بتیسی" کے سلسلۂ تراجم پر راقم پروفیسر جین صاحب ممدوح کی فاضلانہ ترتیب کا اتباع کرتے ہوئے صرف مختصرات کو سمونے پر اکتفا کر رہا ہے۔ اوّلاً کتاب کی تاریخ اور مصنف کی شخصیت دونوں کے بارے میں پروفیسر گیان چند کے بیانات بہ صفحہ ۳۰۴ کا اعادہ بہت کافی ہوگا کیوں کہ سنسکرت ادب کی تواریخ کی دستیابی ممکن نہیں ہے۔

"سنگھاسن بتیسی" کی تاریخ تصنیف پر ڈاکٹر گیان چند جین کا مختصراً یہ خیال ہے کہ "بھوج دھار کا پرمار راجا ہے جو ۱۰۱۸ سے ۱۰۹۹ تک حکومت کرتا تھا جس کے معنی سنگھاسن بتیسی" گیارہویں صدی سے پہلے کی نہیں۔ چوں کہ اس کتاب میں بھوج کی بڑی مدح و ثنا ہے اس لیے ویبر کی رائے تھی کہ اسے بھوج کے کسی معاصر نے بھوج کی خوشامد کے لیے تصنیف کیا تھا" (بہ حوالہ ہنری ویبر کی دو جلدی "ٹیلس آف دی ایسٹ" ۱۸۱۲ء جو گارنٹ کے الف لیلائی سلسلے اور ریپرسیوَل کے گالاں ایڈیشن کی کہانیوں کے تراجم پر مشتمل ہے) ہنری ویبر کی اس نشان دہی سے اختلاف کے ساتھ پروفیسر جین کا انکشاف ہے کہ "لیکن جنوبی اور جین نسخوں میں ساتویں کہانی میں "دان کھنڈ" کا لفظ آگیا ہے جو ہیمادری کی کتاب "چتروَرگ چنتامنی" کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "سنگھاسن بتیسی" تیرہویں صدی سے قبل کی نہیں" (بہ حوالہ ایڈگرٹن مقدمہ ج ۲ ص ۵۳)۔

صاحب کتاب سے متعلق پروفیسر گیان چند جین کی تحقیق کا خلاصہ اسی تسلسل سے اقتباس کیا جاتا ہے: "مصنف: بعض نسخوں میں کالی داس کا نام دیا ہے، جو لغو ہے۔ درار رچی کے نسخے میں مصنف کا نام درار رچی ہے، یہ بھی کسی شخصیتوں کا نام تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مصنف نہ ہو مؤلف ہو یعنی بعد میں کسی درار رچی نے اصل نسخے کو مرتب کیا ہو۔ بعض جین نسخوں کے مطابق جین ملنن کسی منی نشاکر کی مراٹھی "سنگھاسن بتیسی" کی بنیادوں پر

بنا ہے لیکن موجودہ سنسکرت نسخوں کی زبان اتنی ملتی جلتی ہے کہ ان کی مہاراشٹری اصل قرینِ قیاس نہیں۔ ایک جین نسخے میں مصنف کا نام سدھ لین دیواکر ہے دو نسخوں میں رام چندر نام ہے۔ لیکن وہاں غالباً یہ نام شری رام کی مناجات کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہی ہے کہ "سنگھاسن بتیسی" کے مصنف کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" (ص۳۱) ان کہانیوں کا نقطۂ آغاز راجا بھوج کا عہد ہے جس سے کچھ اور بھی قصص منسوب ہیں مثلاً "راجا بھوج کا سپنا" از راجا شیو پرساد لکھنؤ ۱۸۸۸ء جو سی نکر نامی کسی خاتون کی مختصر انگریزی کتاب سے ہندی میں مترجمہ ہے۔ تاہم چوں کہ ۳۲ پتلیوں کے ساتھ ساتھ بیتال کی ۲۵ کہانیوں کا تصور بھی اپنے منبع و مخرج کی حیثیت میں ان سبھی حکایتوں کے ہیرو بکرماجیت کو پیش کرتا ہے اس لیے اس سمت بھی خیال جاتا ہے۔ اس زاویے سے دریافت و جستجو کی گنجایش موجود ہے کہ یہ راجا بھوج سے پہلے اور راجا بکرماجیت کے اپنے دنوں کی یادگار نہ ہوں۔ خواہ اس کے دور کی غیر فانی تخلیقی شخصیت کالی داس سے "سنگھاسن بتیسی" کی نسبت خارج از امکان ہی ہو۔

پروفیسر گیان چند نے ہارورڈ یونیورسٹی امریکا سے ۱۹۲۶ء میں مطبوعہ اور معروف و معتبر ہند شناس فاضل ایڈگرٹن کے ترتیب دادہ پانچ سنسکرت متون کے مشترک ایڈیشن کے مندرجات سے "سنگھاسن بتیسی" کے سلسلۂ کتب کی فہرست سازی کی بسم اللہ فرمائی ہے۔ راقم کو جہاں تک مستحضر ہے پروفیسر ایڈگرٹن نیز سی ایچ ٹانی، مسٹر ڈبی سن راس، پروفیسر بین فائی وغیرہم کی متعدد مغربی مطبوعات سے کئی ایک جلدیں جامعہ عثمانیہ اور کتب خانہ آصفیہ (اب اسٹیٹ لائبریری) کے دفاتر میں موجود تھیں جن سے حسب ضرورت اکتساب کے کھلے عام مواقع میسر آتے تھے۔ قلق یہی ہے کہ اس طرح کی نادر کتب یہاں زیادہ تر ہم دست نہیں ہیں اور جو موجود ہیں وہ بہ غرض استفادہ آسانی سے دست یاب نہیں ہیں اس لیے ان کا حصول اور ان سے اکتساب راقم جیسے طالبانِ علم و ادب کے لیے بالکل ہی ناممکن ہے قصہ مختصر ڈاکٹر گیان چند جین نے مذکورہ ایڈگرٹن متون کو ان الفاظ میں متعارف کرایا ہے۔

"پنسلوینیا یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر ایڈگرٹن نے دو جلدوں میں "سنگھاسن بتیسی" کو مرتب کیا ہے۔ پہلی جلد میں "سنگھاسن بتیسی" کے چار سنسکرت مخطوطوں کا انگریزی ترجمہ ہے اور دوسری جلد میں چار سنسکرت متن رومن رسم الخط میں درج کیے گئے ہیں۔

جلد اول میں ایک طویل عالمانہ تحقیقی مقدمہ بھی ہے جس کی مدد سے "سنگھاسن بتیسی" کی اصل کے بارے میں ضروری معلومات پیش کی جاتی ہیں" (ص۳۰۳)۔ اس مرحلے پر فاضل امریکی محقق کو محصلہ پانچ نسخوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو ص۶۹۵ پر مرتبہ "سنگھاسن بتیسی" کے قصوں کے مختلف نسخے" نامی فہرس کی ابتداء میں صرف نام بہ نام شریک ہیں۔ تاہم درج ذیل توضیحی فہرست کا آغاز ص۳۰۳ کی سطور سے ہی کیا جا سکتا ہے جب کہ ۶ تا ۳۵ تک کے ابتدائی اندراجات پروفیسر جین کی ص۶۹۵ کی فہرس سے اخذ کر کے ممکنہ تفصیلات کا ان کے ساتھ اور بعد ازاں بھی اضافہ کیا جا رہا ہے۔

(۱) "جنوبی نسخہ جو اصل کی ترجمانی کرتا ہے" (ص۳۰۳)۔
(۲) منظوم نسخہ (یہاں سے تین مخطوطات کی کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے)۔
(۳) "جین نسخہ" (فہرس تراجم ۶ تا ۲۵ میں کوئی مخطوطہ درج نہیں ہے مگر ص۳۴ کے ایک بیان میں "بعض جین نسخوں کے الفاظ کے ساتھ "سدھ سین دیواکر" سے بہ طور مصنف موسوم ایک نیز "رام چندر" سے منسوب دو اور مخطوطوں کا حوالہ ہے جو فہرست ہذا کے تسلسل میں اضافہ ہوں گے)۔
(۴) "مختصر نسخہ" (ایڈگرٹن سے اس پر بھی کوئی اطلاعات شامل نہیں ہیں)
(۵) ورارو چی کا نسخہ جو بنگال سے لایا گیا اور بنگالی رسم الخط میں ہے چوں کہ یہ قریب قریب جین نسخے جیسا ہے اس لیے اسے نظر انداز کر سکتے ہیں"۔
(۶) "سنسکرت کتھاؤں میں دوسرا حصہ ہے"۔ (ص۶۹۵ سے جاری ۶ تا ۳۵ تک کی تفصیلات ضروری اضافوں سمیت یہاں سے منقول ہیں۔)
(۷) "مراٹھی از جین منی شیماںکر"۔ (ص۳۰۳ پر شیماںکر کے مراٹھی متن پر جین مخطوطات کے مبنی ہونے کا خیال محقق ممدوح نے رد کیا ہے کیوں کہ سنسکرت متون میں نسخوں سے مشترک الاصل نہیں ہو سکتے۔ "تاریخ مراٹھی ادب" دہلی ۱۹۸۸ء از مرحومہ پروفیسر کسم وتی دیشس پانڈے میں شیماںکر کا سرے سے کوئی احوال دریافت نہیں ہو سکا ہے۔)
(۸) "سنسکرت سے برج میں ترجمہ از سندر داس کوی ۱۶۳۱ء کے پاس"۔ (بھاشا کا یہی ترجمہ للو لال جی کوی کی اردو "سنگھاسن بتیسی" کی اصل و اساس واقع ہوا ہے۔

کیشور سندرداس گوالیاری شاہ جہاں کا ملک الشعرا تھا نیز ایک بارہ ماسہ اور خالص گوالیاری زبان کی مثنوی "سندر شرنگار" (۱۰۴۱ھ/۱۶۸۸ء) کا مصنف تھا" موخرالذکر متذکرہ "مخطوطات" ج ۴ ص ۵۹ ء ۳/۵۶-)

(۹) "بنگالی": "وترس سنگھاسن" ۱۸۱۸ء سیرام پور"- (غالباً پرو فیسر جین کی مراد فورٹ ولیم کالج کی بنگلہ کتب کی اشاعت کے مرکز موسومہ سری رام پور مشن پریس سے مطبوعہ ترجمے سے ہے۔ پروفیسر شیوکمار سین کی مشہور و مستند انگریزی "تاریخ بنگلہ ادب" (۱۹۵۹ء) مترجمہ (دہلی ۱۹۷۵ء) کے مطابق مرتن جے ودیالنکار متوفی ۱۸۱۹ء کی یہ بنگالی "سنگھاسن بتیسی" ۱۸۰۲ء کی ترجمہ شدہ یا شایع کردہ ہے" کیفیت منقول ہے": مرتن جے ودیالنکار کے تصانیف اکثر سنسکرت سے لیے ہوتے ہیں یا سنسکرت کے ترجمے ہیں۔ "بتیس سنگھاسن" ۱۸۰۲ء اور "رہت اپدیش" ۱۸۰۵ء کی کہانیاں ترجمے ہیں جو سنسکرت تصانیف "دواترمسات پتالیکا" "بتیس موریتاں" اور "رہت اپدیشیہ" "اچھی نصیحتیں" سے کیے گئے ہیں۔ ان میں سے چند کہانیاں پہلے ہی سے بنگال میں مقبول تھیں منظوم طور پر یا پھر ناقص نثر میں" (ص ۲۹۹)۔ فاضل مترجم نے حاشیے میں للولال جی کوی کی اردو "سنگھاسن بتیسی" کا حوالہ دیا ہے۔)

(۱۰) "فارسی شاہ نامہ از چتر بھج داس کالیتھ اکبر کے عہد میں"۔ (فقیر دکنی کی مثنوی "بیر بکرم" مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی بہ عنوان "سنگھاسن بتیسی" اسی فارسی منظومے سے ماخوذ ہے۔ اس دکنی "سنگھاسن بتیسی" کے مرتب افسر صدیقی مرحوم کے پیش لفظ ص ۳ کے مطابق: "چتر بھج داس بھٹ خلف سروپ چند نے ۱۶۰۵ء میں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا"۔ چتر بھج کے اس فارسی ترجمے کے چند مخطوطات کی نشان دہی ڈاکٹر احمد منزوی نے اپنی مبسوط "فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی" ج ۴ ص ۲۱۷۳ اور ص ۲۱۷۵ ج ۶ ص ۱۴۱۳ نیز ج ۵ ص ۳۷۲۳ پر کی ہے۔ جناب اختر راہی نے اپنی عطا کردہ تالیف "ترجمہ ہائے متونِ فارسی بہ زبان ہائے پاکستانی" ۱۹۸۶ء میں بہ صفحہ ۲۶۷ بہ عنوان "سنگھاسن بتیسی" شاہ نامہ" غالباً ڈاکٹر منزوی کی ہی سند پر چتر بھج داس کو فرزند مہر چند کایستھ ساکن در شہر سونی پت" قرار دیا ہے۔ مرحوم ڈاکٹر سید عبداللہ کی تحقیق "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" کے بجائے ان کے مجموعۂ مقالات" فارسی زبان و ادب" کی محققانہ

نگارشن سنسکرت کتابوں کے فارسی تراجم" میں اس کا اندراج ان الفاظ میں ملتا ہے: "اکبر کے زمانے میں چتر بھج داس بن مہر چند کایستھ نے "شاہ نامہ" کے نام سے ترجمہ کیا" بہ صفحہ ۳۲۱ بہ حوالہ تذکرہ مخطوطات بہ ایڈیشن ذخیرہ نمبر ۴ ۱۳۲ "مخطوطات انجمن" (فارسی عربی) ص۹۶ ع۲۔۵، کے مطابق شاہ نامہ بکرماجیت (سنگھاسن بتیسی) مصنف بھوج داس کاتب بیر خاں کتابت ۱۲۲۶ھ ص۲۴۴ "نمبر ۳ قلمی فارسی ۲۲ موجود و محفوظ ہے)

(۱۱) "نامہ خرد افزا۔ از عبدالقادر بدایونی ۹۸۲ھ/۱۵۷۴۔۱۵۷۵ء نظر ثانی ۱۰۰۳ھ۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے فارسی اندراجات اغلب ہے کہ مختلف جامعاتی و دیگر ذخایر کے تذکرہ ہائے مخطوطات سے ماخوذ ہیں مگر ان میں تاریخی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی جا سکی ہے: بمبئی یونیورسٹی کے کیٹلاگ متعلقہ عربی و فارسی اور اردو مخطوطات میں "سنگھاسن بتیسی" کے تذکرے میں بہ صفحات ۲۷۶ و ۲۲۷ ملا بدایونی کی اس "خرد افزا" کو سر فہرست رکھا گیا ہے اور یہی مقام پروفیسر عبداللہؒ نے محولہ بالا مقالے میں ایک اضافی اطلاع کے ساتھ دیا ہے: "سنگھاسن بتیسی" اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں بہت پسند کی گئی چنانچہ اس کے کئی ترجمے ہوتے: ۱۔ عبدالقادر بدایونی "خرد افزا۔ کے نام سے ترجمہ کیا ایک عالم برہمن نے مدد کی" (ص۳۲۰/۳۲۱)۔ تاہم یہ ناگزیر اضافہ "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" میں بہ صفحہ ۷، "خرد افزا۔ کے نام سے ترجمہ کیا بدایونی کی اپنی منتخب التواریخ" ج ۲ ص۱۸۳ سے ماخوذ ہے' برہمن اسکالر کی استمداد کی اطلاع کا اضافہ اس لیے ناگزیر ہے کہ بدایونی سے اور بھی سنسکرت الاصل تراجم منسوب ہونے کے باوجود متنازعہ مورخ بالراست سنسکرت داں اور ہندی السنہ و علوم کا ماہر یا فاضل نہیں تھا۔ فہرست احمد منزوی ج ۶ ص۴۱۳ کی رو سے پروفیسر سعید نفیسی کے ایک تذکرہ مخطوطات میں ج ۱ ص۳۶۵ پر "خرد افزا" بدایونی کا اندراج ہے۔

(۱۲) "از بھارا مل کھتری ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء سنسکرت سے"۔ (ڈاکٹر سید عبداللہ نے انڈیا آفس کے تین نسخوں اور برٹش میوزیم کے ایک مخطوطے کا حوالہ "ادبیات فارسی" میں بہ صفحہ ۸۶ دیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس مقام پر مترجم کا نام بھارا مل کھتری اور مقالے میں بہ صفحہ ۳۲۱ رائے بہارا مل دیا ہے جب کہ کیٹلاگ بمبئی میں اس اسکالر کا نام بھاری مل مذکور ہے۔ تاہم ہمارے خالص دیسی لہجے میں عہد جہاں گیر کا یہ نام بہ قول پروفیسر گیان چند بھاٹا مل

ہی درست ہونا چاہیئے کیوں کہ اس کا صحیح و مستند تلفظ بھاڑا مل ہی ممکن ہے۔ فہرس احمد منزوی ج ۶ ص۴۱۳۱ کی رو سے ج ۴ ص۲۱۷ پر "سنگھاسن بتیسی" ترجمہ سنگھاسن دترنستی اور ج ۵ ص۲۳۔۳ پر "دو دلیری یا تے راجہ بکرماجیت" کے الفاظ ہیں۔ ج ۶ میں چند اور نسخوں کا داخلہ ہے۔ ج ۶ کی ہی کیفیت سے انجمن ترقی اردو کراچی کی فہرس کے شمار ۳۴۲ نیز تذکرۂ مخطوطات پاکستان، و ہند ج ۴ ص۴۸۸ پر ایک ایک نسخے کی موجودگی کا علم ہوتا ہے۔ انجمن کے فارسی و عربی مخطوطات" کی مختصر فہرس کے ص۸۶ ۔ ۴۹۷ پر بھاری مل درج ہے اور یہ نسخہ ۱۲۴۳ء کا مکتوبہ ۲۲۴ صفحوں کا ہے۔)

(۱۳) "قلمی بسب رائے بن ہرکرن داس نے ۶۲۔ ۱۰۶۱ھ/۵۲۔ ۱۶۵۱ء میں چھتر بھوج اور بھاڑا مل کے تراجم کو ملا کر مرتب کیا۔" (اس فارسی نسخے کے بارے میں اشتباہ سا ہوتا ہے کہ کہیں دو علاحدہ کارناموں میں التباس تو نہیں واقع ہو گیا ہے: بمبئی کیٹلاگ میں متذکرہ آٹھ فارسی تراجم میں سے چوتھے اندراج کا ایک لفظ عکسی ورق میں غیر واضح ہو گیا ہے جو یا تو s/o یعنی ولد ہو سکتا ہے یا: OR بھی:۔

(4) IBNE HARKARAN

BISAB RAI PRODUCED ANOTHER IN THE REIGN OF SHAHJAHAN:"— P.277

جب کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے مقالے کی فہرس میں بہ شمارہ ۵ صرف یہ مختصر داخلہ دیا ہے: ابن ہرکرن نے بھی ترجمہ کیا" (بہ صفحہ ۳۲۱ بہ حوالہ انڈیا آفس عدد۔ ۱۹۹ء) اور "ادبیاتِ فارسی" میں بہ صفحہ ۸۶ دو علاحدہ تراجم کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے جو اقتباس ہے: "شاہ جہاں کے عہد میں اس کا ایک اور ترجمہ ابن ہرکرن نے کیا۔ ریو نے بسب رائے بن ہری گرب داس کا نسخہ کے ترجمے کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ چتر بھوج اور بھارا مل کے نسخوں کا مرکب ہے، اس کی تصنیف کی تاریخ ۱۰۶۱ھ یا ۱۰۶۲ھ ہے۔" فہرس احمد منزوی ج ۶ ص۴۱۳۱ میں بھی ان الفاظ کے ساتھ دونوں کو خلط ملط کر دیا گیا ہے: "سنگھاسن بتیسی بسنت رائے ابن ہرکرن (بسب رائے ابن ہرگرپ داس")۔ غرض یہ معاملہ تدقیق طلب ہے۔)

(۱۴) "قلمی کشن بلاس از کشن داس باس دیو تنبولی صوبہ لاہور۔ برٹش میوزیم فارسی مخطوطات کی فہرست کے مطابق بہ عہد اورنگ زیب۔ انڈیا آفس فارسی مخطوطات کے مرتب کے بہ قول بہ عہد جہاں گیر۔" (بمبئی کیٹلاگ کے بہ موجب بھی یہ فارسی ترجمہ عالم گیری دور سے منسوب ہے اور یہ اطلاع درست نہیں معلوم ہوتی ہے۔ پروفیسر عبداللہ نے ابتداً "ادبیاتِ فارسی"

میں بہارامل کھتری کے فارسی ترجمے کو عہد جہاں گیر کا سب سے پہلا ترجمہ" قرار دیتے ہوئے اس کے مخطوطہ انڈیا آفس کے ذکر سے متصل ارشاد کیا ہے: "انڈیا آفس میں اس نسخے کے علاوہ ایک اور ترجمہ ہے جو کشن داس ابن ملوک چند تنبولی نے کیا ہے۔ یہ شخص لاہور کا باشندہ تھا اور نواب جار اللہ امیر الامرا کا ملازم تھا اس لیے اس کا نام "کشن بلاس" رکھا گیا ہے۔ اس کا ایک اور نسخہ بتر امیم برٹش میوزیم ہے" (ص۸۶)۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے مقالے سے اس فارسی "کشن بلاس" کی اصل و نقل کے ادوار کا تعین ہو جاتا ہے: "۴۔ جہاں گیر کے زمانے میں "کشن بلاس" کے نام سے کشن داس تنبولی لاہوری ملازم نواب جار اللہ امیر الامرا نے ترجمہ کیا (بہ حوالہ انڈیا آفس نمبر ۱۹۸۹ء) اور نگ زیب کے زمانے میں کسی اور شخص نے اس پر نظر ثانی کی" (ص۳۲)۔ ڈاکٹر احمد منزوی نے ج ۶ ص۱۴۱۴ پر ج ص۲۱۰ اور ج ۵ ص۱۳ کے اندراج کی بھی نشان دہی کی ہے۔)

(۱۵) "قلمی از چاندا بن مادھورام کوپن ہیگن میں"۔ (پروفیسر عبدالقادر سروری نے بمبئی یونیورسٹی کے تذکرۂ مخطوطات عربی فارسی و اردو میں ۶ پر حوالہ دیا ہے جب کہ تذکرۂ قلمیات احمد منزوی ج ۶ ص۱۴۱۴ پر اس کا اندراج فہرس مخطوطات پاکستان و ہند ج ۴ ص۹۸ کی سند پر بنام "چندا بن مادھورام" ہے)

(۱۶) "قلمی مثنوی گل افشاں از قاسم کاہی"۔ (بمبئی کیٹلاگ میں بہ طور گم نام بہ حوالہ ریو ج ۱ مذکورہ۔)

(۱۷)۔ "قلمی مفتاح القلوب از عباد اللہ ۱۰۳۵ھ آصفیہ لائبریری میں"۔ (تفصیل نامعلوم)

(۱۸)۔ از سید امداد علی و شیو سہائے کایستھ' بیلی کے حکم سے ۱۸۴۵ء میں"۔ (بمبئی کیٹلاگ میں بہ حوالہ ریو تذکرۂ مخطوطات برٹش میوزیم اسی مسٹر بیلی کی سرپرستی کا ذکر ہے جب کہ دوسرا نام سیو سہائے لکھا ہے۔)

(۱۹) "فارسی خلاصہ' مترجم کا نام مذکور نہیں' برٹش میوزیم میں"۔ (دیگر تفصیلات نامعلوم)

(۲۰) "قدرے مختلف نسخہ انڈیا آفس میں"۔ (اس کی بھی تفصیل عدم دستیاب۔)

(۲۱) "کیمبرج میں مصنف کا نام معلوم نہیں' بہ حوالۂ فہرست فارسی مخطوطات انڈیا آفس"۔

(۲۲) "قلمی کانِ وجود نظم سالار جنگ لائبریری میں"۔ (تفصیلات زیرِ دریافت ہیں)

(۲۳) "نثری ترجمہ مکتوبہ ۱۲۲۵ھ بہ حوالۂ فہرست عربی فارسی اردو مخطوطات بمبئی یونیورسٹی"۔

(پروفیسر سروری کے اس کیٹلاگ سے متعلقہ صفحات ۲۷۶ و ۲۷۷ نیز اوّلین دس اوراق کے بھی عکس جناب پروفیسر اے سی ٹیکیکر صاحب یونیورسٹی لائبریرین نے راقم کی گزارش پر مرحمت کیے ہیں۔ کیٹلاگ کے بیان کے مطابق دیگر اطلاعات یہ ہیں: اس فارسی مخطوطے میں کوئی مقدمہ یا تعارف نہیں ہے اس لیے مترجم سے لاعلمی ہے، نسخے کی تاریخ تحریر کے ساتھ مترجم اور ناقل کسی کے نام مذکور نہیں ہیں، مخطوطہ ایک حکایت سے شروع ہوتا ہے، ترقیمہ کے بموجب نسخہ ۱۲۲۵ مطابق ۱۸۱۰ء کا لکھا ہوا ہے، چند ذخایر مثلاً انڈیا آفس، برٹش میوزیم، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال وغیرہا سے دیگر کئی نسخوں کی نشان دہی کی ہے۔ موصولہ عکس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخطوطہ کسی عمدہ خط کا نمونہ نہیں ہے بلکہ ایک عام شکستہ خط میں نقل ہے اور ناقل نے خط جما کر تحریر کرنے تک کی زحمت نہ کی۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد آغاز کتاب ایک حکایت کے الفاظ سے ہے۔)

(۲۴) "قلمی دکنی سنگھاسن بتیسی، چتر بھج داس کی فارسی سے ماخوذ سالار جنگ لائبریری میں"۔ (پروفیسر جین نے اپنی تحقیق کے طبع اوّل پر مولوی نصیرالدین ہاشمی کے جائزے مطبوعہ "اردو" اپریل ۱۹۵۷ء سے یہ معلومات بہ صفحہ ۱۳۱/۱۳۲ اضافہ کی ہیں: "سنگھاسن بتیسی: اس کا تعارف سب سے پہلے مولوی نصیرالدین ہاشمی نے پیش کیا، اس کا مخطوطہ سالار جنگ لائبریری میں ہے۔ یہ چتر بھج داس کی فارسی سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ ہے۔ ہاشمی صاحب کی رائے میں یہ ترجمہ ۱۸۰۰ سے قبل کی تصنیف ہے لیکن اس کی زبان اتنی صاف ہے کہ یہ انیسویں صدی کے اوایل کی بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً نمونہ: ایک پتلی ان پتلیوں میں سے پدمنی نام رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ ہنسی اور کہی کہ راج بھوج یہ تخت شاہی اس راجہ بکرماجیت کا ہے جو کوئی مانند اس کے سخاوت کرے اور کام مشکل کو آسان فرماتے وہ شخص اُغلب ہے کہ اس تخت پر بیٹھے۔ راجہ بھوج وہ حقیقت کس طرح ہے۔ تب پتلی کہی"۔۔۔ تاہم یہ نمونۂ تحریر مقالۂ ہاشمی میں مندرجہ اس دکنی ترجمے (۱) سنگھاسن بتیسی کی کیفیت صفحہ ۱۸۸ پر نہیں ہے۔ مولوی نصیرالدین ہاشمی نے ازاں بعد کتب خانہ سالار جنگ کے قلمی نوادر کے کیٹلاگ کی جلدیں تالیف کیں چنانچہ اختر راہی نے مولوی نصیرالدین ہاشمی کے تذکرۂ مخطوطات سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کے شمارا ۹۰ سے چتر بھوج کے فارسی "شاہ نامے" کے اسی نثری ترجمے کا حوالہ دیا ہے۔ قبلاً متذکرہ تالیفِ

اختر راہی صـ۲۶ کی کیفیت کی رو سے مترجم نامعلوم ہے' ترجمہ ۱۲۰۰ھ سے قبل کا ہے اور ابتدائی جملہ ہے: "شکر اللہ تعالیٰ کا' ایسا اللہ تعالیٰ گ بزرگ ہے"۔ مقالہ ہاشمی مطبوعہ اردو میں منقولہ آغاز کی عبارت بہ حوالہ فارسی "شاہ نامہ" چتر بھوج داس": کی شخص فارسی زبان سے آشنا نہیں اس واسطے ترجمہ اس کا دکنی زبان میں اس طرح سے لکھا گیا ہے" ممکن ہے "سنگھاسن بتیسی" کے سلسلے کی اوّلین دکنی کتاب یہی واقع ہوئی ہو۔)

(۲۵) "قلمی مثنوی وِیر بکرم از فقیر در عہد شاہ عالم' صاف دکنی زبان' انجمن ترقی اردو قبل تقسیم"۔ اغلب ہے کہ یہ ایک ہی منظوم دکنی تخلیق ہے جو چتر بھوج داس کے فارسی "شاہ نامہ" گزشتہ مذکورہ ۱۰ پر مبنی رہی ہے۔ فقیر دکنی کی یہ "مثنوی" بیر بکرم' یا دکنی "سنگھاسن بتیسی" انجمن سے ہی مطبوعہ ہے اور راقم کے ایک ماخذ کے طور پر یہ تصنیف تعارف کتابیات نامی اوراق ہٰذا کے افتتاحی باب میں مندرج ہے۔ "مخطوطات ج ۵ صـ۱۳۴ ۱۳۰ / ۳۳۶ پر مذکورہ اسی مثنوی کو تصنیف قبل از ۱۱۱۹ھ" اور نسخہ ہٰذا کو ۱۲۵۶ کا مکتوبہ لکھا گیا ہے لیکن سالِ تحقیق کی کوئی سند یا توجیہہ نہیں تحریر ہوئی ہے۔)

(۲۶) "قلمی مثنوی سنگھاسن بتیسی" بکرماجیت از شاگرد میر درد' لٹن لائبریری علی گڑھ (پروفیسر فرمان فتح پوری نے اپنی تحقیق "اردو کی منظوم داستانیں" کے ایک باب میں بہ صفحہ ۴۶۹ مثنوی ہٰذا کی کچھ تفصیل تحریر فرمائی ہے' فاضل موصوف راوی ہیں کہ اس سلسلے کی قدیم ترین اردو نظم خواجہ میر درد کے ایک شاگرد کی ہے جو ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) سے قبل وجود میں آئی ہے۔ اس کا قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) لٹن لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ اس میں مصنف کا نام اور سن تصنیف کہیں درج نہیں ہے' پھر بھی مثنوی کے ابتدائی اشعار سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ مصنف میر درد کا شاگرد ہے اور عہد شاہ عالم سے تعلق رکھتا ہے۔ مثنوی کا آغاز حمد کے ان اشعار سے ہوتا ہے:

دِلا رام جہاں رزّاقِ مطلق بنائی آسماں کی جس نے چوسق
مہ و خورشید کو روشن دکھاتے رکھا اپنے تئیں سب سے چھپاتے

حضرت رام لعل نابھوی نے اپنے مقالے موسومہ ہماری داستانیں" "سنگھاسن بتیسی" میں اس شاعر کو "آشنا تلمیذ خواجہ میر درد" قرار دیا ہے۔)

(۲۷) "سنگھاسن بتیسی" از کاظم علی جوان و للو لال ۱۸۰۱ء۔ سندر داس برج سے ماخوذ'

یہ ہندی میں بھی چھپا۔"

(۲۸) "از منشی منسا رام ناتواں بہ حوالۂ آثار الشعرائے ہنود" یہ نسخہ ناپید ہے۔

(۲۹) "نثر ایڈیشن از راجا درگا پرشاد ۱۸۶۲ء/۱۲۷۹ھ آگرہ" کیٹلاگ بمبئی میں مذکورہ)۔

(۳۰) "مثنوی رنگ لال چمن ۱۸۶۹ء" (کیٹلاگ بمبئی میں نام صرف چمن اور مقام اشاعت کانپور درج ہے۔ مخدومی حضرت رام لعل نابھوی نے لطف نامہ مورخہ ۲۵/۱۰/۹۰ میں ارشاد کیا ہے: "سنگھاسن بتیسی منظوم از رنگ لال چمن، نول کشور، جون ۱۸۶۹ صفحات ۷۹، ڈیمائی سائز، نابھوی کے پاس صحیح حالت میں ہے۔ میں نے اس پر ایک مضمون لکھا ہے جو آج برائے اشاعت بھیج دیا ہے۔" ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ان معلومات کا اضافہ بہ صفحات ۶۹۳/۷۰۳ کیا ہے: "۱۸۶۴ء میں رنگ لال چمن نے بھی سنگھاسن بتیسی کو اردو نظم میں منتقل کیا۔ یہ نظم مثنوی کی صورت میں بہ عہد واجد علی شاہ لکھی گئی اور سب سے پہلے مطبع نول کشور کانپور سے ۱۸۶۹ء میں شایع ہوئی۔ زبان سادہ و صاف ہے جیسا کہ ان ابتدائی اشعار سے ظاہر ہے۔

لکھیں اب مدحت سلطان عالم — کہ ہے وہ افسر شاہان عالم
تہہ فرماں ہے اس کے ماہ و ماہی — شہنشاہ جہاں ظل الٰہی
یہی میری دعا شام و سحر ہے — کہ جب تک جلوۂ شمس و قمر ہے
رہے ماجد علی دنیا میں قایم — فزوں شوکت ہو اور اقبال دایم)

(۳۱) "سنگھاسن بتیسی" نثر مصنف نامعلوم نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۰ء بہ حوالۂ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو مثنویاں"۔ (گم نام مترجم کے مگر اسی ناشر کے ایک اور ایڈیشن کا ذکر قبلہ رام لعل نابھوی صاحب کے مکتوب سے اقتباس ہے: "سنگھاسن بتیسی" نول کشور پریس ۱۹۱۰ء ڈیمائی سائز صفحات ۱۰۴۔ خاتمۃ الطبع میں نوٹ ہے کہ کئی مرتبہ مطبع ہٰذا میں ہزاروں جلدیں طبع ہوئیں، بار ہشتم ماہ اکتوبر ۱۹۱۰ء میں چھپی۔ اس کتاب پر مؤلف کا نام نہیں۔ یہ کتاب بالکل صحیح حالت میں نابھوی کے پاس ہے۔" ڈاکٹر شہناز انجم نے نول کشور سے ۱۹۵۳ء میں مرزا کاظم علی جوان کے نام سے مطبوعہ "سنگھاسن بتیسی" کے تیرہویں ایڈیشن سے اکتساب کیا ہے۔ ان معلومات سے اس خیال کو تحریک ملتی ہے کہ ناشرین دونوں طرح کے ایڈیشن چھاپتے رہے ہیں اور پروفیسر جین کا محولہ نامعلوم مصنف

کا نول کشور پریس ایڈیشن ۱۸۷۰ء دراصل متذکرہ بالا نابھوی ایڈیشن نول کشور ۱۹۱۰ء سے ہم رشتہ ہے۔ مقابلے پر ہی اندازہ ہو سکے گا کہ وہ دوسرے ایڈیشن بھی کہیں جو ان کے از سرِ نو لکھے ہوئے متن کے تو نہیں ہیں۔)

(۳۲) "سنگھاسن بتیسی" از رنگین لال رنگین مطبع اودھ اخبار لکھنؤ۔ تفصیل غیر معلوم)

(۳۳) "نظم از منشی مکھن لال ۱۸۸۶ء سے پہلے"۔ (ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بہ قول ۳۲ و ۳۳ کی حیثیت محض تاریخی" ہے ص ۶۸۔)

(۳۴) "سنگھاسن بتیسی" اردو نثر از عبداللہ فرحتی بہ حوالہ نارنگ"۔ (ممکن ہے یہ وہی "نیا ایڈیشن بہ مع حواشی سید عبداللہ صفحات ۱۶+۲۱۶ لندن ۱۸۶۹ء" ہو جو بلوم ہارٹ کی فہرس مطبوعات" انڈیا آفس میں بہ صفحہ ۶۵ مذکورہ ہے۔)

(۳۵) "مختصر نسخہ از مجنوں ۱۹۴۱ء"۔ (بہ قول پروفیسر جین بہ صفحہ ۳۰۵: "چوں کہ فورٹ ولیم کے ترجمے میں بھاشا کا رنگ غالب تھا اس لیے ۱۹۴۱ء میں مجنوں گورکھپوری نے "سنگھاسن بتیسی" کو آسان اردو میں لکھا، یہ مختصر نسخہ نول کشور پریس سے شایع ہوا" ممدوح نے چند کلمات اقتباس کیے ہیں جن کے علاوہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں"۔ ماہِ نو" ستمبر ۱۹۹۰ء میں پروفیسر مجنوں کے ہم وطن اور تقریباً ہم سن تحریر محمد عبدالباقی عباسی صاحب نے مفصل تعارف میں "سنگھاسن بتیسی" کو بھی درج فہرس کیا ہے مگر ملاقات پر بزرگ ممدوح کے یہاں سے بھی کتاب ہم دست نہ ہو سکی ہے۔ صاحب موصوف کی رہبری میں کوشش کی کہ ورثائے مجنوں میں سے ان کے بڑے فرزند ظفر عالم صاحب سے رابطہ قائم ہو مگر ان سے بھی فیصلہ معلومات صرف اتنی ہیں کہ پروفیسر مجنوں نے کتاب اُن ہی کے نام معنون کی تھی جس کا کوئی نسخہ خود ان کے ہاں اور ذخیرۂ مجنوں میں بھی محفوظ نہیں ہے۔ ظفر عالم صاحب کی رہ نمائی پر کان پور کی پبلک لائبریری سے رابطے کی کوشش کی گئی جو کسی طرح کام یاب نہ ہو سکی، ان کے بہ قول ایک جلد وہاں محفوظ ہے۔)

یہاں پر ڈاکٹر گیان چند جین کے (۳۵) اندراجات ختم ہو جاتے ہیں جن پر ممکنہ اطلاعات کے حقیر سے اضافوں کی توفیق و سعادت حاصل ہو سکی ہے۔ راقم خواہاں و کوشاں رہا ہے کہ تمام ۳۵ اندراجات تازہ معلومات جمع کر کے ہر ایک کے ہم راہ پیش کرے لیکن وائے ناکامی۔ قبلہ رام لعل نابھوی نے اپنے ایک فاضلانہ مقالے متعلقہ "سنگھاسن

بتیسی مطبوعۂ ہماری زبان" بابت ۱/ ۹/ ۱۹۸۷ء کا عکس ارسال فرمایا ہے جس میں کتاب کے منظوم و نثری تراجم اور ایڈیشنوں کی فہرست سازی بھی فرمائی ہے اور جس سے آیندہ صفحات میں اضافے کیے جا رہے ہیں۔

تلنگی[۲] زبان کی ادبیات و شخصیات اور کنڑی[۳] کی ادبی تاریخ پر دست یاب کتابوں سے "سنگھاسن بتیسی" کی تیلگو اور کرناٹکی شعر و نثر میں منتقلی کے کوئی شواہد برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ جن چند اور قلمی یا مطبوعہ کتب کا علم ہو سکا ہے انہیں اسی تسلسل میں پیش کیا جا رہا ہے اور جاریہ سلسلے کے پہلے تین مندرجات بھی محقق ممدوح پروفیسر گیان چند جین کی کتاب سے ہی اخذ کر کے شریک کیے جا رہے ہیں۔

(۳۶) "ایک جین نسخے میں مصنف کا نام سِدھ سین دیواکر ہے" (پروفیسر جین ص ۲۴۰)

(۳۷) "دو جین نسخوں میں رام چندر نام ہے" (ایضاً)

(۳۸) "اس کے منگول ترجمے کا عجیب سا نام راجی بورجی خان ہے" (ایضاً بہ حوالہ این ایم پینزر کی "اوشین آف اسٹوری" (مجلدات کتھا سرت ساگر) ج ۶ ص ۲۴۳ مطبوعہ ۱۹۲۵ء بعد۔ الف لیلوی داستانوں کے مماثلات کے ذکر میں "امزدور بغداد اور تین عورتیں" کی ایک کہانی کو پروفیسر جین نے ترجمہ ہٰذا سے مشابہ قرار دیا ہے "سحر جاننے والی شہزادی اور جن کی لڑائی سنگھاسن بتیسی کے منگولی ترجمے راجی بورجی خان" میں ملتی ہے" (ص ۲۴۴)۔ ہو سکتا ہے کہ منگول ترجمے کا عجیب سا نام راجی بورجی خان" بہ جا ترجمہ بہ طور قالب منتقل کر کے رکھا گیا ہو جو ظاہرا مقامی قسم کا معلوم ہوتا ہے۔)

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنی داستانی تحقیقات میں "سنگھاسن بتیسی" کے سلسلۂ کتب میں تین منظوم برج تخلیقات کا انکشاف فرمایا ہے جو پاکستان میں جامعہ

۲؎ (ا) ڈی راما نجا راو اور زینت ساجدہ: تلگو ادب کی تاریخ" انجمن ترقی اردو حیدرآباد ۱۹۶۵ء

(ب) وی وی شاستری جونیر: "دیدم وینکٹا رایبا ساستری" ساہتیہ اکادمی دہلی ۱۹۷۶ء ﴿یہ تینوں کتب

(ج) سلوا کرشنا مورتی: "تروپتی وینکٹا کوتلو" 〃 〃 ﴿انگریزی میں

۳؎ پروفیسر آر ایس موگلی: "تاریخ کنڑا ادبیات" 〃 ۱۹۷۵ ﴿مصنفہ ہیں۔

منا ریہ کی "راجستھانی ساہتیہ کا اتہاس" میں مذکور ہو۔

(۴۵) ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ایک منظوم دکنی تخلیق کو شریک فہرس کیا ہے: "سنگھاسن بتیسی" سے متعلق ایک اور اردو مثنوی مخطوطے کی صورت میں انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں موجود ہے۔ چوں کہ ناقص الآخر ہے اس لیے مصنف اور سن تصنیف کا سراغ نہیں ملتا۔ لیکن زبان و بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی شاعر کے زورِ طبع کا نتیجہ ہے۔" (ص ۴۷)۔

(۴۶) قلمیات شیرانی میں سے اردو نسخوں کا عدد (اندراج ۳۹۹۱ شیرانی ۹۰۹) کل ۷ نقول کا مجموعہ' اور پہلا ہی نسخہ "سنگھاسن بتیسی" سے موسوم ہے مگر تفصیل ندارد (سید جمیل احمد رضوی: ذخیرہ شیرانی میں اردو مخطوطات" اسلام آباد ۱۹۸۶ ص ۱۹)۔

(۴۷) "مخطوطات انجمن" ج ۵ ص ۱ و ص ۱ ۳/۳۱۰ پر متذکرہ سنگھاسن بتیسی" کا بھاکا ترجمہ ۱۰۵۰ھ سے قبل کا کیا ہوا اور ۱۲۱۲ھ کا مکتوبہ ہے۔ اقتباسات کیفیت: "سنگھاسن بتیسی" بھاکا میں ہے اس میں چند مصرعوں کے بعد ایک دو لکھا گیا ہے گویا ان دونوں کے ملنے سے ایک بند ہوتا ہے ــــــ اس بھاکا ترجمے کے مصنف کا پتہ نہیں کیوں کہ مخطوط ناقص الاول ہے اور ترقیمے میں مصنف کے نام کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔ البتہ سنہ تصنیف کے بارے میں اور لکھی ہوئی روایت کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ اسے شاہ جہاں کے عہد قبل از ۱۰۵۰ھ میں تصنیف کیا گیا ــــــ ترقیمہ: تمت تمام شد بہ تاریخ چہارم جمادی الثانی ۱۲۱۲ھ کاتب محمد رحمت اللہ خاں"۔

(۴۸) پروفیسر کسم وتی دیش پانڈے مرحومہ کی انگریزی "تاریخ مراٹھی ادب" (ساہتیہ اکیڈمی ۱۹۸۸) ص ۴۶ کے مطابق فورٹ ولیم کالج کے ڈاکٹر ولیم کیری نے ۱۸۱۴ میں "سنہاسن بتیسی" کا مراٹھی ترجمہ کیا تھا۔ تفصیل اس تاریخ میں اور حوالہ تک کیری کے ان مختصر تذکروں میں معدوم ہے جو کالج پر تحقیقات میں سامنے ہیں، ممکن ہے جی سی بھاٹے کی انگریزی "تاریخ جدید مراٹھی ادب ۱۸۰۰ تا ۱۹۳۹" (پونا ۱۹۳۹) اور جے سی مارشمن کی سوانح کیری (لندن ۱۹۵۸) میں کوئی ذکر ہو۔

حضرت رام لعل نابھوی نے اپنے مقالہ میں "سنگھاسن بتیسی" کے پانچ "اردو مخطوطات" کی نشان دہی کی ہے مگر ان کا اضافہ جن وجوہ سے غیر ممکن ہے ان کی صراحت پیش ہے۔ یہ سبھی اندراجات "سنگھاسن بتیسی" کے عنوان سے ہیں اور یہ اندراج فہرست

خدابخش لائبریری پٹنہ" سے مستفاد ہے۔ پہلا نسخہ مترجم بہاری مل سے منسوب ہے لیکن "فارسی مناجات" کی فہرس میں بھی ۲۴۲ ہر ایک ترجمہ بہاری مل سے ہی موسوم ہے، اغلب ہے کہ یہ وہی فارسی کتاب ہے جو پروفیسر گیان چند سے ماخوذ اندراجات میں موجود ہے جس سے اردو ترجمے کا معاملہ ایک مشتبہ امر ہو جاتا ہے چنانچہ تفصیل کی عدم موجودگی میں اس کو ترجیحی بنیاد پر فارسی تراجم میں مشمولہ سمجھنا کافی رہے گا۔ دوسرا اردو مخطوطہ کسی مترجم سے منسوب نہیں ہے اور اس کی وضاحت صرف "داستانوں کا مجموعہ" کے الفاظ میں ملتی ہے جو ناکافی ہے۔ تیسرا داخلہ نقیر دکنی کی مثنوی کا ہے اور چوتھا بھی غیر منسوب ہے جب کہ پانچوں تلمیذ دردسے منسوب ہے۔ تیسرے اور پانچویں نسخے درج ہو چکے ہیں۔

فاضل ممدوح نے "سنگھاسن بتیسی" کے فارسی مخطوطات" کی فہرست سازی کرتے ہوئے ۳۶ نسخوں کو شریک رکھا ہے مگر اس فہرس میں تکرار ہے۔ اندراجات کی تفصیل غیر موجود ہے اس لیے اعادہ سے غیر محفوظ رکھنے کے خیال سے ہم نام داخلوں کے یک جا شمول پر یہاں قناعت کی جا رہی ہے۔ متعلقہ ذریعوں اور دیگر وسایل سے بھی معلومات کے حصول کی کوشش بار آور نہ ہو سکیں اس لیے فہرست ناھوی کی مکمل اور بعینہٖ فرداً فرداً شمولیت نہ تو ممکن ہوگی اور نہ ہی مناسب۔ ان قلمیات پر دستیاب اطلاعیں اسی تسلسل میں ترتیب دی جا رہی ہیں۔

(۴۹) "افسانہ ہائے بکرماجیت" مترجم نامعلوم دو نسخے بہ حوالہ "فہرست نسخہ ہائے خطی کتاب خانہ شعبۂ تحقیق و اشاعت کشمیر" مرکز تحقیقات زبان فارسی در ہند دہلی ص۱۳۲ (ممکن ہے دونوں ایک ہی ترجمے سے منقول ہوں)۔

(۵۰) "افسانہ ہائے بکرماجیت" مترجم غیر معلوم چار نسخے مختلف کاتبوں سے منسوب بہ نام سورج کول اور گوبند رام نیز براتے پاندیپ پر مانند بہ حوالہ ایضاً ص۱۳۲ و ۱۳۳ (ممکن یہ ہے کہ ایک ہی متن سے کتابت شدہ ہوں)۔

(۵۱) "بکرماجیت داستان ہائے" نامعلوم مترجم بہ خط کاپر و حوالہ ایضاً ص۱۳۹۔

(۵۲) "بکرم بتیسی ترجمہ سنگھاسن بتیسی" از کنہیا لال ہندی بہ حوالہ "فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان" مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان جلد چہارم (تالیف ڈاکٹر احمد منزوی ص۱۴۱۴) جہاں نام "لالہ کنہیا لال" تحریر ہے اور اسی جلد کے ص۲۱۳۵ کے ایک اور اندراج کا

ذکر ہے۔)

(۵۳) "سنگھاسن بتیسی" ترجمہ میر غلام حسین ماخذ ایضاً ص ۲۱۷ (اس کا داخلہ ج ۶ ص ۱۴۱۳ پر بھی ہے بہ حوالۂ مزید ج ۶ ص ۲۰۵۹ نیز تذکرۂ مخطوطاتِ نوشاہی ص ۱۱۵ بہ عنوان ترجمۂ سنگھاسن بتیسی"۔

(۵۴) "سنگھاسن بتیسی" از بدھ سنگھ غیرت مندرجہ ایضاً (ج ۶ میں بھی بہ صفحہ ۱۴۱۳ ایسی مذکور ہے بہ الفاظ "داستانِ بکرماجیت است")۔

(۵۵) "سنگھاسن بتیسی" ترجمہ ناشناختند" دو نسخے حوالہ ایضاً۔

(۵۶) "سنگھاسن بتیسی قصۂ بکرماجیت" نامعلوم مترجم ماخوذ از ایضاً ص ۲۱۷ (ایک اور تذکرہ معکوس عنوان سے "قصۂ بکرماجیت سنگھاسن بتیسی" مترجم غیر منسوب بہ حوالہ ایضاً ص ۲۱۴۵۔ اس دوسرے عنوان کی کچھ کیفیت ج ۶ ص ۱۱۸۱ شمار ۲۸۹ سے دریافت ہو سکتی ہے "ناشناختہ۔ یکی از ترجمہ ہائیش در مشترک ۴: ۲۱۷۸ گزشت" یہ جامعہ پنجاب کا قلمی نمبر آذر ۸ S ۵۴۷ ہے جو نستعلیق میں ہے اور مصنف و مترجم اور کاتب کی صراحت کے بغیر فیض علی جالندھری سے موسوم ہے۔ سنہ ۱۸۹۱ ب براے بکرمی درج ہے جو عیسوی ۱۸۲۴ کے مطابق ہے مگر یہ غیر واضح ہے کہ یہ سال کتابت تھا یا ترجمہ یا تصنیف کا برس۔ آغازِ عبارت: "شکر گویم بہ ذات قادر پاک برتر فہم ودا (کذا' غالباً: ورا) زادراک بی نشان است و قادر ردوانا کردہ است ظاہر تو بہ پنہاں۔ روزی تلوستمان در سبہ (یعنی سبھا) راجہ اندر جیو برقص آمد"۔ ان فقروں اور منقولۂ ذیل کلمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب جامعہ بمبئی میں مخزونہ فارسی "سنگھاسن بتیسی" سے مختلف ہے جس کے پہلے دس صفحے پروفیسر اے سی شکیکر صاحب نے عنایت کیے ہیں۔ ڈاکٹر احمد منزوی نے یہاں پہلی دو پتلیوں کی بات چیت سے ایک ایک جملہ تحریر کیا ہے": داستان بکرماجیت است "بوتلی" بابا سربند ہلے" بوتلی" (پتلی)۔ بوتلی ا گفت کہ اے راجہ بھوج ہر کس کہ یہ مثل راجہ بکرماجیت قدر و ہمت داشتہ باشد۔ بوتلی ۲: چوں راجہ بھوج باز ساعت دیگر خوش کرد"۔ تعداد صفحات ۱۴۰ تذکرہ نگار خضر نوشاہی کی سند پر۔)

(۵۷) "سنگھاسن بتیسی گنجینۂ داستان" مترجم غیر معلوم مذکورہ ایضاً۔

(۵۸) "سنگھاسن بتیسی" مفتاح الاکبر" ترجمہ نامعلوم حوالہ ایضاً (ایک اور تذکرہ معکوس

عنوان سے: مفتاح الاکبر سنگھاسن بتیسی" از غیر معلوم مترجم ماخذ ایضاً ۲۱۸)۔

(۵۹) "قصہ بکرماجیت" ترجمہ ناشناس" مذکورہ ایضاً ۲۱۷ (ممکن ہے مندرجہ بالا ۵۶ کا نسخہ ہو۔)

(۶۰) "سنگھاسن بتیسی" مترجم مختار سدا سکھ ماخوذ از ایضاً ج ۶ ص ۱۴۱۲ (احمد منزوی نے اس کا داخلہ "راہ نمائے کتاب" ص ۱۳۴۹ شمار ۳۹۲ سے دیا ہے)۔

(۶۱) "سنگھاسن بتیسی" مترجم نامعلوم مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر ۵۲۲۵/۸۱۴ (شیرانی)۔

(۶۲) "سنگھاسن بتیسی" مترجم غیر منسوب ذخیرہ مرکزی کتب خانہ پٹیالہ نسخہ ۳۲۸ء (تین اور ہم نام تذکرے بہ حوالہ نمبر ۳۲۹ نیز ۲۰۹۸ و ۳۲، ۲۷ جو ایک ہی مخطوطے کے بھی ہو سکتے ہیں)۔

(۶۳) "افسانۂ راجہ بکرماجیت" از غیر معلوم مخزونہ ایضاً نمبر ۸۱۳/اے/۲۵۸/۶۸۔

(۶۴) "سنگھاسن بتیسی" مترجم غیر مذکور بہ حوالہ "مرآۃ العلوم" کتاب خانہ خدا بخش ج ۳ نمبر ۳۹۸۳۔

(۶۵) "سنگھاسن بتیسی" از نامعلوم مخزونہ پنجاب آرکایوز پٹیالہ مخطوطہ ۴۳۰ء (ادارہ مذکور کے ناظم صاحب کے مراسلے مورخہ ۹۱/۱/۷ کے بہ موجب مترجم یا کاتب کا نام اندرجیت سریب ہے اور ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۲ء ہے، دیگر معلومات کا حصول ممکن نہیں ہو سکا ہے۔)

فہرست نابھوی میں ایک اہم اندراج رہ گیا ہے اور یہاں اس کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

(۶۶) "سہ ہری" متذکرہ ڈاکٹر احمد منزوی ج ۶ ص ۱۴۱۲ جو "راہ نمائے کتاب" ص ۱۳۴۱ء ۳۹۲ سے مستفاد ہے بہ عنوان "رسالہ سہ ہری ترجمہ سنگھاسن بتیسی"۔

جناب رام لعل نابھوی سے زیر التساب چیدہ مندرجات کے علاوہ ان کی فارسی فہرست میں جو داخلے ہیں ان میں سے چند ایک کا تجزیہ پیش ہے۔ چتر بھوج داس کے "شاہ نامہ" کے تین نسخے اس کے مشمولات میں ہیں جن میں سے ایک کے آگے یہ نام غیر مذکور ہے اور ایک جگہ "بھوج داس" منقول ہوا ہے۔ ایک "ترجمہ بدایونی" بھی

درج ہے لیکن عنوان "خرد افزا" کے بجائے "سنگھاسن بتیسی" ہی آیا ہے۔ ایک مترجم کا نام "کشندر نس" تحریر ہوا ہے جو ماخذ یا نقل میں کتابت کی غلطی ہے اور صحیح نام کشن داس ہے۔ اس کا نام "کشن بلاس" فہرست ہذا میں درج ہے مگر یہاں پر "سنگھاسن بتیسی" ہی ہے۔ ان ہی کشن داس کا صحیح نام تذکرہ منزوی ج ۶ ص ۱۴۱۲ میں بہ مع حوالہ ج ۳ ص ۲۱۷ و ج ۵ ص ۱۲ موجود ہے۔ ایک اہم اندراج "نسبت رائے" نامی مترجم سے منسوب ہے اور ظاہراً یہ وہی ادیب ہے جس کا نام چند وسیلوں سے "بسب رائے" روایت ہوتا آیا ہے اور قیاس غالب ہے کہ نسبت رائے ہی درست ہوگا۔ تاہم فہرست نابھوی میں محولہ منزوی ج ۶ ص ۱۴۱۳ پر یہ نام ٹائپ کی غلطی سے "بنت" ہوگیا ہے۔ ایک مترجم بہاری مل کا نام منزوی ج ششم سے اخذ ہوا ہے لیکن فہرست منزوی کے عین اسی مقام پر بہاری مل اور بھارا مل کھتری تحریر ہے۔ ایک اور مترجم کا نام "چندر بن" بہ حوالہ ج ۶ ص ۱۴۱۴ آیا ہے جب کہ اس جگہ تذکرہ مخطوطات پاکستان و ہند ج ۳ ص ۴۹۸ میں صحیح نام نقل ہوا ہے یعنی "چند ابن مادھو رام" جو پروفیسر جلبن کا مذکورہ "چاند ابن مادھو رام" ہے۔

حضرت رام لعل نابھوی کے متذکرہ فارسی تراجم میں ایک 'سنگھاسن بتیسی' کا اندراج خود ان کے ماخذ میں محض بر بنائے غلط فہمی ہوگیا ہے۔ اس کی تفصیل عرض ہے کہ ممدوح نے اپنی فہرست کے شمار ۲۱ پر ڈاکٹر احمد منزوی کی تالیف ج ۶ ص ۱۴۱۳ کی سند پر "سنگھاسن بتیسی" مترجم امر سنگھ کی کیفیت لکھی ہے۔ فاضل منزوی نے اپنے مولفہ تذکرہ مخطوطات میں اس جگہ بہ حوالہ فہرست مشترک پاکستان ج ۵ ص ۲۲۳ "امر پرکاش" نام نہادہ" تحریر کیا ہے جس سے خیال یہی ہوتا ہے کہ ان امر سنگھ کا فارسی ترجمہ "سنگھاسن بتیسی" یہ عرف یا اضافی عنوان رکھتا تھا۔ نسخوں کی نشان زدگی کے ضمن میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم کی تحقیق " ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" ص ۵۶ کا بھی حوالہ اس مقام پر ہے جس سے 'امر پرکاش' کی اصلیت آشکارا ہوگی۔ پروفیسر عبداللہ نے بہ عنوان "تراجم" اولاً "سنگھاسن بتیسی" کے اور اس سے متصل "رامائن کے مختلف تراجم" کی فہرست سازی ریو کے تذکرہ قلمیات برٹش میوزیم ج ۱ ص ۵۶ اکی مدد سے کی ہے۔ ان رامائنی ترجمات میں چوتھے اندراج (د) کی کیفیت یوں ہے "امر سنگھ منشی نے ۱۷۰۱ھ میں یعنی اورنگ زیب کے آخری سال میں اس کا ترجمہ کیا جس کا نام

-"امر پر کاوش" رکھا" اس کے ایک معنی یہی ہوتے کہ مجلدات احمد منزوی کے اپنے اندراجات کی موثق حیثیت تنقیح طلب ہے۔

تالیفات منزوی ج ۶ ص ۴۱۴۱ میں مشمولہ آخری نسخہ "سنگھاسن بتیسی" از "ن برائے "ناشناش" کی متعدد نقول کو یکجا کر دیا گیا ہے جو مختلف سرخیوں کی حامل ہیں۔ از قسم: "سنگھاسن بتیسی" ترجمہ سنگھاسن وترنستی"، "سنگھاسن بتیسی: قصہ بکرماجیت" "ترجمہ سنھاسناواترنستی"، "متن سنسکرت بہ نام سنھاسناواترنستی (افسانہ تخت) ترجمہ فارسی بھوج بکرماجیت"۔ ان میں سے کچھ نام بالکل نئے ہیں اور بظاہر علاحدہ علاحدہ کتابوں سے ان تراجم کا اکتساب ہوا ہے۔ تاہم ضروری تفصیلات کی عدم فراہمی کی وجہ سے انہیں بھی فرداً فرداً اپنی فہرس میں اضافہ کرنا احتیاط کے خلاف رہے گا۔

مذکورہ ۶۶ نسخوں میں "سنگھاسن بتیسی" کے اس سلسلہ میں تراجم میں سے کئی عدد مخطوطات ومطبوعات کے سنین تحریر یا اشاعت نامعلوم یا غیر متعین ہیں اس لیے افسوس ہے کہ اس پوری فہرس کی تاریخی اساس پر ترتیب نہیں ہو سکی۔ فی الوقت پروفیسر گیان چند جین کی قایم کی ہوئی ترتیب کا تتبع کرتے ہوئے ممکنہ توضیحوں اور اضافوں کی کوشش کی گئی ہے۔ تازہ معلومات کے حصول کا امکان بہرحال باقی ہے چنانچہ آیندہ اطلاعات کی بنیاد پر سن وار یا کم سے کم زبانوں کے لحاظ سے منقسم کر کے ازسرِنو فہرست سازی کی جاسکے گی۔ اس بارے میں ایک نوید تو یہ ہے کہ بزرگ ممدوح پروفیسر گیان چند کی تصنیفِ عالیہ" اردو کی نثری داستانیں" کا تازہ ترین اضافہ شدہ ایڈیشن انجمن ترقی اردو کراچی کے اہتمام میں زیرِ اشاعت ہے۔ انجمن کے ذرایع کے مطابق کتابت مکمل ہو چکی ہے جس کی صحت کے بعد عن قریب طباعت متوقع ہے۔ دوسری خوش خبری یہ ہے کہ حضرت رام لعل نابھوی نے "سنگھاسن بتیسی" کے تراجم پر ایک مبسوط مقالہ معلومات واندراجات کے نئے اضافوں کے ساتھ تحریر فرما کر انجمن ترقی اردو کراچی کو ارسال کر دیا ہے جو غالباً "قومی زبان" یا "اردو" میں شایع ہوگا۔

علاوہ ازیں راقم کی اپنی طالب علمانہ کاوشوں کا بیش تر بلکہ مکمل انحصار متعلقہ

ذخائر کے ذمہ دار افاضل کی عملی کرم فرمائی اور بزرگانِ کار کی سرپرستی پر ہے اور مستقلاً رہے گا جس سے فیض رسانی کے لیے خاکسار وقتاً فوقتاً استدعا کی جسارتیں کیا کرتا ہے۔ دوسری جانب بندگی بے چارگی سے لے کر "کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد" والی صورتِ احوال بھی ہے جو دائمی ہے! فہرستِ ہٰذا کو مبیّضہ کتاب کے آخری اضافے کے بہ طور اپریل ۱۹۹۱ء کے پہلے ہفتے میں شریک کیا گیا ہے تاکہ حوالۂ ناشرین ہونے تک اندراجات کی گرد آوری ممکن رہے۔

ادبی مرتبہ و مقام

للو لال جی کوی کے استحسان کی ضرورت

علوم و ہنر اور فنون و ادب کی دنیا کی ہر برگزیدہ شخصیت کی طرح للو لال جی کوی کو بھی آج قریب دو سو برس بعد مرے سے اس کی احتیاج نہیں ہے کہ ان کی توصیف و ستائش کے لیے کچھ کیا جائے۔ جیسا کہ اتنے بلند درجات پر فائز ایسی تمام شخصیات کے سلسلے میں ہوتا ہے ان کے کارناموں کا استحسان اور ان کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف دراصل ہماری اپنی ضروریات اور اغراض بلکہ ہماری انفرادی اور اجتماعی حاجات میں سے ہے تاکہ ہم انسانی سوسائٹی کی آیندہ بہتری و ترقی کے لیے اپنی تاریخ کے ایسے منارۂ نور سے روشنی حاصل کر سکیں اور معاشرے کی فوز و فلاح کے لیے اس سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اٹھا سکیں۔ روشنی کے ان میناروں کے وجود کو فراموش یا نظر انداز کر کے ہم ان کا تو ہرگز نہیں اپنا اور اپنی آنے والی نسلوں کا ہی نقصان کر بیٹھتے ہیں کیوں کہ نہ تو ان کی روشن و تابندہ کرنوں میں کوئی کمی ہو سکتی ہے اور نہ ہی ان کا نور کہیں خلاؤں میں گم ہو سکتا ہے بلکہ یہ کبھی ختم نہ ہونے والی روشنی اپنے منبع میں تا ابد محفوظ رہے گی اور اس کی ضوفشانی سے محروم انسانی نسلیں خود ہی بے بصارت و بے بصیرت کاروانوں کی طرح تیرہ و تار بیابانوں میں بھٹک بھٹک کر عدم کے خلاؤں میں کھو جائیں گی۔ عزیز احمد شاید اسی مناسبت سے کہہ گئے کہ زندگی کی:

شاہ رہ کی نبض خستہ رات کو رک جائے گی

ان بیابانوں میں کاہل کارواں مٹ جائیں گے

راقم سطور کو یہاں اپنے بزرگ معظم مخدوم اور مربی و سرپرست حضرت بسمل نثاری اعلی اللہ مقامہ کا یہ فرمودہ یاد آ کر خون کے آنسو رلا رہا ہے کہ میں آنے والی چوتھی پانچویں نسلوں کے پڑھنے والوں کے لیے اپنے دماغ کی روشنی اور قلب کی آگ کو ان حروف

میں منتقل کر رہا ہوں اور میں اپنا سینہ چیر کر یہ رازہائے سربستہ ان پر آشکار کروں گا برِصغیر میں لسانیاتی حقایق کے شارحین میں ڈاکٹر سہیل بخاری کا رتبہ و مقام ان کے دوران حیات شناخت اور تسلیم نہیں کیا جا سکا تھا اور راقم کے عاجزانہ تجزیے میں اس کی واحد وجہ یہ رہی کہ ہمارے یہاں ابھی اس درجے کے محققین و ماہرین السنہ کا کوئی وجود ہی نہیں جو ڈاکٹر سہیل بخاری کی منکشف کی ہوئی لسانی حقیقتوں کو انگیز کرنے کی صلاحیت سے متصف ہوں۔ گستاخی معاف بلکہ خاکم بہ دہن کہ اس سلسلۂ گفتگو میں یہ جملہ معترضہ قلم سے نکل گیا' لیکن خاکسار کا حقیر وجدان یہ کہتا ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری کا گراں مایہ و گراں قدر تجزیہ اپنے وقت پر حرف بہ حرف درست ثابت ہوگا۔

قدرناشناسی وناسپاسی کی مسموم فضا میں صد ہزار شکر کہ فورٹ ولیم کالج کے اردو تذکرہ نگاروں میں سے بزرگ مورخین اور جدید محققوں نے کسی قسم کے تحفظات کے بغیر نیز پوری پوری وسیع النظری و فراخ دلی سے للولال جی کوی کی ہندی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ للولال جی کوی کی ادبی کاوشوں پر تعارفی اوراق میں متعلقہ شہ کاروں کی تحسین میں چند اہم آرا۔ پیش کی گئی ہیں' جب کہ بہ طور خاص "لال چندریکا" اور "بیتال پچیسی" نیز "سنگھاسن بتیسی" اور "پریم ساگر" پر اظہارات علاحدہ ابواب میں درج ہیں۔ موجودہ وسایل کی کمی کے سبب اس کا کوئی علم نہ ہو سکنے کا واقعی افسوس ہے کہ ہندی ادبیات کے جدید تاریخی اور تحقیقی و تنقیدی کارناموں میں للولال جی کوی کے قلمی احسانات کے پرمایہ و پرثروت خزانے پر معاصر ہندی ادبا۔ کا کیا انفرادی اور مجموعی تاثر ہے۔ چناں چہ تفصیلی طور پر پتہ نہیں چل سکا ہے کہ للولال جی کوی کی موقر و موثر ادبی حیثیت کو تجزیاتی عمل سے گزار کر نئی ہندی تحقیق و تنقید میں ان کا رتبہ کیا متعین کیا گیا ہے چونکہ زیادہ جستجو کا موقع نہیں ملا فی الحال صرف چند مختصرات پر قناعت کرنی پڑ رہی ہے۔

اکادمی ادبیاتِ ہندوستان یعنی ساہتیہ اکیڈمی کی مکمل فہرست مطبوعات ۱۹۸۹ء کے جایزے سے معلوم ہوتا ہے کہ للولال جی کوی پر کوئی مستقل تصنیف درکنار "ہندوستانی ادب کے معمار" نامی مختصر سوانحی سلسلے تک میں للولال جی کوی پر اردو یا انگریزی کجا ہندی ہی میں کوئی تعارفی کتابچہ شایع نہیں ہوا۔ ساہتیہ اکیڈمی کے ابتدائی ادبی سیمینار ۱۹۵۷ء سے ترتیب دادہ جلد "کنٹمپریری انڈین لٹریچر" (طبع چہارم

دہلی ۱۹۸۱) فی الوقت زیرِ نظر ہے جس کا باب "ہندی ادب" سچدانند واتسیاین کا تحریر کیا ہوا ہے۔ سچدانند جدید ہندی ادب کے نقطۂ افتتاحیہ کے ذکر میں فورٹ ولیم کالج اور للو لال جی کوی کو صرفِ نگہ کرتے ہوئے سرِ آغاز کے طور پہ بھارتیندو ہریش چندر نیز ان کی تیز و تند ادبی تحریک کے شرکا و رفقا اور پیروکاروں کے نام لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجالِ اختلاف ممکن نہیں کہ بھارتیندو ہریش چندر ایک بڑے ہی فعّال و متحرک اور سرگرم و پرجوش انداز میں (جسے مشنری زیل کہنا چاہیے۔) ہندی زبان و ادب کی وکالت اور بہ عجلت تمام ترقی کی عملی جد و جہد میں اپنی حیاتِ ناثمات کو صرف کر کے اپنے نام کو ثمات اور دوام بخش گئے۔ آج ہندوستان میں سرکاری و غیر سرکاری سطحوں پر ان کی یاد آفرینی کا جو خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے اس کی اصل اور حقیقی وجہ ان کی وہ جوشیلی اور تیز تر احیائی تحریک ہی تھی۔ چناں چہ ان کے نام سے سال بہ سال اعزازات و انعامات کی اجرائی اور ان کی یادگار تقاریب کا انعقاد اسی کا حصہ ہے۔ اس پوری یاد آوری کے لیے بھارتیندو ہریش چندر بجا طور پہ حق دار تھے اور اس بارے میں دو رائیں ممکن نہیں۔ مگر ہندی زبان و ادب کے ارتقائی عمل میں ان کے پیش رو بزرگوں اور علی الخصوص خود للولال جی کوی کی وسیع اور دور رس قلمی فتوحات کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس لیے کہ للولال جی کوی کا کام وقتی یا ہنگامی قسم کا ہرگز نہیں بلکہ تاسیسی نوعیت اور دائمی اقدار کا مالک تھا اور اسی لیے للولال جی کو شہرۂ عالم کے علاوہ بقائے دوام کے دربار میں امتیازی منصب ملا۔

کتب خانہ جامعہ بمبئی کے ناظم پروفیسر اے سی ٹکیکر صاحب نے جیسا کہ کتابیات کے تعارف میں صراحتاً عرض کیا گیا ہے چند جدید تحقیقی کتب کو بغور ملاحظہ کر کے یہ ارشاد کیا کہ ان میں

"ONLY A FEW SCANTY REFERENCES TO LALLU LAL JI KAVI WERE FOUND."

ممدوح نے جو عکسی اجزاء ارسال فرمائے ان میں ڈاکٹر شاردا دیوی ودیالنکار صاحبہ کے یک جا نیز بسیط اور دل چسپ ادبی و لسانی مباحث (جن میں سے بہ خیالِ طوالت صرف "پریم ساگر" کے مفصل جائزے کی ترجمانی پر اکتفا کرنا پڑا ہے) کے علاوہ ڈاکٹر نیرج گویل اور ڈاکٹر سسر کمار داس کے اشارات ہیں جو للولال جی کوی کی توقیر و تکریم کا حق تو خیر ادا نہیں کرتے البتہ

ان کے حق میں کلمۂ خیر کی سی حیثیت انہیں ضرور حاصل ہے۔ انہی کلماتِ خیر میں ثانی الذکر فاضل کا ایک انکشاف بے شک بڑا اہم ہے اور تفصیلات کی عدم موجودگی پر قلق ہوتا ہے "دی صاحبس اینڈ منشیز" کے فاضل مصنف نے یہ مفید تاثر اجمالاً اور صرف اپنے ہی لفظوں میں تحریر کیا ہے کہ "فورٹ ولیم کالج کے زیادہ تر شہرت کا دارومدار اساتذہ پر تھا۔ ہندوستان کے ادبی مورّخوں نے یوروپی اساتذہ میں گل کرسٹ ـــــ اور ولیم کیری کو نیز کالج سے متعلق صرف تین ہندوستانی اسکالروں میر امنؔ، للولال جی کوی اور رام رام باسو کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے" (ص۱۰)۔ عجب تر یہ کہ ڈاکٹر سسر کمار داس نے فورٹ ولیم کالج کے دورِ عروج کی ان شخصیتوں کے مرتبے پر مورخین ادب کے اظہار اتفاق کے باوجود جن کی تفصیلات سے انہوں نے محروم رکھا ہے انہیں نظر انداز کر کے ان کے مجموعی کارناموں پر اپنی یہ رائے دی ہے کہ وہ فی الجملہ ناقابلِ لحاظ ہیں: "فورٹ ولیم کالج کے اسکالروں نے بہ مشکل ہی کوئی ایسا ادب پارہ تخلیق کیا جس کو ملک کی ادبی تاریخ میں نمایاں کہا جا سکے، اِلّا اس کے کہ ہندوستان کے نثری ادب کو انہوں نے ایک تحرک بخش دیا۔ متعدد زبانوں میں نثر کی ترقی میں ان کا عطیہ اگرچہ کہ بے حد اہم ہے، ان کی تحریروں کی Intrinsic ادبی قدر قابل اعتنا نہیں ہے" (ص۱۰)۔ ظاہر ہی ہے کہ ان سخت ناسپاس و قدر ناشناس خیالات سے کسی طور اتفاق ممکن ہی نہیں ہے، تاہم یہ ایک طویل و ناخوشگوار بحث کی بسم اللہ ہوگی۔

منقولہ دونوں بیانات کے درمیانی حصے میں ڈاکٹر سسر کمار داس ایشور چندر ودیا ساگر کو فورٹ ولیم کالج سے منسلک "واحد بڑا دماغ" قرار دیتے ہیں حالاں کہ بقول خود انہی کے ودیا ساگر نے اس ادارے سے اس کے دورِ آخر بلکہ آخری ایام میں وابستگی اختیار کی تھی۔ افتتاحی دور کی ایک شخصیت مرتن جے ودیالنکار کے بارے میں ان کا تاثر یہی ہے کہ سنسکرت کے ایک بڑے فاضل ہونے کے باوجود انھوں نے قدرِ اوّل یا دوم کی حامل کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی۔ حیرت ہے کہ خاص اس موقع پر محقق موصوف نے للولال جی کوی کی عظیم اور وسیع خدمات کو یاد کرنے کے لیے انہیں یکسر فراموش کر دیا۔ البتہ ایک ابتدائی باب میں للولال جی کوی کی بہ طور بھاکا منشی تقرری کے ذکر میں ڈاکٹر داس نے یہ رائے نقل کی ہے "اردو میں میر امن کی طرح انہیں (للولال جی کوی کو) جدید

ہندی نثر کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے" (ص۱۹)۔ للولال جی کوی کا ذکر ڈاکٹر نیرج گوپل نے "فورٹ ولیم کالج ایک اتہاس" میں مجمل انداز میں کر کے ان کی کتابوں کے نام گنوائے ہیں": ہندی گدیہ ساہتیہ کی مہان وبھوتیاں للولال جی تھا سدل مشر اسی کالج میں منشی کے پد پر کاریہ کرتے تھے۔ سمبت ۱۸۶۰ میں گل کرسٹ کے آدیش پر للو جی لال نے کھڑی بولی گدیہ میں "پریم ساگر" لکھا۔ "پریم ساگر" کا ادیشیہ سویلین چھاتروں کو ہندوستانی کی آدھار بھوت بھاشا "ہندوی" کا گیان کرانا تھا"۔ اس سے آگے للولال جی کوی کے بقیہ تراجم کا نام لے لیا گیا ہے اور بس۔ آگرا کالج کے پروفیسر ہندی ڈاکٹر ستیندر نے ۱۹۵۸ء کے ایک مقالے میں "پریم ساگر" کے مترجمین کے مقدمات سے کئی سطور اقتباس کیں لیکن للولال جی کوی کے ۱۸ ویں صدی کے ہندی ادب میں مقام پر رائے نہ دی۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ابتداً "انگریزوں کی سعی: فورٹ ولیم کالج" میں مؤلفین اور مترجمین کے نام مع ان کی تالیفات" میں للولال جی کوی کا جو احوال اختصار سے تحریر فرمایا آج اس کی حیثیت جدید ادبی تواریخ میں للولال جی کوی کے تذکروں کے افتتاحیے کی سی ہے۔ بابائے اردو کے وقیع اور یادگار الفاظ ملاحظہ ہوں": ۱۰) سری للولال کوی: کالج کے بھاشا منشی تھے۔ ان کا خاندان گجراتی تھا لیکن ایک مدت سے شمالی ہند میں آبسے تھے۔ فصیح ہندی نثر کی بنیاد اسی شخص نے ڈالی اور بہت صاف اور پاکیزہ نثر میں متعدد کتابیں لکھیں اور فی الحقیقت ہندی نثر کے حق میں مسیحائی کی اگرچہ ان کا سارا کام ہندی نثر سے متعلق ہے لیکن یہاں ان کا ذکر اس وجہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندی سے بعض بعض ترجمے اردو میں ہوئے اس میں انہوں نے مدد دی۔ مثلاً شکنتلا ناٹک سے ترجمے میں مرزا کاظم علی جوان کو ان سے مدد ملی۔ اسی طرح مظہر علی ولا اور دوسری للولال نے مل کر بیتال پچیسی لکھی جس کی زبان ہندی اردو کا خوب صورت میل ہے نیز انھوں نے ولا کو برج بھاشا سے مادھونل کے قصے کے ترجمے اور تالیف میں بہت مدد دی۔ نیز لطایف ہندی جس میں پر لطف قصے کہانیاں لطیفے امثال ضلع جگت وغیرہ درج ہیں سری للولال نے مرتب کی۔ یہ کتاب ہندوستانی اور ہندی دونوں میں ہے۔ کتاب کے آخر میں ہندوستانی انگریزی الفاظ کی فرہنگ بھی ہے۔ (۱۸۱۰) یہ کتاب بعد میں کمپنی کے ملازم سول سروس ولیم کار میکایل سمتھ نے بعد نظر ثانی و اصلاح شایع کی جس میں میر تقی میر

کی مثنوی شعلۂ عشق کا بھی اضافہ کر دیا ہے" (ص۴۹۵/۴۹۸)۔

ڈاکٹر عبدالحق کی اس تاریخی تحقیق موسومہ "اہل یورپ نے اردو کو کیا دیا" کو اردو زبان وادب کی اولین جامع تاریخ کے ایک حصے کے طور پر مکمل ہونا نصیب نہ ہوا پھر بھی فورٹ ولیم کالج کا یہ پہلا جائزہ تھا۔ بارش کے اس پہلے قطرہ کے مابعد سے آج تک اس میں کسی اشتباہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے کہ اردو میں فورٹ ولیم کالج کے سارے بزرگ اور جدید ادبی مورخین و ناقدین للولال جی کوی کو کس وسیع القلبی سے خراج پیش کرتے اور کتنی بلند نگاہی سے ان کے کارناموں کو دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ اس میں خود معاصر ہندی محققینِ ادب اور فنی ناقدوں کے لیے یقیناً بڑا اہم پیغام موجود ہے بلکہ ایک خاص سبق مضمر ہے جو اہلِ نظر سے کسی طرح پوشیدہ نہیں ہے۔ الغرض جدید ہندی ادبیات میں بہ طور پیش رو بلکہ بانی مبانی للولال جی کوی کی جو حیثیت اردو مورخوں اور محققوں کے تاثرات کی روشنی میں بنتی ہے وہ کلاسیکی نوعیت کی محسوس ہوتی ہے یعنی ہندی لٹریچر کے دورِ نو کے سرخیل کے طور پر آج خود للولال جی کوی کی تخلیقات کو کلاسک کا مرتبہ و مقام حاصل ہے جو بڑی حد تک نہیں بلکہ کلیتاً غیر متنازعہ بھی ہے مسلم الثبوت بھی اور متفق علیہ بھی۔ ذیل میں جو مشاہدات اقتباس کیے جارہے ہیں وہ للولال جی کوی کی ادبی عظمت و سربلندی کے مداح و معترف اربابِ تحقیق و انتقاد کے حقیقت پسندانہ محسوسات اور ان کے اخذ کردہ شعوری نتایج کو جامع ہیں۔ ان اظہارات میں غیر سنجیدہ روایتی، پُر تکلف یا مصنوعی خیالات کا شائبہ تک نہیں ہے بلکہ یہ آرائے گرامی ان صاحبانِ نظر کے متین اور قلبی تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ بہ پیش قرار ملاحظات پروفیسر سید محمد اور علامہ نیاز فتح پوری ایسے ثقہ اکابر سے لے کر ڈاکٹر عبیدہ بیگم اور ڈاکٹر سمیع اللہ جیسے تازہ واردِ ادبی مورخین کا نتیجۂ فکر ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ ان سب اسکالروں کے احساسات ان کی ادبی دیانت اور صداقت کے مظہر ہیں۔ علاوہ ازیں لسانی و سیاسی سطحوں پر للولال جی کوی سے موسوم کچھ متنازعہ امور پر چند علمائے السنہ وادب کے تنقیدی نکات معرضِ بحث میں آئیں گے مثلاً راجا شیو پرشاد ستارۂ ہند، پروفیسر عزیز احمد، ڈاکٹر سہیل بخاری، پروفیسر حبیب اللہ غضنفر وغیرہم۔

یہاں اس وضاحت کی شاید ہی کوئی ضرورت لاحق ہو کہ متذکرہ ادبا و افاضل

میں سے چند ایک زبان وادبیاتِ ہندی کے بھی بڑے پارکھ اور مزاج شناس اسکالرز بھی میں سے ہیں۔ مثلاً نیاز فتح پوری کا ہندی شاعری وادب سے متعلق تصنیفی کام گذشتہ مباحث کے ساتھ للو لال جی کوی کی شرح "لال چندریکا" کے تحت مذکور ہوا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نہ صرف ویدک اور سنسکرت کی لسانیاتی تفتیش و تحقیق میں برگزیدہ علمی مقام پر متمکن ہیں بلکہ ہندی کے کلاسیکی شعری ادب پر متعدد ناگری مطبوعہ و قلمی نسخوں کی اساس پر ایک بے مثال و بے نظیر کتاب "ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصّہ" ان کی یادگار ہے۔ پروفیسر حبیب اللہ غضنفر ہندی لٹریچر کی تاریخ نویسی کے ایک بڑے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے جو بوجوہ ممکن نہ ہوا لیکن نمونتاً ایک مختصر جلد نہ وہ تحریر کر گئے۔ اسی طرح ہندوستان میں اردو کے محققین میں ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی اور دیگر جامعاتی مصنفین کی طرح ڈاکٹر عبیدہ بیگم صاحبہ بھی علمی وادبی سطحوں پر ہندی داں فاضل شخصیتوں میں شمار ہوتی ہیں۔

للو لال جی کوی کی خدمات پروفیسر سیّد محمد کی نظر میں۔

"اربابِ نثرِ اردو" کے اختتامیے "نظرِ بازگشت" کی آخری سطور فورٹ ولیم کالج کے ہندی کارناموں کا احاطہ ان کے تاریخی تناظر میں کرتی ہیں، چنانچہ ان مشاہدات میں کالج کے وسیلے سے پھلنے پھولنے والے ہندی اور اردو دونوں ادبوں کے ارتقائی عمل کے تقابل اور ان میں واقع فرق باہمی کی توجیہہ کا خیال کار فرما ہے: "ڈاکٹر گل کرسٹ نے نہ صرف فارسی بلکہ سنسکرت اور دیسی بولیوں کی بھی مقبول اور مشہور کتابوں کا اردو ترجمہ کرایا اور حقیقی علمی فیاضی سے کام لے کر اردو کو کافی وسیع کر دیا۔ ہندی زبان کے ساتھ ان کی سرپرستی ایسی وسیع نہیں رہی جیسی کہ اردو کے ساتھ رہی ہے لیکن یہ کسی تنگ نظری کا نتیجہ نہیں۔ اس زمانے میں ہندی زبان بہ لحاظِ علم وادب کچھ بھی نہیں تھی۔ اس کی مختلف شاخیں مشرقی ہندی، مغربی ہندی، راجستھانی، بہاری وغیرہ ہیں پھر ان کی اور شاخیں اور بولیاں ہیں جن میں سارا ہندی لٹریچر منتشر ہے" (ص ۲۹۲)۔

ہندی کی اس بہ یک وقت وسعت اور انتشار کی حامل کیفیت پر "پریم ساگر" کے مرتب و مترجم ایسٹ وک کی بھی نگاہ تھی جس کا نقشہ اس نے اپنے مقدمہ مرتب میں

میں کھینچا۔ بعد کے عشروں میں ہندی کی اس ملی جلی صورت حال کی عکاسی ضروری تفصیلات سمیت گریرسن کے لسانیاتی جایزۂ ہند میں بڑی جامعیت کے ساتھ ہوئی ہے۔

غرضیکہ پروفیسر سید محمد کے نقطۂ نگہ سے فورٹ ولیم کالج کے دورِ عروج اور خاص کر خود گل کرسٹ کے عہد میں ہندی زبان اور لٹریچر کی بھی کوئی ایک شاخ شاعری اور اصناف ادب کے لحاظ سے ایسی وقیع و وسیع نہیں تھی کہ اس کی سرپرستی کر کے اس کا ذخیرۂ کتب بڑھایا جاتا۔ ہندی لٹریچر کا عہدِ زرّیں مغلیہ تسلط کا زمانہ اور بالخصوص اکبر جہاں گیر اور شاہ جہاں کا عہدِ حکومت ہے مگر اس دور میں زیادہ تر اردو شاعری پائی جاتی ہے علم و ادب کی اعلیٰ چیزیں بالکل مفقود تھیں۔ اس دور کے بعد اگر کچھ حقیقی اضافہ ہوا تو اس کالج کی سرپرستی سے۔ متاخرین اور حالیہ ہندی مصنفین کی ساری علمی مساعی کی بنیاد اسی کالج کی سرپرستی میں پڑی اور اس کی ساری موجودہ ترقیوں کا نقطۂ آغاز یہیں ملتا ہے۔ (ص ۲۹۲)

اس قولِ فیصل کے بعد اوّلاً للولال جی کوی کی دماغی فتوحات کی مستقل اہمیت و افادیت پر مولوی سید محمد کے توصیفی ملاحظات پیش ہیں۔ کتاب کے باب متعلقہ "للولال کوی" میں للولال جی کوی کے ایک رفیقِ شعبہ سدل مشرا کا بھی کالج کی اجتماعی کارکردگی کی رعایت سے نام لیتے ہوتے پروفیسر سید محمد نے لکھا: "ہندی ادبیات میں للولال کی تالیفات خاص طور پر اہم اور عہد آفریں سمجھی جاتی ہیں، وہ معیاری یا اعلا و فصیح ہندی کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک اور ہندی زبان کے ماہر سدل مصرا بھی فورٹ ولیم کالج میں تھے۔ ان دونوں نے ہندی زبان میں نثر نویسی کا میدان صاف کیا اور اپنی کتابوں کے ذریعے زبان و طرز بیان کا ایسا پسندیدہ نمونہ پیش کیا کہ متاخر ہندی اہلِ قلم نے اسی پر اپنی تحریروں کی بنیاد رکھی۔ ان دونوں نے اس زمانے کے عام اردو مولفین کے برخلاف اردو تحریر سے عربی فارسی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے کم اور برج بھاشا کے زیادہ سلیس اور عام فہم الفاظ داخل کیے اور اپنی کتابیں دیوناگری رسم الخط میں لکھ کر ہندی نثر نویسی کے اعلا نمونے قوم کے آگے پیش کیے۔ ان کی مساعی جیسا کہ ہندی ادبیات کا مطالعہ کرنے والے واقف ہیں نہایت کامیاب ہیں۔ ہندی نثر

نویسی میں ان کو مجدّد اور مخترع کا درجہ حاصل ہے" (ص۲۶۴/۲۶۵)۔

پروفیسر سیّد محمد کی وقیع رائے بڑی حد تک بلکہ صرف للولال جی کوی کے اچھے ذوقِ نمود پر صادق آتی ہے کیوں کہ ان کے فیصلہ کن الفاظ کی رو سے: "سدل مصرا للولال کے ادبی مددگار اور صرف ایک ہندی قصّے کے مولّف ہیں، البتہ للولال کی تالیفات زیادہ اور مختلف قسم کی ہیں" (ص۲۶۵)۔ مولوی سیّد محمد نے تب تک کی اپنی تحقیق کے مطابق للولال جی کوی کے ایک ہندی معاون ایک ہندی اسکالر کا نام لینا ضروری خیال فرمایا لیکن یہ امر واضح ہے کہ اگر تب تک کالج کے دوسرے رفقائے کار کی ساری ہندی خدمات سامنے آچکی ہوتیں تب بھی للولال جی کوی کے بارے میں پروفیسر سیّد محمد کے بنیادی تاثر میں شاید ہی کوئی فرق ہوتا۔ اس کا اندازہ نئی تحقیقات سامنے لانے والے جدید مصنفوں کی آرا۔ سے بہ خوبی ممکن ہے جن کی نگاہ میں شعبے کے دیگر ہندی علمار واد با۔ کی کارکردگی بھی ہے اور جو للولال جی کوی کی گراں مایہ قلمی کشود کی قدر و قیمت سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ پروفیسر سیّد محمد نے منقولہ رائے للولال جی کوی کی ادبی سوانح کی تمہید کے بہ طور دی اور پھر ان کی سات کتابوں کو متعارف کرایا۔

للولال جی کوی کے کارناموں پر نیاز فتح پوری کا تاثر۔

اردو میں ہندی کے شعری ادب کی جدید مختصر مفید تذکرہ نگاری اوّلاً علامہ نیاز سے یادگار ہے۔ اپنے اس جایزے "ہندی شاعری کی تاریخ" کے باب "ہندی لٹریچر ۱۸۰۰ کے بعد" میں نیاز فتح پوری کے پس منظری مشاہدات پروفیسر سیّد محمد کے نقطۂ نگاہ کا تسلسل ہیں: "اٹھارہویں صدی ہندی لٹریچر کی ترقی کے لیے نامبارک ثابت ہوئی، البتہ انیسویں صدی میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہندوستان میں قایم ہوگئی اور انتظامِ سلطنت کے لیے انگریزوں کو ضرورت ہوئی کہ وہ یہاں کی زبانوں سے واقفیت حاصل کریں اور اپنی زبان یہاں کے باشندوں کو سکھلائیں اس وقت پھر یہ تحریک زندہ ہوئی اور مغربی خیالات کی آمیزش مطالع کے رواج اور حکام کی ناگزیر توجہ سے ہندی اور اردو لٹریچر کا ایک جدید دور شروع ہوا۔ انیسویں

صدی کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کا منتظم اعلا ڈاکٹر جان گل کرسٹ تھا۔ اس نے کالج کے دیگر ارکان کپتان ابراہیم لاکٹ پروفیسر ٹیلر ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ کی مدد سے ہندوستان کے لٹریچر پر صرف اس لیے توجہ کی کہ یوروپین لوگوں کے لیے ایک سلسلۂ نصاب ایسا مرتب کیا جائے جس سے وہ یہاں کی مروجہ زبانوں کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ اس نے اس وقت کے ماہرین زبان کو جمع کیا اور ان سے متعدد کتابیں لکھوائیں جو زیادہ تر اردو کی تھیں۔ ہندی زبان کے لیے للولال جی اور سدل مصرا کا انتخاب کیا گیا۔ ہندی لٹریچر کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ نثر میں باقاعدہ کوئی کتاب اچھے پیمانے پر مرتب کی جائی" (ص ۳۹/۳۸)۔

اس ادبی اور واقعاتی پس منظر میں للولال جی کوی کی قلمی نمود نے جو بنیادی اور رہ نمایانہ خدمت سرانجام دی اس کا توصیفی خلاصہ علامہ نیاز نے اس طرح پیش کیا کہ "للولال جی قوم کا برہمن اور گجرات کا رہنے والا تھا مگر ایک عرصے سے شمالی ہند میں بود وباش رکھتا تھا۔ یہ ایک ذہین اور قابل شخص تھا' چنان چہ اس نے سدل مصر کی مدد سے موجودہ ہندی لٹریچر کی بنیاد قایم کی۔ اس وقت شمالی ہند میں بہت سی بولیاں رائج تھیں لیکن سب سے زیادہ فصیح وسلیس صرف اردو تھی جو شرفا۔ اور پڑھے لکھے طبقے کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ للولال جی نے کوشش اس امر کی کی کہ اردو میں جو الفاظ فارسی وعربی کے کثرت سے پائے جاتے ہیں ان کو علاحدہ کر کے ہندی الفاظ ان کی جگہ لے لیں۔ چنان چہ سب سے پہلے اس نے ایک کتاب "پریم ساگر" مرتب کی جو بھگوت پران کے دسویں باب کا ترجمہ ہے' یہ کتاب ۱۸۰۳ میں شروع ہوئی اور ۱۸۱۰ میں تمام ہوگئی۔ اس کے بعد ۱۸۰۹ء میں "راج نیت" کی تصنیف شروع کی گئی جو برج بھاشا زبان میں تھی۔ پھر "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" لکھی گئی جن کی زبان اردو ہندی ملی ہوئی تھی۔ للولال نے اسی سلسلے میں بہاری لال کی "ست سئی" کی شرح لکھی اور اس کا نام "لال چندریکا" رکھا" (ص ۳۹)

ازاں بعد نیاز فتح پوری نے للولال جی کوی کی پیروکار ایک متعاقب شخصیت کے تذکرے میں یہ تبصرہ اضافہ کیا" : راجہ شبو پرشاد : للولال نے جس زبان میں کتابیں لکھیں وہ اس اعتبار سے بہت مشکل تھیں کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے

موجود تھے۔ اس کی طرف سب سے پہلے راجہ شیو پرشاد ۱۸۲۳/۱۸۹۵ نے توجہ کی اور غالباً یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے موجودہ ترقی یافتہ ہندی زبان کی بنیاد قایم کی۔ اس نے تمام مشکل الفاظ سنسکرت کے اس سے خارج کر دیتے اور وہ بولنے لکھنے کے لیے زیادہ آسان ہوگئی" (ص ۳۹)۔ یہ گویا اسی عمل کا تسلسل تھا جس کا آغاز للولال جی کوی کی قلمی کشور کشائی نے ابتدائے صدی میں کیا تھا۔ للولال جی کوی پر انہی راجا شیو پرشاد کے ایک جملۂ معترضہ کا حوالہ یہاں ضروری ہوگیا ہے۔

راجا شیو پرشاد نے عربی فارسی لفظیات سے للولال جی کوی کے شعوری اجتناب کو معرضِ تنقید میں لاتے ہوتے لکھا تھا: "اس انیسویں صدی کے شروع میں جان گل کرسٹ صاحب نے میرامّن اور للولعل جی کو حکم دیا کہ نثر کی کتابیں اس ملک کی زبان میں ایسی تصنیف کریں جن کو پڑھ کر صاحب لوگ اس ملک والوں کی بولی سمجھ لیویں۔ دونوں مصنف بے شک حیران ہوتے ہوں گے کیوں کہ یہ ان کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ دونوں نے کتاب لکھی لیکن دونوں کو ایک نئی زبان بنانی پڑی۔ للولعل نے تو "پریم ساگر" میں سے بالکل فارسی لفظ خارج کیے یہاں تک کہ اپنے مربّی ڈاکٹر گل کرسٹ کے لیے بھی "صاحب" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ افسوس للولعل جی یہ بھول گئے کہ خود ان کے نام کا آدھا یعنی "لعل" لفظ فارسی ہے"۔[۱] للولال جی کوی کے ادبی رویّے سے راجا شیو پرشاد کا تعرض قابلِ فہم ہے لیکن للولال جی کوی کے نام کی بنیاد پر گرفت کھلی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ للولال جی کوی گجراتی خاندان سے تھے اور گجراتی زبان کے علاقے میں رام لال یا موتی لال یا للولال میں موجود ہندی لال کے بجائے شمالی ہند کے عربی فارسی داں ہندو گھرانوں میں مستعمل اور دخیل عربی فارسی ناموں مالک رام و اقبال رام نیز موتی لعل و جواہر لال کا کوئی متوازی رواج نہیں پایا جاتا۔ اس کا انحصار بڑی حد تک مسلمانوں کے تہذیبی اثرات کو قبول اور فارسی زبان و خط کو اختیار کرنے کی روایت پر تھا جو شمالی ہند بہ مع پنجاب میں تو صدیوں سے موجود تھی مگر گجرات کے خطے میں اس کے نفوذ کے ویسے اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ "بیتال پچیسی" کے مرتب ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا تاثر رہا ہے کہ "شری للولال کوی ذات کے برہمن تھے اور چوں کہ ان کا بچپن شمالی ہند میں گزرا تھا اس لیے ان کی برج

[۱] حاشیہ دیکھیے اگلے صفحہ پر۔

بھاشا سنسکرت اور دیگر پراکرتوں پر عالمانہ قدرت قرین قیاس ہے۔[1] لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس کا تعلق بھی خاندانی ہجرت اور شمال میں آمد سے اتنا گہرا اور مضبوط نہیں جتنا کہ اس خاندان کے طویل گجراتی پس منظر سے ہے۔ کیوں کہ شمالی ہند کے برہمن خاندانوں کی ایک دیرینہ و مستحکم روایت قدیم السنہ ہند کے علاوہ بلکہ ان سے زیادہ عربی و فارسی کی علمی ادبی سطح پر تحصیل سے وابستگی کی رہی ہے اور ظاہراً للولال جی کوی کا اس رواج سے رشتہ استوار نہ ہو سکا تھا۔ اسی طرح اور ان ہی اسباب سے للولال جی کوی کے نام میں ان کے پرکھوں کے ترکِ وطن اور ماحول کی تبدیلی کی بنیاد پر مفروضہ لغوی تبادل اور اس پر مبنی راجا شیو پرشاد کے اعتراض کی بھی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

اسی تسلسل میں یہاں "کھری" ہندی کے مبینہ طور پر للولال جی کوی سے منسوب کیے جانے کا واقعاتی تجزیہ بھی ناگزیر ہو رہا ہے کیوں کہ زبان اور تحریر دونوں ہی کے حوالے سے کچھ باتیں بالکلیہ غلط طور پر ہی للولال جی کوی سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ اردو اور ہندی کے لسانی و سیاسی تنازعے کی ابتدا کی بحث ہماری ادبی تواریخ میں آج تقریباً دو صدیوں سے جاری ہے اور پاک و ہند کے مختلف حلقوں میں وقتاً فوقتاً یہ گفتگو چھڑتی رہتی ہے۔ یہاں اس کے نفس موضوع سے کوئی غرض نہیں ہے بلکہ للولال جی کوی کی ہندی ادب و زبان کی احیائی مساعی سے اس کے رشتہ و تعلق پر قایم مفروضات اور پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کے ہی ازالے کی خاطر اختصار سے اس کی حقیقت و اصلیت کو نقاب برافگندہ کرنا مقصود ہے۔ چوں کہ للولال جی کوی کی ادبی منزلت میں یہ ایک ایسا پہلو ہے کہ محض بربنائے غلط فہمی اس سے چند شکوک و شبہات منسلک کر دیے گئے ہیں اسی لیے جدید ہندی ادبیات اور زبان کے احیاء اور نفاذ کے تئیں للولال جی کوی کے موثر عطیے اور محولہ نزاع میں چند انگیز افسروں کی مفسدانہ ذہنیت پر اجمالاً نگاہ کی جا رہی ہے۔

---

[1] راجا شیو پرشاد ستارۂ ہند منقول از: "رجب علی بیگ سرور، حیات اور کارنامے" مصنفہ ڈاکٹر نیر مسعود رضوی لکھنؤ، ۱۹۶۷ء بہ حوالہ مقالہ "فورٹ ولیم کالج" از ضمیر نیازی مشمولہ "فورٹ ولیم کالج" وقار عظیم ص ۲۱۷/۲۱۸۔

للّولال جی کوی کا جدید ہندی کے احیاء و نفاذ میں حصہ۔

پروفیسر حبیب اللہ غضنفر نے للولال جی کوی سے وہ کچھ منسوب کر دیا ہے جو حقائق کے خلاف بھی ہے اور غلط فہمی کا بھی موجب ہے: "ہندی کتابیں لکھنے پر شری للولال جی اور سدل مصرا مامور ہوئے۔ للو جی نے اپنی نئی زبان کا نام کھڑی ہندی تجویز کیا کہ اس میں سے فارسی عربی الفاظ خارج کر دیئے گئے ہیں اور اس طرح یہ خالص زبان ہو گئی۔ بعض لوگ اس کو اونچی ہندی کہنے لگ گئے کیوں کہ عوام الناس کی بول چال سے اعلا واقع ہوئی تھی۔ اس زبان کی سب سے پہلی کتاب "پریم ساگر" ہے جو بھاگوت پر ان کے دسویں باب کا ترجمہ ہے مگر جس طرح "باغ و بہار" "نو طرز مرصع" کی اصلاح شدہ شکل ہے اسی طرح "پریم ساگر" چتربھوج مصرا کے ترجمے کی اصلاح ہے۔ مگر شاید یہ اسلوب للولال جی سے خود نہ نبھ سکا اس لیئے "ہتو پدیش" اور "پنچ تنتر" کا ترجمہ "راج نیتی" کے نام سے برج بھاشا میں کیا۔ یہ دونوں کتابیں کلیلہ و دمنہ کی اصل بتائی جاتی ہیں۔ "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" میں ہندی اور اردو دونوں زبانیں لکھی گئی ہیں۔ سدل مصرا نے "ناسکیتوپکھیان" میں ناچی کیش کی کہانی ہندی نثر میں لکھی" (ص ۸۹) للو لال جی کوی کے تاسیسی ادیبانہ کردار کا یہ مختصر تذکرہ گویا ایک نئے سلسلۂ بحث کا سر آغاز ہوا۔

للولال جی کوی سے منسوب پروفیسر حبیب اللہ خاں کے انہی الفاظ سے پیدا شدہ غلط فہمی کی بنا پر ضمیر نیازی نے "فورٹ ولیم کالج" پر مقالے میں علامہ عبداللہ یوسف علی کا ایک تاثر پیش کرتے ہوئے "کھڑی ہندی" سے متعلقہ پروفیسر غضنفر کے منقولہ بالا قول سے مدد لی ہے۔ ضمیر نیازی نے کالج کے وسیلے سے "لسانی اختلاف کی بنا" رکھنے کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے لکھا[۲]: "ہندوستانی زبان کے پس پردہ ایک نئی زبان بنائی گئی جسے ہندی کا نام عطا کیا گیا۔ بقول عبداللہ یوسف علی: شری للولعل نے ٹھیٹھ ہندی میں جو نثر لکھی اس نے ایک مصنوعی زبان

---

۲ ضمیر نیازی: حوالہ گزشتہ ص ۲۱۷-۳: ایضاً بحوالہ علامہ عبداللہ یوسف علی: "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" کراچی، ۱۹۶۷ ص ۱۳۱۔

کی بنیاد ڈالی جو اس زبان سے جو عام طور پر بولی جاتی تھی بالکل علاحدہ معلوم ہوتی تھی۔ اس نئی زبان کا نام "کھری ہندی" تجویز کیا گیا جس میں عربی اور فارسی کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔"

للولال جی کوی اور ان کے ترجمہ "پریم ساگر" کے متنازعہ الفاظ "کھری ہندی" کا جہاں تک تعلق ہے یہاں یہ معاملہ صاف کر دینا ضروری ہے کہ اس تصور بلکہ مفروضے کی اپنی صداقت کیا ہے۔ پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ للولال جی کوی نے ہرگز "کھری ہندی" کے الفاظ نہیں لکھے ہیں بلکہ "کھڑی" تحریر کیا ہے جیسا کہ "پریم ساگر" کے باب میں مقدمہ مترجم کو اردو رسم خط میں بعینہ ملاحظہ کیا جائے گا۔ ظاہر ہی ہے کہ للولال جی کوی کی مراد خالص ہندی یا جیسا کہ فرض کیا گیا "کھری ہندی" نہیں ہو سکتی جو ان سے محض غلط فہمی سے منسوب کر دیا گیا۔ دیگر یہ کہ اس تصویر کے دو رُخ ہیں جن میں سے ایک ہے خالصتاً لسانی تو دوسرا ہے سیاسی یعنی ہندی اردو لسانی مسئلہ بلکہ تنازعہ۔ ان دونوں پہلوؤں پہ ہمارے عہد کے دو بڑے علماء ڈاکٹر سہیل بخاری اور پروفیسر عزیز احمد نے للولال جی کوی کے حوالے سے ہی گفتگو کی ہے جس سے استفادہ ضروری ہے۔ اگرچہ یہ ایک واقعہ ہے کہ للولال جی کوی سے غلط طور پر منسوب "کھری ہندی" اور "کھری بولی" کی نزاعی بحث نئی نہیں ہے لیکن اس کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں اکثر و بیشتر جدید ہندی ادب و زبان کے تجدیدی عمل میں ہی نہیں بلکہ علوم کے ارتقاء میں للولال جی کوی کی عطایا پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ تاہم اوراق ہٰذا کی محدود گنجایش میں اس گفتگو کے اضافے کی یہ افادیت ضرور محسوس کی جائے گی کہ یہاں یہ تذکرہ مثبت انداز میں اور للولال جی کوی کے کارناموں کو پیش منظر میں رکھ کر شریک کیا جا رہا ہے۔

"کھڑی بولی" اور "کھری ہندی" کی علی الترتیب حقیقی اور مفروضہ اصطلاحات کی لسانی اساس پر جانچ پرکھ دورِ جدید کے بزرگ ماہر السنہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے نہایت افادی انداز میں کی ہے۔ "اردو کا روپ" نامی جامع اور وقیع لسانی تحقیق کے باب "اردو

---

[a] ایضاً بہ حوالہ پروفیسر حبیب اللہ غضنفر اقتباس منقولہ گزشتہ از ص ۸۹

کا گھرانا اور گھر میں" اردو کے نام اور دیس" کے موضوع پر ڈاکٹر سہیل بخاری نے یہ صفحات ۱۰۱، ۱۰۲ اور ۱۰۸ پر چند تجزیات پیش کیے ہیں جو مختصراً اقتباس کیے جا رہے ہیں: "آخر میں اپنی بولی کا ایک اور نام گنانا چاہتا ہوں اور وہ ہے کھڑی بولی۔ یہ نام اب تک کی چھان بین سے پہلے پہل فورٹ ولیم کالج کے منشیوں للولال جی اور سدل مسر کی کتابوں میں ملتا ہے اس کے آگے دوسروں کی زبانوں پر بھی چل نکلا اور آج بولی کے سب عالموں میں پھیل چکا ہے" اس سلسلے میں مختلف نکات اور آراء پر مدلل اظہار رائے کے بعد ڈاکٹر سہیل بخاری نے للولال جی کوی کے لیے ہوئے نام "کھڑی" کی توجیہہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: "جہاں یہ ہو سکتا ہے کہ للولال جی اور سدل مسر نے عربی فارسی کے بول نکال کر اسے کھری یا کھڑی بولی کہا ہو وہاں یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے بھی اس کا یہی نام ہو اور ان لوگوں نے پھر سے یہ نام لے دیا ہو۔ یہ بھی نری اٹکل ہی کی بات ہے کہ اس کا نام پہلے پہل کھری ہوا جو بگڑ کر کھڑی ہوا۔ پھر للولال جی کی بات بھی سننا چاہیے جو کہتے ہیں کہ "میں نے یہ کہانی آگرے کی کھڑی بولی میں لکھی ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دنوں دلی آگرے کی کھڑی بولی ٹکسالی سمجھی جاتی تھی اور یہ کہ کھڑی بولی کا نام انہوں نے آپ گھڑا تھا۔ یہ بولی ان دنوں اسی نام سے مشہور رہی تھی کیوں کہ بولی کا وہی نام لیا جائے گا جس نام سے سب لوگ اسے پہچانتے ہیں۔ انھوں نے دلی اور آگرے کا نام اس لیے لیا کہ ان جگہوں کے لوگ اس بولی کو اس نام سے جانتے اور پکارتے تھے"۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اس گفتگو کے تسلسل میں اردو کے مختلف و متعدد ناموں کے ذیل میں اس کے گھرانے یا دیس کے تعین کے لیے دوسرے ناموں کے ساتھ اسی نام کھڑی بولی پر انحصار فرمایا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "کھڑی کا نام بھی ان ہی چاروں سے ملتا ہے جس کا پچھ لگوا "ای" (کھڑ+ای = کھڑی) اس کے دیس "کھڑ" سے اپنا ناتا دکھا رہا ہے اور "کھڑ" کا بول کھنڈ یا کھونڈ کا چھوٹا روپ ہے۔ یوں کھڑی بولی کا مطلب ہوا کھڑ کھنڈ یا کھونڈ کی بولی: کھنڈی/کھونڈی اور کھنڈ یا کھونڈ اڑیسا بھارت کے پچھم کا دیس کہلاتا ہے۔ اس دیس میں آج جو بولی بولی جا رہی ہے اسے بھی کھڑی یا کھڑیا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کے نتیجہ خیز تدقیقی عمل کو "پریم ساگر" اور للولال جی کوی کے حوالے سے رونما ہونے والے متنازعہ ادبی مباحثے کی مثبت سمت میں با معنی پیش رفت تسلیم کیا جانا چاہیے اس لیے کہ اس وسیلے سے علمی سطح پر تمام تر مفروضات

اور ساری غلط فہمیوں کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ کھڑی بولی کے نام کی قبل ازاں موجودگی پر ڈاکٹر سہیل بخاری کے تحقیقی تاثر کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ مثلاً تھا مس روبک کے شروع کیے ہوئے اور بعد میں تارنی چرن متر کے مکمل کیے ہوئے منصوبے "کھڑی بولی کی کہانیاں" کا بھی علم ہوتا ہے۔

پروفیسر عزیز احمد نے ہندی اور اردو کے لسانی اور سیاسی اختلافات پر محیط اپنے عالمانہ تجزیے میں للولال جی کوی کے طرز نگارش کے ہی خاص حوالے سے جامع گفتگو کی ہے اور للولال جی کوی پر گریرسن کا قول پیش کیا ہے۔ اس بحث کے اصل یا مترجمہ الفاظ کے بجائے اس کی ملخص ترجمانی: "جدید ہندی جو شمالی ہند کے ہندوؤں کی بڑی ادبی زبان ہے کہا جاتا ہے کہ اسلامی اثرات کی مفرس اردو سے علاحدہ تشخص اور ہندو احیائیت کی شعوری کوشش کے بہ طور معرضِ وجود میں آئی۔ گریرسن کی رائے ہے کہ "یہ جدید لااصل ہے اور گزشتہ برسوں یعنی ۱۹ویں صدی کے اوائل میں انگریزوں کے اثرات کے تحت متعارف ہوئی۔ جب تک ہندو نثر نگار اردو نہیں بلکہ مقامی بولیاں اودھی، بندیلی برج وغیرہ استعمال کرتے تھے۔ للولال نے ڈاکٹر گل کرسٹ کی تحریک سے مشہور و معروف "پریم ساگر" لکھ کر اس رویے کو تبدیل کیا۔ "پریم ساگر" کے نثری اجزا اردو میں لکھے گئے" اس فرق کے ساتھ کہ اردو میں مستعمل فارسی الفاظ کی جگہ ہند آریائی الفاظ داخل کیے گئے۔ اس طرح بالائی دوآبے کے عام لہجے کی خود بہ خود مراجعت ہوئی۔ یہ انوکھا تجربہ آغاز سے ہی کامیاب رہا اور اس اولین کتاب سے سارے اچھے ہندوؤں کی توجہ کے لیے پرکشش ثابت ہوا۔ اس طرح اس زبان نے عام خواہش کی تکمیل کی، اس نے ہندوؤں کو لنگوا فرینکا یا رابطے کی عام زبان بخش دی۔ اس نے وسیع طور پر مختلف علاقوں کے لوگوں کو اس قابل کر دیا کہ مسلمانوں کے ناپسندیدہ الفاظ کو استعمال کیے بغیر ایک دوسرے سے بات چیت کریں۔" (لسانیاتی جائزہ ج ۹/ اصل ۱) تاہم گریرسن کی اس رائے پر ہندو علما شیام سندر داس اور رام چندر شکل نے سخت اعتراض کیا جن کے خیال میں للولال کوی کی جدید ہندی کھڑی بولی کا اولین نمونہ نہیں ہے اور اس سے قبل کے بھی چند آثار ملتے ہیں۔ للولال کے وقتوں سے ہندی میں ایسے کچھ اصولِ نگارش طے پا گئے جو اس کو اردو سے مختلف اور سنسکرت سے قریب تر کرتے ہوں۔ جدید ہندی کے دو

مراکز آگرہ اور بنارس میں تشکیل پائے ثانی الذکر سنسکرت سے زیادہ تعلق وقربت کے حق میں ہوا" (اسلامک کلچر" ص۲۴)۔ گریرسن کے خیالات کی صدائے بازگشت "پریم ساگر" کے ہی خاص حوالے سے "لال چندریکا" کے تعارف میں بھی ملتی ہے جو اس کے اپنے الفاظ میں منقول ہو رہی ہے جہاں اسی سلسلۂ گفتگو کے اور پہلوؤں پر اس سے روشنی پڑے گی۔ عزیز احمد نے ص۲۵۴/۲۵۵ پر یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ اردو میں ہندوستانی ماحول یا فضا کے فقدان یا استرداد کے رویے کے باعث ہندو اکثریت کی جانب سے اردو کو ہی رد کر دیا گیا جس نے للولال جی کوی کی ادبی تجربات کی روشنی میں جدید ہندی کو اپنا لیا جو اردو کی ہندو وانہ اور سنسکرتیائی ہوئی صورت ہے۔ اس تاثر کا آخر الذکر جزو گریرسن" (ماڈرن ورنیکلر لٹریچر" ص۱۰۷) سے ماخوذ ہے۔ ڈاکٹر شاردا دیوی ودیالنکار نے بہ صفحہ ۰۷ یہ اطلاع دی ہے کہ گریرسن کے اظہارات سے متذکرہ اختلاف "شیام سندر داس نے "ہندی شبد ساگر" (۱۹۲۹) اور رام چندر شکل نے اپنے "اتہاس" (۱۹۳۱) میں کیا ہے۔ عزیز احمد نے ایک اور مقام پر للولال جی کوی کے جدید ہندی کے افتتاحی عمل کی جانب اشارہ کیا ہے جس کا "پریم ساگر" کے مقدمۂ مترجم میں مستعملہ ایک خاص لفظ سے تعلق ہے اور اس زاویے سے یہ حوالہ اس موقع پر تحریر ہو چکا ہے۔

غرض پروفیسر عزیز احمد کے ملاحظات سے بھی عیاں ہے کہ وہ "ہندوستانی فضا میں تہذیب اسلامی کے مطالعات" نامی اپنی تاریخ علوم و افکار کے باب "تہذیبی امتزاجات: اردو اور ہندی" کے مباحث متعلقہ "ہندی ادب: ہندو ذہن اور مسلمانوں کی عطایا" کے وسیع تر تناظر میں للولال جی کے تصنیفی طرز اور ادیبانہ رویے میں اردو کے مجموعی مزاج سے اختلاف کی بنا پر ہندی کی طرف ہجرت کے عمل کو کسی طرح بھی معاندانہ کارروائی یا بغض للّٰہی نہیں سمجھتے جب کہ اولاً منقولہ آرا سے ہم خیال اردو داں اسکالروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس ذہنیت کا مظاہرہ متعدد مواقع پر ہوا ہے جس کے سلسلے میں نفی و اثبات کے مباحثے ہر بار از سر نو شروع ہوئے اور کچھ نہ کچھ طوالت پکڑ کر ختم بھی ہو گئے۔ سطور ہذا میں ان کی غرض و غایت اور موضوع کی اپنی افادیت یا عدم افادیت کے بحث و تمحیص سے چنداں تعرض مقصود ہے اور نہ ممکن البتہ للولال جی کوی کی اس مقدمے سے برأت مطلوب ہے!

للولال جی کوی کے جدید ہندی زبان وادب کے احیائی عمل میں تخلیقی عطیے کے بارے میں متذکرہ خاص الخاص حوالے سے یہاں یہ عرض کرنا ناگزیر ہے کہ تمام تر واقعاتی حقایق و شواہد کی رو سے ہندی اردو میں باہمی افتراق کی بنا رکھنے کو کسی طور بھی للولال جی کوی کی سازش کجا ان کی حرکت ہرگز ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بد قسمتی سے محض مفروضوں کی بنا پر للولال جی کوی کے وسیع البنیاد تصنیفی عمل کو اس کا ذمہ دار گردان کر للولال جی کوی کو اس لسانی وادبی اور سیاسی تنازعے میں تنہا محرک کے بہ طور ملوث کر دیا گیا جو ان کی ذات پر یقیناً بڑا ظلم تھا کہ ایسی کسی مبینہ ذہنیت کو ان کی قلمی کارکردگی کا لازمی جزو سمجھ لیا گیا۔ کھڑی اور کھری کی اصل حقیقت کو لسانیاتی سطح پر انگیز کرنا درکنار بالراست "پریم ساگر" کے مقدمے کی متعلقہ سطور سے رجوع کی ضرورت ہمارے ہندی داں بزرگوں نے فراموش کر دیا اور کھری ہندی کے غلط تصور کو اس طرح للولال جی کوی سے بلا تردد نسبت دینے میں ان سے سہو ہو گیا۔ بالفرض محال صورت معاملہ اگر واقعتاً وہی ہوتی جو للولال جی کوی سے منسوب ہوئی تو پروفیسر سید محمد ایسے فدائے اردو استاد اور ادیب اس سے قطعاً صرف نگہ نہ کرتے اور ان امور کا واضح حوالہ دیتے جب کہ مولوی سید محمد نے للولال جی کوی کے تذکرے میں کلیتاً حقیقت پسندانہ طریقے سے انہیں ہندی ادبیات کا صحیح معنوں میں "مجدد" اور جدید ہندی طرز نگارش کا بالکل بہ جا طور پر "مخترع" قرار دیا ہے۔ صاحب ارباب نثر اردو کے رو برو "پریم ساگر" کا ایسٹ وک ایڈیشن موجود تھا اس لیے ان سے کسی طرح بھی "ایک غلطی کی گنجایش تک نہ تھی جس کا اعادہ "پریم ساگر" کا صرف نام لے کر مفروضہ قایم کرنے والے افاضل نے مختلف اور متعدد مواقع پر کیا۔ اس کا ایک قبیح نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ان بزرگوں اور اس غلط فہمانہ تصور کی ترویج واشاعت کے طفیل خود ان حضرات کی اور بعد میں آنے والے مصنفوں اور نقادوں کی بھی نظروں سے اس پورے ادبی وسیاسی نزاع کے اصل محرکین اور حقیقی عوامل اوجھل ہو کر رہ گئے۔

ہندی اردو تنازعے کی ابتدا کا اصل پس منظر

دراصل ان نزاعی مسایل کے پس پشت ان کی شروعات میں انگریزوں کی اپنی

افترا پردازی اور مفسدانہ ذہنیت کام کر رہی تھی جس میں بہ طور خاص دو افسروں کی سوچی سمجھی کوششوں بلکہ ان کی عیاری کا عمل دخل تھا۔ اس بابت کچھ انکشافات ڈاکٹر سمیع اللہ نے کیے ہیں جن کی پیش کردہ اطلاعیں ان تنازعوں سے للولال جی کوی کو پوری طرح بری الذمہ قرار دینے کے لیے کافی وشافی ہیں۔ ہندی ادب وزبان کے نشاۃ الثانیہ کے عمل میں للولال جی کوی کے بنیادی کردار اور حقیقی موقف کو سامنے لانے کی غرض سے یہاں پیش کردہ تازہ معلومات کے ذریعے گزشتہ بدظنی کا تدارک بلکہ خاتمہ ہوجانا چاہیے۔ ڈاکٹر سمیع اللہ کی جمع کی ہوئی اطلاعات اس سلسلے کی مجموعی صورتِ حالات بھی بہ خوبی عیاں کرسکیں گی اور کئی ایک حقایق کو بے نقاب کریں گی جن سے معلوم ہوگا کہ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کون کون سے کردار تھے۔

راقم کا حقیر سا اندازہ یہ ہے کہ اس خصوص میں للولال جی کوی پر زیادہ سے زیادہ جتنی ذمہ داری عاید ہوسکتی ہے وہ اس سے مختلف اور زیادہ بھی نہ ہوگی جس کے لیے مثلاً عزیز احمد اپنے ادبی بلوغ کے دوران "گریز" تخلیق کرتے ہوئے تن کی عریانی کو شعوری طور پر لذت کوشانہ انداز میں اختیار کرنے کی بنا پر اس "گناہ رنگین" کے ذمہ دار گردانے گئے تھے۔ یہ ایک سیدھی سی ادبی حقیقت ہے کہ للولال جی کوی ہوں یا عزیز احمد۔ ان کا گناہ خواہ کتنا ہی رنگین کیوں نہ رہا ہو سنگین یقیناً اور ہرگز نہیں تھا' کیوں کہ اپنے وقت پر للولال جی کوی یا عزیز احمد نے جو اختراع کی اگر نہ کرتے تب بھی ایسی انقلابی جدتوں اور راساسی تبدیلیوں کو ادب میں نمود کرنا ہی تھا اور صرف ذرا سا وقت کا ہی فرق پڑتا۔ یہ حقیقت بھی تسلیم کرنا بہ درجہا بہتر و مفید ہوگا کہ ادب کے یہ انقلابات بہت اچھے ہاتھوں سے نمودار ہوتے جن کے مقاصد مثبت تھے۔

ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کی ہندی تحقیق "فورٹ ولیم کالج" کے بالاستیعاب مطالعے سے اخذ کی ہوئی سرکاری مراسلت پر مبنی انکشافات کو ڈاکٹر سمیع اللہ نے دو الگ سرخیوں کے تحت بہ صفحات ۶۲ و ۶۳ بہ عنوان "اردو ہندی میں تفریق" نیز بہ عنوان "اردو ہندی تنازعے کا عروج" بہ صفحات ۶۷ تا ۶۹ خلاصہ کر دیا ہے۔ للولال جی کوی کے

خاص حوالے سے یہ بحث اس لیے خوش آیند اور موثق ہے کہ قطعیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ للولال جی جیسے ثقہ و متین اسکالر کا اس پورے معاملے کی پس پشت کارگزاریوں سے خدانہ خواستہ کسی قسم کا کوئی سا تعلق نہیں واقع ہوا تھا۔ اوّلاً ہندوستانی شعبے کے ایک صدر اور پروفیسر ولیم ٹیلر (۱۸۰۸ تا ۱۸۲۳) کی "اردو و ہندی میں تفریق" کی افتراق پسند ذہنیت اور حرکتوں کی روداد ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر سمیع اللہ کے یہ قول: "جو سب سے زیادہ قابلِ مذمت اور افسوس ناک مسئلہ رونما ہوا وہ اردو اور ہندی کی تفریق تھی۔ اردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانیں گردانے کی تحریک بھی ٹیلر ہی نے شروع کی تھی۔ ۱۸۱۲ء میں کالج کی تعلیم کا معیار گرتا ہوا دیکھ کر کالج کونسل نے گورنر جنرل کے ایما سے کالج کے پروفیسروں اور ممتحنوں سے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس پر ٹیلر نے جو جواب دیا تھا وہ "ہندوستانی" کے تجزیے کے سوا اور کچھ نہیں تھا' اس کے مطالعے سے ٹیلر کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے" (ص ۶۲)

ولیم ٹیلر نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ارباب اختیار کو کن "حقایق" کی جانب متوجہ کرنا چاہا وہ اس کے پسِ پردہ عزایم اور تعصبات کا منہ بولتا ثبوت ہیں' اس کے اس جواب کا ترجمہ ڈاکٹر سمیع اللہ نے پیش کیا ہے: "آپ نے کالج کی معیار تعلیم میں انحطاط کی وجہ دریافت کی ہے' اس کے متعلق میری گزارش ہے اور میں پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستانی کی تعلیم میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے لیکن میں صرف ہندوستانی یا ریختہ کا ذکر کر رہا ہوں جو فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے اور جسے پڑھانے کی میری ذمہ داری ہے۔ میں ہندی کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جس کا اپنا رسم خط ہے یا اس زبان کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جس میں عربی فارسی لفظوں کا استعمال نہیں ہوتا اور جو مسلمانوں کی یورش و یلغار سے قبل ہندوستان کے پورے شمال مشرقی حصے یا صوبے کی زبان تھی اور اب بھی وہاں کے قدیم ہندو باشندوں میں رایج و مستعمل ہے اس وسیع و عریض صوبے میں جہاں اب تک بولی جاتی ہے اس کے دیرینہ وجود کی خاص اہمیت ہے۔ میں نے کالج میں اس (ہندوستانی) کی تعلیم کی توسیع و ترقی میں مقدور بھر کوشش کی ہے جس کی وجہ سے میری صحت خراب ہو گئی۔ آخر میں میں نے اس بات کا احساس کیا کہ مجھے اپنے محدود ذرایع اور درجہ میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ

سے صرف ہندوستانی کی تعلیم اور درس و تدریس تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ ہندی اور ہندوستانی میں ہندوستانی کی ہی زیادہ اہمیت ہے' اس نقطۂ نظر سے تعلیم کا زوال ضرور ہوا ہے" (ص ۶۳ بہ حوالہ : دار شنے ص ۸۶)۔ ڈاکٹر سمیع اللہ نے اس پر جس تاثر کا اظہار کیا ہے وہ حق بہ جانب ہے' چنانچہ ان کے الفاظ ہیں: "یہی مسٹر ٹیلر کا وہ شرانگیز جواب تھا جس سے ہندی اردو تنازعے کی بنیاد پڑی۔ حالاں کہ اس سے قبل ان دونوں کے لیے صرف 'ہندوستانی' لفظ کا استعمال ہوتا تھا اور رسم خط کی حیثیت محض ثانوی تھی۔ مثلاً مسکین کے مرثیے' اخلاقِ ہندی' "شکنتلا" ناٹک وغیرہ پہلے ناگری رسم خط ہی میں شایع کی گئی تھیں جب کہ ان سب کی زبان ہندی نہیں اردو اور صرف اردو ہے" (ص ۶۳)

پروفیسر ولیم پرایس صدر شعبۂ ہندوستانی (۱۸۲۳ تا ۱۸۳۱) کے دور میں "اردو ہندی تنازعے کا عروج" دکھاتے ہوئے ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کے ہی حوالے سے ڈاکٹر سمیع اللہ نے نئی قلمی کارروائیوں کی نشان دہی ایک مراسلے اور ایک بیان کی مدد سے کی ہے: "کالج میں اردو ہندی کا مسئلہ سب سے پہلے ٹیلر نے کھڑا کیا تھا' ان کے بعد کونسل کے سکریٹری رڈیل (Ruddell) اور ہندوستانی شعبے کے پروفیسر پرایس نے اسے ہوا دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان ہی دونوں کی ریشہ دوانیوں سے تنازعے کی جڑیں مضبوط ہوئیں جس کا سلسلہ کالج کے آخری زمانے تک برقرار رہا اور آج بھی باقی ہے۔ ۴ ستمبر ۱۸۲۴ کو رڈیل نے گورنمنٹ سکریٹری لاشنگٹن کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے ہندوستانی زبانوں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا تھا کہ ہندوستانی جس شکل میں کالج میں پڑھائی جاتی ہے اور جو اردو دہلوی زبان' یا دلی درباری زبان کے نام سے پکاری جاتی ہے اسے ہندوستان کے سربرآوردہ لوگ اور بالخصوص مسلمان بول چال کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چوں کہ اسے مغلوں نے رایج کیا تھا اور عربی فارسی اور دوسری شمال مغربی زبانیں اس کا اصل منبع ہیں اس لیے آج بھی یہ ایک غیر ملکی زبان سمجھی جاتی ہے" (بہ حوالہ : وار شنے ص ۱۱۵)۔ رڈیل نے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اردو کی ضروری تعلیم حاصل کر لینے کے بعد بھی ہندوستان کی کم سے کم تین چوتھائی آبادی اس کے عربی فارسی الفاظ کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ رائے بھی دی تھی کہ اس زبان کی بہ نسبت سنسکرت سے نکلی ہوئی کسی

بھی دیسی زبان کو جس کا اثر ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ اثر صوبہ جات میں ہے فروغ دینا زیادہ مفید ہوگا۔ اس کے بعد کالج کونسل نے گورنر جنرل سے کمپنی میں بھرتی ہونے والے ملازمین کے لیے فارسی کے علاوہ ہندوستانی کی جگہ پر برج بھاشا کی جسے ہندی اور ہندوی (ہندوی) کہا جاتا ہے مناسب تعلیم کی سفارش کی اور یہ درخواست کی کہ دستور میں مناسب ترمیم کی جائے تاکہ اس زبان کی تعلیم کو فروغ حاصل ہو سکے۔" (ص ۶۷ و ۶۸)۔

ڈاکٹر سمیع اللہ راوی ہیں کہ گورنر جنرل نے اس تجویز پر صاد کر دیا چنانچہ کالج کا ساتواں دستور مرتب ہوا جسے فوراً گورنر جنرل کی منظوری مل گئی۔ کونسل نے اس ترمیم شدہ دستور کو کورٹ آف ڈائرکٹرس کے پاس روانہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ولیم پرایس کا ایک طویل خط بھی منسلک تھا جس میں اس نے ہندی کو اردو پر ترجیح دی تھی اور برج بھاشا کھڑی بولی ہندوی یا ٹھیٹ ہندی کی جگہ پر صرف "ہندی" نام رکھنے کی سفارش کی تھی۔ نیز اپنے نام کے ساتھ ہندوستانی پروفیسر کی جگہ پر "ہندی پروفیسر" لکھا تھا حالانکہ دیگر سرکاری کاغذات میں ہندوستانی پروفیسر ہی لکھا جاتا تھا" (ص ۶۸)۔ ولیم پرایس کی متذکرہ خاص کوششوں کے علاوہ اس کی آخرالذکر عادت کی طرف قبل ازیں ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے ان لفظوں میں اشارہ کیا تھا: "ولیم پرایس نے اپنے عہد میں ہندوستانی اور ہندی کو الگ الگ زبانوں میں تقسیم کرنے کی انتہائی کوششیں کیں اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ وہ خود کو ہندی پروفیسر لکھتے تھے حالاں کہ کالج کونسل کے ذمہ داران انھیں ہندوستانی پروفیسر ہی کہتے رہے۔ پرایس کو سنسکرت اور برج بھاشا سے خصوصی دلچسپی تھی۔" (ص ۱۰۵/۱۰۶)

ازاں بعد اس قضیۂ نامرضیہ میں جو اور پیش قدمی ہوئی اس کا نقشہ ڈاکٹر سمیع اللہ نے ایک بیان کو اقتباس کرتے ہوئے یوں کھینچا ہے: "اس کے بعد ہندی اور اردو کے اس خود ساختہ تنازعے کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلا افسر برابر ہوا دیتے رہے جولائی ۱۸۳۵ میں کالج کے سالانہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے گورنر جنرل ولیم بٹ اور کالج کے وزیٹر لارڈ ایم ہرسٹ نے اپنے مشترکہ بیان میں اردو سے متعلق بڑی تعصب آمیز اور اشتعال انگیز باتیں کہی تھیں۔ مثلاً یہ کہ "ہندی اور بنگلہ زبانیں اب تک غفلت اور

بے اعتنائی کا شکار ہوتی رہی ہیں۔ ہر سالانہ جلسے کے موقع پر اس کرسی سے ان کی تعلیم کی طرف توجہ مبذول کرائی جاتی تھی لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اب نئے دستور کی رو سے ان کی تعلیم کالج کے نصاب کا جز و لاینفک بن گئی ہے۔ ہندی کے دائرے میں لفظ کے عام مفہوم کے مطابق وہ بولیاں آتی ہیں جو معمولی مقامی تبدیلیوں کے ساتھ بنارس، بہار اور مقبوضہ صوبوں کے اکثر و بیشتر ہندو طبقات میں رائج ہیں۔ اس شعبے کے ماہرین سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہے اس کی بنا پر میں ان زبانوں کی طرف جنہیں میں اس ملک کی زبانیں کہتا ہوں آپ کی توجہ زوردار طریقے پر مبذول کرانا چاہتا ہوں" ص ۶۹ بہ حوالہ: وارشنے ص ۱۱۵)۔

اس پورے پس منظر کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ ذہن نشیں رکھنا ضروری ہوگا کہ یہ نقش گرِ حوادث سا سلسلۂ روز و شب اسی پر تمام نہیں ہوا بلکہ اس طرزِ فکر و عمل کے موثرات بڑے دوررس ثابت ہوتے۔ تاہم آگے چل کر برپا ہونے والے سیاسی اور مذہبی مناقشات کے قطعِ نظر صرف للولال جی کوی کی ادبی سوانح کے اس خاص پہلو پر اپنے معروضات کے تسلسل میں للولال جی کوی کی "لال چندریکا" کے مرتب گریرسن کے ایک اہم اشارے اور اس کی بھی حقیقت کے باب میں ایک نو دریافت زاویے کو سامنے لانا ضروری ہو رہا ہے۔ ان تازہ بہ تازہ اطلاعوں کا اصل منبع لندن سے حضرت سلیم الدین قریشی کے عطا کردہ لال چندریکا کے عکسی صفحات ہیں۔ جیسا کہ للولال جی کوی کی "لال چندریکا" سے ہی منقول مختصر آپ بیتی کے حوالے سے اوّلین اوراق میں عرض ہوا ہے۔ گریرسن نے للولال جی کوی کو ہندی کا مخترع قرار دیا ہے، مگر اس کا منشاء و مقصود وہ عام محاوراتی اختراع نہیں ہے جو للولال جی کوی کے جدید ہندی ادب کے بانی کے بہ طور ان سے منسوب اور کئی ایک حوالوں سے اس ادبی سوانح میں مذکور ہے۔ دراصل گریرسن نے للولال جی کوی کو بہ ذاتِ خود ہندی زبان اور ادب کا موجد Inventor باور کرانے کی اپنی سی کوشش کی ہے جو نرم سے نرم الفاظ میں خلافِ واقعہ ہی کہی جائے گی۔ اس مناسبت سے بہتر ہے کہ پہلے گریرسن کے اظہارات کی ترجمانی کر دی جائے، محض بہ خیالِ احتیاط اس کے ترجمہ بیان سے چند کلمے بعینہٖ نقل کیے جا رہے ہیں تاکہ اصل الفاظ فاضل

ناظرین کے پیش نظر رہیں۔ گریرسن کے یہ فرمودات "لال چندریکا" کے اس کے مفصّل تعارف کے ایک عنوان موسومہ ذیل سے اقتباس کیے جا رہے ہیں جب کہ اس سے عین قبل سوانحی سطور میں بھی اس کا ابتدائی مشاہدہ یہی رہا ہے کہ للولال جی کوی ہندی کے موجد تھے :

"LALLU JI LAL MADE HIMSELF USEFUL IN TRANSLATING VARIOUS WORKS, AND IN INVENTING THE HINDI LANGUAGE ...."

"DIGRESSION ON ORIGIN OF HINDI LANGUAGE"

"اگرچہ للولال جی کوی کے ہندی اور برج بھاکھا کے اسلوب میں ان کی اصل (زبان) گجراتی کے اثرات جہاں تہاں ثبت ہیں ان کا اسلوب بجا طور پر مقبول ہے۔ اوّل الذکر زبان کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے گل کرسٹ کے ایما پر ایجاد کی۔

(THE FORMER LANGUAGE MAY BE SAID TO HAVE BEEN INVENTED BY HIM AT THE INSTIGATION OF - GILCHRIST

صاحب موصوف (گل کرسٹ) چاہتے تھے کہ ایسی اردو کتاب لکھی جائے جس میں تمام عربی فارسی الفاظ نکال دیے جائیں THEIR PLACES BEING TAKEN BY HINDI WORDS

ایسی کوئی زبان ہندوستان میں پہلے موجود نہ تھی۔ اردو مسلمانوں کے ہاں کسی حد تک استعمال میں تھی مگر بہ طور ایک ادبی وسیلہ اور بازار کی زبان (لنگو افرینکا) بھی تھی۔ ہندو اپنی مقامی بولیاں بولتے تھے مثلاً: برج، قنوجی، مارواڑی، بھوج پوری وغیرہا۔ اردو یہاں وہاں کسی کسی محل و قوع یا قومیت کی زبان تھی۔ یہ صرف ایک نصف درجن ہندوستانی بولیوں کا ٹوٹا پھوٹا آمیزہ تھی جو مغل فاتحین نے مقامیوں سے میل جول میں استعمال کرتے تھے نیز بدیسی عربی اور فارسی الفاظ آزادانہ شریک کرتے تھے۔ گل کرسٹ سے یہ ابتدائی غلطی ہوئی کہ وہ اس کو قومی زبان فرض کر بیٹھا تھا اور اس نے یہ کوشش کی تھی کہ اپنے تصوّر کے مطابق اس کا اصل ہندو روپ ORIGINAL HINDU FORM بحال کرے یعنی عربی اور فارسی الفاظ کو خارج کر کے اور متبادل ہندو (الفاظ) داخل کرے۔ لیکن قواعد جو نصف درجن

ہندوستانی بولیوں کا ٹوٹا پھوٹا آمیزہ تھی وہی برقرار رہی جو ہندوستان کے کسی حصّے کی بول چال سے مطابق نہ تھی۔ چنانچہ جب للولال جی نے ہندی میں "پریم ساگر" لکھی HE WAS INVENTING AN ALTOGETHER

تاہم اس کا راستہ شروع سے شاداب تھا۔ اس میں لکھی ہوئی پہلی ہی کتاب کا موضوع سارے اچھے ہندوؤں کے لیے توجہ طلب ہوا اور اس کے مصنف کا اسلوب جو عربی سجع کی طرح ترنم ریز اور غنائیہ تھا ان کے کانوں کو خوش آہنگ لگا۔ تب اس زبان نے ایک طلب پوری کی۔ اس نے ہندوؤں کو ایک عام زبان (لنگوافرینکا) بخش دی۔ اس نے مختلف صوبوں کے لوگوں کو اس قابل کر دیا کہ وہ ایک دوسرے سے اس طرح سے بات چیت کر سکیں کہ مسلمانوں کے ناپاک (۹) UNCLEAN الفاظ کے محتاج نہ ہوں۔ وہ ہر جگہ اور بہ آسانی قابلِ فہم تھی کیوں کہ اس کے قواعد اس زبان کے تھے جو ہر ہندو سرکاری عمال سے واسطہ پڑنے پر استعمال کرتا' اور اس کا ذخیرۂ الفاظ شمالی ہند کی ساری آریائی زبانوں کی عام (یا مشترکہ) پونجی تھا۔ (حاشیہ: جدید ہند آریائی زبانیں اصولاً قواعد میں مختلف فیہ ہیں۔ ان کا خاصا ذخیرۂ لفظی مشترک ہے)۔ مزید برآں کسی جدید ہندوستانی زبان میں اس سے پہلے بہت تھوڑی ہی نثر لکھی گئی تھی۔ ادب زیادہ تر نظم نگاری تک محدود تھا۔ قدرتی نتیجے کے طور پر "پریم ساگر" کی زبان ہندوستان بھر میں معیاری ہندو نثر بن گئی اور آج تک اسی مقام پر فائز ہے۔ آج کل شمالی ہند کا کوئی ہندو ہندی کے علاوہ کسی اور زبان میں نثر لکھنے کا خواب تک نہیں دیکھتا' لیکن نظم نگاری کے لیے وہ ایک دم قدیم قومی بولیوں کو وسیلہ کرتا ہے جیسے تلسی داس کی بیسواری یا سورداس کی برج"۔

مترجمہ سطور کے مِعًا بعد کے عنوان "ہندی نثر" میں بھی گریرسن نے اپنے خیالات کے خلاصے کو ان لفظوں میں سمویا ہے کہ جب "پریم ساگر" لکھی گئی (سامنے آئی) ہندوؤں نے محسوس کیا کہ وہ تو جانے بغیر (یا سمجھے بغیر) ساری زندگی نثر بولتے رہے۔ قارئین اتفاق فرمائیں گے کہ گریرسن کے ملاحظات میں جو تضاد اور الجھاؤ ہے وہ ڈھکا چھپا نہیں ہے بلکہ عیاں ہے۔ یہ خیالات باہم دیگر کس قدر متصادم ہیں کہ "للولال جی کو ی نے ہندی نثر ایجاد کی" اور "جب" پریم ساگر" سامنے آئی تو ہندوؤں کو ایسا معلوم ہوا گویا وہ ساری زندگی

سمجھے بنا، نثر بولتے رہے"۔ اس مقام پر ڈاکٹر سہیل بخاری کے ان تاریخی الفاظ کی طرف دوبارہ متوجہ کرنے کو جی چاہ رہا ہے کہ للولال جی کوی نے جب "پریم ساگر" میں کھڑی بولی کا نام لیا تو اس کے معنی یہی تھے کہ نہ صرف یہ زبان موجود تھی بلکہ اس کا یہ نام بھی معروف تھا۔ پھر ستم یہ ہے کہ للولال جی کوی کا نام لے کر گریرسن نے جو کچھ روایت کیا ہے وہ اتنا ہی غلط فہمانہ ہے جتنا ہمارے اردو افاضل کا مفروضہ۔ تفاوتِ زمانی کا لحاظ رکھا جائے تو واضح طور پر معلوم ہوگا کہ گریرسن کے اس قول کی سرے سے کوئی سند نہیں ہے اور اس بنا پر بھی اس کے مفروضات بے بنیاد اور خلافِ حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔ عجوبہ یہ کہ گریرسن نے اپنے ایڈیشن میں للولال جی کوی کی "کوی پرتیچے" نامی جو نگارش درج کی ہے خود اس میں گل کرسٹ اور للولال جی کوی سے منسوب باتوں کا کوئی مذکور ہی نہیں ہے۔

گریرسن نے ڈیڑھ دو عشروں بعد اپنے شہرۂ آفاق "لسانیاتی جایزہ ہند" میں بھی قریب قریب ایسے ہی طرزِ فکر و اظہار کا نمونہ پیش کیا جس کو پروفیسر عزیز احمد کے حوالے سے اسی باب میں ترجمے کی صورت میں نقل کیا گیا ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ اتنا بڑا ماہر السنہ ایک ادیب کو ادبی نوع یا اسلوبِ نثر کے مخترع یا مسیحا کے بجائے خود زبان کا موجد INVENTOR بالاصرار قرار دے۔ اسی سانس میں محقق موصوف کا یہ بھی فرمودہ ہے کہ گویا اہلِ زبان ہندو طبقے کا جس سے اس کی مراد ہندوستان بھر کے مختلف علاقوں میں رائج زبانیں بولنے والے اہل ہنود رہے ہوں گے۔ عام احساس یہ تھا کہ "پریم ساگر" کی زبان یا نثر تو عین وہی تھی جو وہ پہلے سے بولتے آ رہے تھے۔ پھر للولال جی کوی سے اردو کشی کو منسوب کر کے گریرسن نے ایک اور تاریخی غلطی کا ارتکاب کیا جس میں اردو افاضل بھی بہ وجوہ اس کے ہم خیال و ہم زبان ہو گئے اور ادبی بحثوں میں پڑ گئے۔

ہندی اور اردو والوں کی غلط فہمی و ناراضی :۔

غالباً ان عوامل کی نہ تو باقاعدگی سے جستجو کی گئی اور نہ ہی فکر کہ اصل محرکات دریافت کیے جائیں تا کہ حقیقت حال آشکارا ہو۔ فورٹ ولیم کالج کی ابتدائی تاریخ نگاری کے پورے ربع صدی بعد صاحب تذکرہ "گل رعنا" کی اردو نثر نگاروں سے متعلق کتاب "سیر المصنفین" میں محمد یحییٰ تنہا کے ایک مجمل سے بیان

پر ردّ عمل ظاہر کرتے ہوئے بابائے اردو نے اپنا تاثر تحریر فرمایا تو اس میں بھی للولال جی کو ی سے ہی خفگی کا انداز تھا جب کہ چند برس بعد ڈاکٹر گیان چند جین نے للولال جی کو ی سے ہندی دنیا کی ناراضگی کا انکشاف کیا جو کچھ کم عجوبہ نہیں۔ ادبی نقطہ نظر سے یہ صورت واقعہ عجیب سی معلوم ہوتی ہے تو سوانح و تذکرہ کے طور پر ان باہم دگر متضاد تاثرات کی گرد آوری عجیب تر محسوس ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ للولال جی کوی کسی طور بھی ان معاملات میں قصوروار نہیں پاتے جاتے ہیں کہ ایک طرف اردو دنیا ان سے نالاں ہو اور دوسری سمت ہندی والے ان سے شاکی ہوں۔

مولوی عبدالحق کا تبصرہ یہ رہا ہے کہ "شری للولال کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے فصیح ہندی نثر کی بنیاد ڈالی اور متعدد کتابیں لکھیں اور فی الحقیقت ہندی نثر کے حق میں مسیحائی کی"۔ اس ہندی کے متعلق جو فورٹ ولیم کالج میں جان گل کرسٹ کی فرمایش پر سدل مصرا اور للولال نے تخلیق کی کسی قدر تفصیل کی ضرورت تھی۔ یعنی کب بنی کیوں بنی اور کیسے بنی' ان امور پر اس کتاب میں خاص طور پر لکھنے کی ضرورت تھی۔ قابل مولف نے اسے نظرانداز کر دیا' میں اگر اس پر کچھ لکھوں تو تبصرہ بہت طویل ہو جائے گا۔ یہ ایک فرمائشی اور مصنوعی زبان تھی' یہ کیوں کر بنائی گئی اس کے متعلق میں صرف مسٹر KEY مصنف تاریخ ہندی لٹریچر کی رائے لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "چوں کہ اردو میں بہت سے لفظ عربی فارسی کے ایسے تھے جن کا تعلق اسلام سے تھا لہٰذا ایک ایسی زبان کا بنانا مناسب معلوم ہوا جو ہندوؤں کو پسند آئے۔ اس کے لیے یہ کیا گیا کہ اردو زبان کو سامنے رکھا گیا اور اس میں سے عربی فارسی کے لفظ خارج کر کے سنسکرت یا ٹھیٹ ہندی کے لفظ داخل کر دیے گئے"۔ للولال کی ہندی فی الحقیقت ایک نئی ادبی بولی تھی' یہی خیال اس زبان کے بنانے کے متعلق پنڈت چندر دھر شرما گلیری صاحب نے اپنے مضامین میں ظاہر کیا ہے[1]۔ افسوس کہ آخراں ذکر اسکالر کی تحریروں کا حصول ممکن نہیں ہے ورنہ اس مبحث کے کچھ اور پہلو سامنے آجاتے۔ اتفاقاً یہی تنہا

---

۱ : (ع) ہمراتے عبدالحق بابائے اردو: "تبصرہ سیر المصنفین جلد اوّل از مولوی محمد یحییٰ تنہا صاحب" در "اردو" کراچی جنوری ۱۹۵۰ء ص ۱۵۹/۱۶۰۔

کے بیان اور طرزِ تذکرہ میں مولوی عبدالحق کی اردو کی ابتدائی تاریخ کے الفاظ سے اتنی زیادہ مماثلت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ للولال جی کوی کہ پر تنہا نے بابلتے اردو کا ہی اوّلین تاثر نقل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان خیالات پر عبدالحق صاحب کا تبصرہ ظریفانہ محسوس ہوگا۔

ڈاکٹر سمیع اللہ کی سند پر فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی پروفیسر اور بہ زعم خود ہندی پروفیسر" ولیم پرایس کی غیر معمولی اور خصوصی علمی دل بستگی کی داستان کے کچھ اور حصّوں کا اضافہ اس مناسبت سے مفید تر ہوگا۔ ولیم پرایس نے اپنی ذاتی اور خاص الخاص کوششوں سے ہندی کے حق میں جو فضا پیدا کی وہ شعبے کی صدارت کے اس کے اپنے زمانے ۱۸۲۳ تا ۱۸۳۱ کی بات ہے۔ عین یہی وہ زمانہ ہے جس کے دوران للو لال جی کوی کی نہ صرف شعبے اور کالج سے وابستگی ختم ہو چکی تھی بلکہ کالج کی ملازمت کے خاتمے کے بعد کے قریب ترین زمانے میں وہ بے چارے سورگ باشی ہو چکے تھے۔ جیسا کہ پیوستہ عنوانوں کی تفصیل سے بہ خوبی مترشح ہوا ہے۔ سال ہائے ماسبق کی کارروائیوں اور کوششوں کے بھی پسِ پشت ہندی کے اجرا۔ و نفاذ کی خدا نخواستہ سازش ایک طرف منصوبہ بندی میں بھی للولال جی کوی کا کوئی عمل دخل ثابت نہیں ہوتا ہے۔ برعکس اس کے ساری علمی دل چسپی کا مظاہرہ متذکرہ انگریز افسروں کی اپنی جانب خاص سے ہی ہوتا رہا جس کے پس منظر میں مخصوص تصورات اور عزائم کارفرما تھے جن کی ذمہ داری خود انہی پر عاید ہو سکتی ہے نہ کہ للولال جی کوی کو اس میں شریک باور کیا جا سکتا ہے جیسا کہ محض غلط فہمی کی بنا۔ پر فرض کیا جاتا رہا ہے اور منقول ہو چکا ہے۔

للولال جی کوی کے انتقال کے بعد ہی اور خاص طور پر ولیم پرایس کے حسبِ خواہش و کوشش ہندی کے حق میں سرکاری سطح پر ماحول سازی اور فضا۔ بندی کا جو اہتمام ہوا اس کے زیر اثر ابھرنے والی صورتِ حال سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اس ساری کارگزاری میں للولال جی کوی کو ملوث قرار دینا غلط اور سراسر مبنی بر مفروضات رہا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سمیع اللہ کی ایک قیمتی اطلاع کے بہ موجب ولیم پرایس کے عہدِ پروفیسری میں کالج میں ہندی زبان کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دی جانے لگی تھی۔ چنانچہ اپنی ملازمت برقرار رکھنے کے لیے منشیوں اور بنگالی پنڈتوں نے ہندی

کی تعلیم پر توجہ مبذول کی۔ انہیں ہندی پڑھانے کے لیے سیتارام پنڈت کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد منشیوں اور بنگالی پنڈتوں نے ہندی امتحان دینے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ سکریٹری رڈیل نے ۱۸ رمئی ۱۸۲۵ء کو پرایس کو مطلع کیا کہ ۲۴ رمئی ۱۸۲۵ء کے بعد انہیں جب موقع ملے منشیوں کا ہندی میں امتحان لیں (ص ۱۶۴)۔ آگے بڑھنے سے قبل قارئین غور فرمائیں کہ یہ تاریخیں للولال جی کوی کے انتقال کے قریب دو سال بعد کی ہیں!

بابائے اردو کے منقولہ بالا ردعمل کے حوالے سے یہ یاد دلانا بے محل نہ ہوگا جیسا کہ اسی باب کے آغاز میں اقتباس کیا گیا ہے کہ قریب ۲۵ برس قبل مصنفہ نامکمل "اردو زبان و ادب کی تاریخ" میں مولوی عبدالحق کی ابتدائی رائے للولال جی کوی کے بارے میں کیا تھی۔ للولال جی کوی پر ڈاکٹر عبدالحق کا اولین تاثر نہ صرف مختلف بلکہ قرین واقعہ تھا چنانچہ ان کے اپنے الفاظ تھے کہ للولال جی کوی نے "فصیح ہندی نثر کی بنیاد ڈالی" اور "فی الحقیقت ہندی نثر کے حق میں مسیحائی کی"۔ یہ خیالات افسوس کہ منقلب و متغیر ہو گئے۔

اس تصویر کے دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر جن کا نفس بحث سے بالراست تعلق نہیں ہے ڈاکٹر سمیع اللہ کی کاوش سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ للولال جی کوی کی ادبی ہندی خدمات کی اپنی اصلیت اور غایت پر سابقہ اور ممکنہ شبہات کی کیا حقیقت ہے۔ للولال جی کوی کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں میں سے کچھ خود ہندی دنیا میں بھی عام ہیں اور یہ اس تصویر کا ایسا رُخ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ادبیاتِ ہندی کے ایک مورخ رام چندر شکل کی للولال جی کوی پر تنقید کے حوالے سے پروفیسر گیان چند نے ان کے متعلقہ تاثر کی تردید کی ہے جس کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ للولال جی کوی کی کم از کم چار کتب "اردو میں ہیں"۔ ڈاکٹر گیان چند جین اس خیال کو درست نہیں سمجھتے کہ فورٹ ولیم کالج کے اہلِ اختیار خود اردو اور ہندی کے فرق و امتیاز کے محرک اور اس پر عمل پیرا تھے۔ تاہم فاضل ممدوح کے ملاحظات سے استفادے سے قبل یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ ان کی یہ رائے ربع صدی قبل تک کی تحقیق کے مطابق ہے اور ممکن ہے کہ تازہ تر ریسرچ سے برآمد ہونے والے آثار کی بنا پر اس

میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہو۔ پروفیسر جین نے ابتدائیہ صفحات ۱۰۲/۱۰۳ اختصار سے اظہارِ خیال کرتے ہوتے ارشاد کیا کہ "الزام لگایا جاتا ہے کہ فورٹ ولیم نے اردو اور ہندی کی منفرد آزاد اور حریف شخصیتیں پیدا کیں لیکن اس کے برعکس وہاں ایسے لسانی تجربے بھی کیے گئے جن میں اردو اور ہندی کی فصیلیں مسمار ہو جاتی ہیں "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" دونوں کو اردو والے بھی اپناتے ہیں اور ہندی والے بھی۔ معلوم نہیں ایک متن کا دونوں رسم الخط میں چھپوانا ایک غور و خوض کیا ہوا منصوبہ تھا یا محض ایک اتفاق۔ لیکن انشاء کی "رانی کیتکی کی کہانی" تو یقیناً ایک باقاعدہ منصوبے ایک انوکھے تجربے کا نتیجہ تھی۔ یہ اردو بھی ہے ہندی بھی اس میں عربی فارسی کا کوئی لفظ نہیں یہ سنسکرت کے شدھ الفاظ سے بھی پاک ہے۔" ان ارشادات کی باطنی افادیت سے سرِمو انکار ممکن نہیں۔

پروفیسر گیان چند کے مفصل تاثرات بھی ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

"فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و عقد کو الزام دیا جاتا ہے کہ انھوں نے قصداً اردو ہندی کی تفریق کی لیکن یہ الزام صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو ہندی کے میل سے ہندوستانی زبان کی تشکیل کرنا چاہتے تھے چنان چہ فورٹ ولیم کالج میں اردو ہندی کا ایک متحدہ شعبہ تھا' ہندوستانی شعبے کے نام سے گل کرسٹ نے کئی ہندوستانی کتابیں ہندی اور اردو کے علماء کے اشتراک سے تیار کرائیں۔ شاید ان کے ذہن میں اردو اور ہندی کا واضح تصور ہی نہ تھا۔ ذیل کی کتابیں یا ان کے اجزاء اصلاً (اولاً؟) ہندی خط میں چھاپے گئے: مسکین کے مرثیے "سنگھاسن بتیسی" "شکنتلا" "اخلاقِ ہندی" "مادھونل و کام کندلا" "بیتال پچیسی"۔ ان میں سے "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" کا رجحان اردو کی نسبت ہندی کی سمت زیادہ ہے' بقیہ چار کتابوں کی زبان صریحاً اردو ہے۔ ان میں سے کئی کتابوں کو یا ان کے اقتباسات کو گل کرسٹ اور دوسرے مستشرقین نے اردو رسم الخط میں بھی شایع کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ اردو دشمن تھے نہ ہندی بیزار۔ اسی ضمن میں رام چندر شکل کا ایک بیان موجب دل چسپی ہوگا۔ للولال کے لیے لکھتے ہیں: "انھوں نے "سنگھاسن بتیسی" "بیتال پچیسی" "شکنتلا" "مادھونل" اور "پریم ساگر" لکھے۔ "پریم ساگر" کے پہلے کی چاروں پستکیں بالکل اردو میں ہیں" (بہ حوالہ

"تاریخ ادب ہندی ص۳۶۶ ہندی میں)۔ اس باب میں مذکورہ اکثر مجموعوں میں قدیم ہندوستانی رنگ محفوظ ہے۔ جن میں سے یہ ظاہر محو ہو گیا ہے ان میں بھی اس رنگ کی ایک موجِ تہہ نشین دوڑ رہی ہے جو ژرف بیں نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ یہ قصّے نہ صرف ہندوستان کی قدیم اور جدید زبانوں سے بلکہ دنیا کی کسی دوسری زبانوں کے ادب سے اردو کا رشتہ قایم کرتے ہیں۔ ان میں اردو فارسی کی عام مروّجہ داستانوں سے ایک تنوع ملتا ہے۔ ان کے ذریعے اگلے وقتوں کے فکر و عقاید کی ایک ایسی کھڑکی ہمارے سامنے کھل جاتی ہے جس میں جھانک کر ہم ہندِ قدیم کی حکمت اور توہّمات کی ایک جھلک دیکھ لیتے ہیں۔" (ص۳۲۸)۔

للّولال جی کوی کی ادبی سوانح کے یا ان کی قسمت کے کہیے یہ اتّفاقات بلکہ عجایب بھی خوب ہیں کہ ایک طبقہ ادبا انہیں اردو دشمن گردان رہا ہے۔ تو دوسرا انہیں ہندی دشمنی کی بنا پر گردن زدنی باور کر رہا ہے۔ آج جنّت میں یا سورگ میں جہاں کہیں بھی للّولال جی کوی کا بسیرا ہوگا اس عجیب و غریب سی صورتِ حال پر وہ ہو سکتا ہے کہ خود کو دونوں ہی عقل دشمن گروہوں کی بدظنیوں پر منفعل محسوس کر رہے ہوں مگر للّولال جی کوی کے انفعال کی یہ کیفیت کوئی معمولی چیز نہیں ہوگی بلکہ اس کی بے حد و حساب قیمت کا یہاں شاید ہی کوئی اندازہ ممکن ہو کہ بہ قول شاعر:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے جبیں پہ مری انفعال کے

للّولال جی کوی کے کارناموں پر چند اور آرا

آخر میں نفسِ مضمون شخصیت پر ادبی تذکروں اور اظہارات پر ایک نگاہِ واپسیں تاکہ بہ یک وقت تمام تر زیرِ جایزہ مصادر کی مدد سے مختصراً احاطہ کیا جا سکے۔ جن اور محققین اور مبصرین نے للّولال جی کوی کی خدمات پر اختصار سے سہی مجموعی نظر کی ہے ان میں سے سب محققوں اور مصنّفوں کے تبصرے زیرِ نگہ ہیں۔

ڈاکٹر جاوید نہال نے پروفیسر سیّد محمد کی طرح اردو کے صاحبانِ کمال کے تذکرے میں للّولال جی کوی کے شمول کی ضرورت محسوس کی اور اس کے جواز پر لکھا: "للّولال جی کب

فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ بھاکا کے میر منشی تھے' ایسی حالت میں اس کتاب میں ان کا ذکر محل نظر معلوم ہوتا ہے۔ مگر للولال جی نے بھاکا کے علاوہ ہندوستانی زبان میں کتابیں لکھیں اور دولا او رجوان کو ترجمے کرنے میں مدد دی تھی۔ لہٰذا ان کی تالیفات اور ہندوستانی زبان کے لیے ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہوگی" (ص ۱۶۹)۔ اتفاقاً اس بیان میں یہ دو غلطیاں ہیں کہ کالج میں کوئی شعبۂ بھاکا بھی تھا۔ اور یہ کہ بہ اعتبار عہدہ للولال جی کوئی اسی شعبے کے میر منشی تھے' ان اغلاط کی جانب متوجہ کرانے کی جسارت سابقہ ابواب میں کسی مقام پر کی گئی ہے۔ "اربابِ نثر اردو" کی چند واقعاتی غلطیوں کی نشان دہی بعد کے ادبی مورخوں نے کچھ اس طور سے کی ہے گویا مولوی سید محمد نے سارے وسایل کی دستیابی کے باوجود ان کا ارتکاب کیا ہے۔ حالاں کہ اس اولین تذکرے کی اشاعت ۱۹۲۷ء تک ہی نہیں آیندہ ۲۷ برس یعنی ۱۹۵۴ء تک باضابطہ ایسی تحقیق سامنے نہیں آئی جس میں کالج کے ادبا کی انفرادی و اجتماعی کوشش کا باقاعدگی سے کوئی تجزیہ کیا گیا ہو۔ ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر گیان چند جین کی داستان ریسرچ کی طباعت کے بعد جس کا شرف پاکستان کے حصے میں آیا جہاں تک راقم کا ناقص علم ہے پروفیسر سید محمد کی اپنی نگرانی میں "اربابِ نثر اردو" کا کوئی نیا اور نظر ثانی شدہ ایڈیشن شایع نہ ہو سکا البتہ اس کے قبل و بعد طبعِ اول پر مبنی غیر اجازت یافتہ اشاعتیں پورے برصغیر پاک و ہند میں سامنے آتی رہیں۔ دوسری طرف ڈاکٹر جاوید نہال کی علمی فروگزاشتوں پر ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے ایک سے زاید مواقع پر جس طرح توجہ دلائی ہے اس سے واقعی حیرت ہوتی ہے کہ آخر پروفیسر صاحب موصوف نے تحقیقی تذکرے میں انھیں کیوں کر گوارا فرمالیا۔ یہ حقیقت صاف اور بالکل واضح ہے کہ ایک تو ان کا یہ کارنامہ کلکتہ ایسی جگہ پر معرضِ تصنیف میں آیا ہے جہاں بیش از بیش مطبوعہ اور قلمی آثار نہ صرف محفوظ ہیں بلکہ بالراست ممدوح کے زیرِ ملاحظہ رہے ہیں' اور دوسرے یہ کہ کتاب کے دو ایڈیشنوں کے کئی سال کے وقفے کے دوران اس کی اطلاعات میں ممکنہ حد تک درستی و ترمیم کا اہتمام کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر جاوید نہال نے تعارفی سطور کے بعد دو کتابوں "لطایف ہندی" اور "بھشر بدیا درپن" کو علی الترتیب قدرے تفصیل سے اور اجمالاً شریک تذکرہ کیا ہے۔ المیہ یہ کہ جیسا کہ للولال جی کوی کی "ادھو بلاس" کے بارے

پنجاب میں مخزونہ ہیں، پاکستان کے غیر اردو مخطوطات کا یہ اوّلین اور آخری مرحلہ ہے:

(۳۹) "اسی قصّے کو اس سے پہلے عہد اکبری میں کسی شاعر نے سمبت ۱۶۳۶ بکرمی مطابق ۱۵۷۹ء میں بھاشا میں نظم کیا تھا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مخطوطہ نمبری ۱۳۱۱ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں موجود ہے جو بروز سہ شنبہ اساڑھ سری ۴ سمبت ۱۷۳۴ بکرمی بہ خط دیوناگری تحریر ہوا۔ اس کے مصنف اور کاتب میں سے کسی کا بھی نام معلوم نہیں ہو سکا ہے" (اردو داستان ص۱۳۴ حاشیہ ۲۔)

(۴۰) "ایک منظوم نسخہ مخطوطہ نمبری ۶۸۲۴ برج بھاشا میں "سبھان ولاس" کے نام سے محفوظ ہے، شاعر کا نام ششی ناتھ ہے۔ ایک نسخہ ناقص ہونے کے باعث اس کا سن تصنیف معلوم نہیں ہو سکا۔ (ایضاً)

(۴۱) "ایک منظوم نسخہ مخطوطہ نمبری ۸۶۸۲ برج بھاشا میں "سبھان ولاس" کے نام سے محفوظ ہے سمبت ۱۸۰۷ بکرمی مطابق ۱۷۵۰ء میں تیار کیا جس میں سوم ناتھ ششی ناتھ کی تعریف کرتا ہے۔ یہ نسخہ سمبت ۱۸۴۰ بکرمی مطابق ۱۷۸۳ء میں بہ خط دیوناگری تحریر ہوا ہے اس کے کاتب کا نام نندن ہے اور یہ مخطوطہ نمبری ۱۱۹ بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔" (ایضاً)

"سنگھاسن بتیسی" کے سلسلۂ تراجم کی ذیل میں ان کتابوں کا بھی پتہ چلتا ہے:

(۴۲) پروفیسر عبدالقادر سروری نے بمبئی کیٹلاگ میں ضروری تفصیل کے بغیر ایک اردو ترجمے کو بہ طور "ہندوستانی ورژن" دی تاسی کی تاریخ طبع دوم جلد دوم نیز ایک اور فہرست سے بہ صفحہ ۲۷۷ نشان زد کیا ہے۔

(۴۳) پروفیسر سروری نے ہی Le Scallier کی ترجمہ فرانسیسی "سنگھاسن بتیسی" مطبوعہ نیو یارک ۱۸۱۷ء کا ذکر کیا ہے جو کسی فارسی ترجمے سے ماخوذ ہے۔

(۴۴) ڈاکٹر ہیرالال مہیشوری نے انگریزی "تاریخ راجستھانی ادب" (ساہتیہ اکیڈمی ۱۹۸۰ء) کے باب "عہد وسطیٰ: ۱۵۰۰/۱۸۵۰" میں اسکالر شاعر بھگوان داس نرنجنی کی قریب ۱۶۸۵ء کی منظوم تصانیف کی فہرس میں "سنگھاسن بتیسی" کا بھی نام لیا ہے جس کی تفصیل نہیں دی ہے۔ ممکن ہے مورخ موصوف کی ہی "راجستھانی بھاشا اور ساہتیہ" یا ہم نام تحقیق از موتی لال مناریہ یا نروتم داس سوامی کی "راجستھانی ساہتیہ: ایک پریچے" یا پرشوتم لال

میں ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی سند پر صراحت ہوئی ہے یہ "ہدیا درپن" اصلاً للولال جی کوی کی پوربی زبان کی اسی تصنیف "اودھ بلاس" کے ترجمے کا نام رہا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اہتمام ادبی کارکردگی کو خصوصیت سے موضوعِ تحقیق بنانے والے مورخین میں ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے فرداً فرداً تمام مصنفوں کی شخصی سوانح اوّلاً جمع کی اور ان کے تحریری عمل کو چند شعبوں کے زیرِ عنوان منقسم کر کے کتابی جائزے متعلقہ اصناف کے ماتحت پیش کیے۔ اس طرح صنف وار مناسبت سے تو کالج کی کارگزاری کے مظاہر ایک جگہ ہو گئے لیکن اربابِ قلم کی اپنی اپنی خدمات یا ان کی انفرادی ادبی سوانح کو یکجا سامنے آنے کا موقع نہ مل سکا۔ ایک باب موسومہ "فورٹ ولیم کالج کی نثر کا اسلوب" میں صاحبۂ موصوفہ نے چیدہ مصنفین میر امن، حیدری، افسوس، جوان، میر بہادر علی وغیرہم کے اسالیب پر الگ الگ بامعنی و پرمغز گفتگو کی ہے لیکن للولال جی کوی کے خصائصِ نگارش پر نگاہ نہیں کی۔" اردو سنگھاسن بتیسی" کے ترجمے کو ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے مرزا کاظم علی کی کاوشوں میں شمار کیا ہے اور اس کے ایک اختلافی نکتہ ہونے کی بنا پر ہی فاضل موصوفہ کی جانب سے اس مسئلے پر نظرِ تدقیق ضروری معلوم ہوتی ہے۔ للولال جی کوی کی اردو تحریر پر انھوں نے جو تبصرہ بالخصوص "لطایف ہندی" کے تحت کیا ہے اس کی روشنی میں مزید اظہار خیال ممکن نہ تھا۔ کیوں کہ ان کے ملاحظے میں تمام ایک سو نقلیات کا مجموعہ تھا۔

پروفیسر وقار عظیم نے کالج کی جملہ ادبی پیش قدمی کرنے کے خیال سے ہی "للولال کوی" پر بھی گفتگو کی ہے۔ مگر اس حیران کن تاثر کے ساتھ کہ "للولال جی "فورٹ ولیم کالج کے ان اہلِ قلم میں سے ہیں جنھوں نے گو خود اردو میں کوئی تصنیف یا تالیف نہیں کی لیکن کالج کے ان اہلِ قلم کو جنھوں نے سنسکرت اور ہندی کی کتابیں اردو میں منتقل کیں بہت مدد دی" (ص ۱۳۳)۔ بایں ہمہ بے داد سید وقار عظیم نے "اردو سنگھاسن بتیسی" کو للولال جی کوی کے ہندی ترجمے کا ہی قالب قرار دیا ہے چناں چہ ان کے مشاہدات سے متعلقہ باب میں استناد کیا جا چکا ہے۔ ایک اور بزرگ پاکستانی اسکالر سید جمیل نقوی نے اپنی مختصر تحقیق "اردو نثر کا ارتقا" کے دوسرے

دور متعلقہ باب ولیم کالج میں للو لال جی کوی کو بالکلیہ نظر انداز کر کے پندرہ مصنفوں کی اردو کتب کے مخطوطات اور ایڈیشنوں سے اقتباسات مرتب کیے ہیں، تاہم کسی جگہ "لطایف ہندی" کی بھی کوئی تفصیل نہیں دی گئی ہے گو درج فہرس کیا ہے صاحب موصوف نے اردو "سنگھاسن بتیسی" کو جوان کے مقدمے سے استدلال کرتے ہوئے ان ہی کا کارنامہ ظاہر کیا ہے۔ مگر مولف کے داعیے کو حقایق کی روشنی میں جانچا ہی نہیں اور من وعن قبول کر کے نقل کر دیا۔ ہندوستان کی ایک جدید فاضل ڈاکٹر شہناز انجم نے اسی اردو "سنگھاسن بتیسی" کو جوان اور للو لال جی کوی کا مشترکہ قلم پارہ باور کرتے ہوئے اپنے تھیسس کے داستانی باب متعلقہ فورٹ ولیم کالج میں شامل تذکرہ کیا ہے کہ للو لال جی کوی کے اس شاہ کار "سنگھاسن بتیسی" کو داستانی ادب کے دو برگزیدہ ماہرین پروفیسر گیان چند اور ڈاکٹر سہیل بخاری نے کاظم علی جوان اور للو لال جی کوی سے بالترتیب منسوب فرمایا ہے۔ متذکرہ تمام مباحث سے اسی باب میں استشہاد اپنے موقف کے حق میں راقم کر چکا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے تازہ وارد تذکرہ نگار ڈاکٹر سمیع اللہ للو لال جی کوی کی خدمات نیز جدید ہندی ادب کے پیش رو کے بہ طور ان کی منزلت کے قایل ہیں۔ "جدید ہندی نثر کی ترقی میں للو لال کی ہندی کتابیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے ہندی نثر کی کوئی قابل قدر تصنیف موجود نہیں تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے "پریم ساگر" اور دوسری کئی کتابیں تصنیف کر کے ہندی نثر کے اعلا اور وقیع نمونے پیش کیے جو بعد کے ہندی مصنفین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے" (ص ۱۵۱)۔ ڈاکٹر سمیع اللہ نے اسی مقام پر للو لال جی کے مربی و محسن کپتان جان ولیم ٹیلر کی بیش قرار رائے کا بھی انکشاف کیا ہے: "ٹیلر نے ان کے کارناموں کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ خالص ہندی نثر لکھنے والوں میں للو لال سے قابل کوئی دوسرا شخص نہیں"۔ سخت افسوس ہے کہ اتنے قیمتی اظہار سے اور تفصیل اقتباس نہیں ہوئی ہے اور اس کا حوالہ بھی درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ تاہم للو لال جی کوی کی ادبی سوانح میں اس کی اہمیت بالکل عیاں ہے۔ ڈاکٹر سمیع اللہ

نے للولال جی کوی کی صرف "لطایف ہندی" اور" برج بھاشا کے قواعد" کا اور وہ بھی اجمالی ذکر کیا ہے۔ یہ نکتہ یقیناً اہم تر ہے کہ پروفیسر سید محمد کے بعد جن کی تمام تر حقایق پر نظر ضرور ہو گی ڈاکٹر سمیع اللہ نے جنھوں نے اردو دشمن کارگزاریوں کا پردہ چاک کیا' للولال جی کوی کو کسی طور ان کا ذمہ دار گردانا نہیں اور اس طرح صرف وہ افاضل اکیلے رہ گئے جن کی نگاہ پورے سلسلۂ واقعات اور اصل شخصیتوں پر نہیں تھی۔

کالج کے قیام اور دائرہ کار کے محدود مقاصد کے قطعِ نظر اس ادارے نے ہندوستانی السنہ و ادب کے ارتقائی عمل میں جو تعمیری کردار ادا کیا اس کی نوعیت حقیقتاً ایک بڑی پیش قدمی MAJOR BREAKTHROUGH سے کسی طور کم نہیں تھی۔ اس کا فیضان اردو کے علاوہ ہندی تک جس طرح منتقل ہوا اس کا خلاصہ ڈاکٹر سمیع اللہ کے مختصر مفید الفاظ میں کیا جا سکتا ہے: اردو کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دوسری جدید زبانوں خاص طور سے ہندی اور بنگلہ کی توسیع و ترقی میں بھی کالج نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بہت ہی نازک دور سمجھا جاتا رہا ہے لیکن کالج کی سرپرستی میں ہندوستان کی جدید زبانیں اس پرآشوب دور میں خوب پھلیں پھولیں اور پروان چڑھیں۔ چنان چہ پربارنجن سین نے بنگلہ زبان و ادب کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج کے احسانات کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح کھڑی بولی ہندی کی ترویج و ترقی کے باب میں آچاریہ رام چندر شکل' شاردا دیوی' ویدالنکر اور لکشمی ساگر وارشنے ارباب کالج کے ممنون و مشکور نظر آتے ہیں۔" (ص ۸۱)

پروفیسر سید محمد نے کالج کی مجموعی ادبی پیش رفت پر"نظرِ بازگشت" کی اختتامی سطور میں اپنے ملاحظات کا آغاز ہی للولال جی کوی کے کارہائے نمایاں کو نذرانۂ تحسین پیش کرتے ہوئے کیا ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں آج بھی ان مفید و مثبت فرمودات کو مستعار لے کر بالکل بجا طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک موجودہ ہندی ادبیات کے افتتاحی عمل کا تعلق ہے اس کا سہرا للولال جی کوی کے ہی سر بندھتا ہے' چنان چہ صاحبِ" اربابِ نثرِ اردو" کے بہ قول:" اس کالج نے ہندی زبان کی بھی

معقول سرپرستی کی ہے۔ موجودہ اعلایا معیاری ہندی کی بنیاد اسی کی سرپرستی میں رکھی گئی ہے۔ کالج کے ہندی مصنف جن میں للولال کوی سب سے ممتاز ہیں موجودہ معیاری ہندی کے بانی ہیں"۔ (ص ۲۹۲)

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے جدید ہندی کے اس سرخیلِ ادب للولال جی کوی کی تاسیسی خدمات کی تحقیق اور تحسین میں اردو مورخوں اور ناقدین کی جانب سے مقدور بھر جذبے اور اخلاص سے کام لیا گیا ہے۔ ہندی کے نئے ادبی محققین اور مصححین کتب کے لیے اس میں یہی پیغام مضمر ہے کہ للولال جی کوی کے آثار کے نہ صرف قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی کھوج بلکہ ان کے تازہ ترا یڈیشنوں پر مبنی سلسلہ مجلّدات گویا Collected work کی پیش کش کا بھی خصوصی اور شایان شان اہتمام کیا جائے۔ یہ کام اداری منصوبہ بندی کے ماتحت بھی ہو سکتا ہے اور انفرادی ذوق وشوق کے زیر اثر بھی اور ظاہر ہے کہ جدید ہندی دنیا میں نہ تو مربوط پیمانے پر منصوبہ سازی کے ساتھ کام کرنے والے اداروں کی کمی ہے اور نہ ہی ذاتی جدوجہد سے تدقیق وتدوین کے ماہرین فن کی۔

للولال جی کوی کے ادبی کردار کی تمام تر مناسبتوں سے آخر میں یہ عرض کرنا پھر ایک بار ضروری محسوس ہو رہا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کو یہ خصوصیت موضوع تحقیق بنانے والے اردو مورخین میں سے پروفیسر سید محمد سے لے کر ڈاکٹر سمیع اللہ تک نے اردو کشی کی سازش میں للولال جی کوی کو ہرگز ہرگز ملوث نہیں پایا۔ درحقیقت جن فاضل اردو مصنفین اور مبصروں کے ملاحظے میں فورٹ ولیم کالج کی پوری پوری تفصیل نہیں رہی ہے انہیں اردو کی کردارکشی کے معاملے میں جدید ہندی ادب کے بانی مبانی کے بہ طور للولال جی کوی کی خالصتاً احیائی کوششوں کا عمل دخل نظر آیا جو محض غلطی ہائے مضامین میں جن اسکالروں نے محققانہ بنیاد پر کالج کی پوری تاریخ کو مختلف ومتعدد شخصیات کی ادبی خدمات اور انتظامی کارگزاریوں کے خاص حوالے سے کھنگال ڈالا ان کی تحقیقات میں کہیں للولال جی کوی کا نام تک نہ آنے پایا۔ چنانچہ خود بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اردو کی ادبی تاریخ کے اپنے ابتدائی اور نامکمل منصوبے میں فورٹ ولیم کالج کے

ادبار کی فہرست میں للو لال جی کوی کو جدید ہندی ادبیات کا مسیحا قرار دیا اور اشارہ تک نہ کیا کہ خدا نخواستہ للو لال جی کوی اردو کش ذہنیت کے حامل تھے۔ خلاصہ یہ کہ اردو کشی کی خفیہ تحریک جس نے فورٹ ولیم کالج کے اپنے تاریخی کردار کو داغ دار کر دیا۔ جن انگریز افسروں کی اپنی افترا پردازی کا نتیجہ تھی ان کا معاملہ اب کسی طرح کوئی سربستہ راز نہیں رہا ہے۔

للو لال جی کوی کے بارۂ خاص میں اس تعلق سے سوءِ ظن میں مبتلا طبقے سے استدعا بھی ہے کہ وہ وسیع تر امکان پر اصل محرکات و عوامل اور اسباب و علل یعنی ارکانِ انتظامیہ کی مخفی اور کھلی سازشوں کا حقیقت پسندانہ انداز میں جائزہ لینے کی زحمت فرمائیں۔ انصاف کی نظر سے دیکھنے پر حقایق خود بہ خود آشکارا ہوتے چلے جائیں گے اور وہ سب شخصیتیں بے نقاب ہو جائیں گی جو ان حرکتوں میں بہ راہِ راست ملوث تھیں اور جن کے اثرات کا لایعنی سلسلہ آج تک جاری ہے۔ بہ قول ڈاکٹر سمیع اللہ "اردو زبان و ادب کی گراں قدر اور ناقابلِ فراموش خدمات کے بہلو بہ پہلو فورٹ ولیم کالج سے کچھ ایسے لسانی تنازعوں کی بھی ابتدا ہوئی جنھوں نے اردو کے عوامی کردار پر ناخوش گوار اثرات مرتب کیے اور اس کی مقبولیت و ہر دل عزیزی کو نقصان پہنچایا۔ ان اختلافات کی بنیاد اردو اور ہندی تفریق کی وہ سوچی سمجھی سازش تھی جس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اس سازش کے تحت جس تعصب کو ہوا دی گئی اور جو شر انگیز بیانات جاری کیے گئے وہ آج بھی مخالفین اردو کے لیے سرچشمۂ فیضان اور سامانِ تقویت بنے ہوتے ہیں۔" (ص ۸۱/۸۲)

کتاب کے اختتام سے عین قبل احقر العباد کا یہ انتہائی خوش گوار فریضہ ہے کہ اپنے ان سب محسنین کے حق میں کلمۂ خیر کے لیے فاضل قارئین سے التجا کرے جن کی سرپرستی اور عملی دست گیری کے بغیر راقم کے لیے اس سوانحی منصوبے کی قلمی تہذیب و تزیین ہرگز ہرگز ممکن نہ ہوتی بلکہ حاشیۂ خیال میں بھی نہ آسکتی۔ نفسِ موضوع شخصیت کے نام نامی کو بلند تر اور روشن تر کرنے کے سلسلے میں یہ حقیر مساعی محض بہ طور ذرہ نوازی بھی کسی قابلِ خیال فرمائی جائے گی تو اس کا پورا پورا کریڈٹ حقیقی معنوں میں ان اربابِ

جو دوسخا کو لازماً پہنچے گا جنھوں نے متعدد و متنوع ادبی انکشافات کی غرض سے اپنی بیش از بیش اور وسیع مقدار عطایا سے اس ذرۂ بے مقدار کی طالب علمانہ اور عاجزانہ کوششوں کو تمول بخشا۔ ان سب کرم فرمائیوں کا حقیقی صلہ مالک حقیقی کے علاوہ اور کس کے بس میں ہو سکتا ہے؟ اللہ رب العالمین ان کے علمی و ذہنی سرمائے کو اپنے خزانۂ غیب سے معمور و مالا مال فرمادے اور اس کم سواد کے نصیب میں ان کا سایۂ شفقت تا ابد سلامت رکھے۔ علوم و ہنر اور فنون و ادب کی دنیا کے بھی تو وہ افسر و اورنگ ہیں جن کی تمنا سے کوئی دل خالی نہیں ہو سکتا۔ بہ قول عزیز احمد ؎

ہے یہ دعا کہ تم کو ابد تک رہیں نصیب
علم و ادب کے افسر و اورنگ دوستو!

بے محل نہ ہوگا اگر اس معروضے کا اضافہ کیا جاتے کہ فورٹ ولیم کالج کے مجموعی عمل پر چند اور تواریخ تصنیف کرنے کے بجائے ہمارے نوجوان اور جدید افاضل ایک ایک شخصیت کے کارنامے سامنے لانے کا چلن کرنے کے علاوہ چند نئے موضوعات کو بھی نئی تحقیق کا عنوان کریں۔ اہم شخصیات میں سے ہر ایک کی محققانہ سوانح پر علاحدہ منصوبوں کے علاوہ ایک ایک کتاب کے مطبوعہ و مخطوطہ متون کی جمع آوری اور تہذیبِ نو کا بیڑا الگ الگ ریسرچ اسکالروں کو اٹھانا چاہیے۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی کل ملا کر فورٹ ولیم کالج پر تحقیق و تصنیف کا ایک سمندر رسا وجود میں آچکا ہے جس میں اور اضافہ شاید ہی ممکن ہو سکے گا اس لیے بہ درجہا بہتر اور مفید تر یہی ہوگا کہ جامعاتی منصوبوں کے لیے نئے مباحث تلاش اور متعین کیے جائیں ورنہ مجموعی موضوع پیش پا افتادہ بن کر رہ جائے گا۔

اردو کے تحقیقاتی منصوبوں کے لیے فورٹ ولیم کالج کے غیر اردو شعبوں کی اپنی اپنی اجتماعی کارکردگی کے علاحدہ جائزے بھی بڑے مناسب رہیں گے بشرطیکہ متعلقہ زبانوں سے علمی ادبی سطح پر بہ خوبی اکتساب واستفادہ کے اہل محققوں کو تفویض کیے جائیں۔ فورٹ ولیم کالج پر تا حال سامنے آنے والی سہ لسانی مطبوعات میں غیر اردو السنہ وادبیات میں خصوصیت سے ہندی اور انگریزی کے مصنفین و مترجمین کے کارناموں کا ذکر مل سکا ہے مگر دوسری زبانوں کے کارناموں کے صرف حوالے ہی

ملتے ہیں۔ حیرت ہے کہ خود فارسی پر فورٹ ولیم کالج کے کام کی کوئی تفصیل سامنے نہیں آپائی ہے البتہ اتنی جزئیات ضرور زیرِ نظر ہیں جن کی گردآوری ایک مستقل مقالے کا مواد فراہم کر سکتی ہے کیوں کہ فارسی سے مترجمہ خاص کتابوں کو مجلس ترقی ادب ایڈٹ کرا چکی ہے۔

راقم کا حقیر اندازہ ہے کہ خاص کر ہندوستان میں ہی اردو میں فورٹ ولیم کالج کی ہندی شخصیات اور مطبوعات و مخطوطات پر جامعاتی سطح پر ایک تحقیقی منصوبہ شروع کرانا یقیناً فائدہ بخش ہوگا۔ اسی ادبی تاریخ میں سنسکرت اور برج نیز دیگر السنۂ ہند بنگالی و مراٹھی وغیرہا پر بھی ابواب تجویز کیے جا سکتے ہیں یا پھر ہندی کے علاوہ ان سب کے لیے ایک علاحدہ کتاب بھی حسبِ ضرورت تصنیف کرائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح فارسی و عربی ادبیات پر ایک یا الگ الگ نیز انگریزی کتب پر بھی منصوبے تفویض کیے جا سکتے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج پر نئے اجتماعی جائزے کے لیے اب ایک "فورٹ ولیم کالج انسائیکلوپیڈیا" یا "لغت شخصیات و ادبیات فورٹ ولیم کالج" کی تدوین و تالیف سے بہتر شاید ہی کوئی تصنیفی منصوبہ ہو سکتا ہو۔ اس سوانحی و تصنیفی ڈکشنری یا مجوزہ انسائیکلوپیڈیا کو بعد میں ہندی اور انگریزی میں بھی منتقل کروایا جا سکے گا۔ عرض کردہ عنوانات میں حسب موقع و گنجائش ترمیم کے علاوہ اور نئے مباحث کی دریافت بھی ممکن ہے۔